سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی نثری خدمات: تجزیاتی مطالعہ

(سوانح، مکتوبات اور سفر نامے کے خصوصی حوالے سے)

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

ساجد امتیاز

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۱ء

سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی نثری خدمات: تجزیاتی مطالعہ

(سوانح، مکتوبات اور سفر نامے کے خصوصی حوالے سے)

مقالہ نگار

ساجد امتیاز

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان وادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی نثری خدمات: تجزیاتی مطالعہ (سوانح، مکتوبات اور سفر نامے کے خصوصی حوالے سے)

پیش کار: ساجد امتیاز رجسٹریشن نمبر: 725/P/U/S18

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نازیہ ملک _____
نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____
ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری) _____
ریکٹر

تاریخ _____

اقرار نامہ

میں، ساجد امتیاز حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی کام ہے۔ اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ ملک کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

ساجد امتیاز

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہارِ تشکر	ix
باب اول: تعارف و بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیانِ مسئلہ	۱
iii. مقاصد تحقیق	۲
iv. تحقیقی سوالات	۲
v. نظری دائرہ کار	۳
vi. تحقیقی طریقہ کار	۳
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
viii. تحدد	۵
ix. پس منظری مطالعہ	۵
x. تحقیق کی اہمیت	۶
ب۔ سلسلہ قطبیہ کا پسِ منظر و تعارف	۶
i. سلاسل طریقت	۱۲

ii. سلسلہ قطبیہ	۱۸
حوالہ جات	۲۱
باب دوم: سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی سوانح نگاری اور آپ بیتی کی روایت	
الف۔ روایت و تعارف	
i. اردو ادب میں سوانح نگاری اور آپ بیتی کی روایت ii. سلسلہ قطبیہ میں سوانح نگاری اور آپ بیتی کی روایت iii. سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگار: تعارف	۲۶
ب۔ فکری جائزہ	۳۲
i. سلسلہ قطبیہ کی سوانح عمریوں کا متصوفانہ پہلو (خصوصی حوالہ: لمحاتِ قطب، تذکرہ شاہ سردار) ii. سلسلہ قطبیہ کی سوانح عمریوں کا سماجی پہلو (حافظ الکرم، سوانح حیات محمد نواز شاہ، تجلیاتِ کرم) iii. سلسلہ قطبیہ کی سوانح عمریوں کا تربیتی پہلو (لمحاتِ کرم، فیوضِ یار)	۳۲ ۳۷
ج۔ فنی و اسلوبی جائزہ	۴۳
i. فنی پہلو شخصیت کا انتخاب: (خصوصی حوالہ لمعات قطب) شخصیت کا ارتقا: (خصوصی حوالہ لمحاتِ کرم) واقعات کا انتخاب: (فیوضِ یار، تجلیات کرم) ترتیب: (خصوصی حوالہ: حافظ الکرم)	۵۰

ii. اسلوبی پہلو اسلوب نگارش (تمام سوانح) شعری تمثیل (خصوصی حوالہ لمحاتِ کرم) معتدل اظہار (سراج منیر، حافظ الکرم)	
حوالہ جات	
باب سوم: سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی مکتوب نگاری کا جائزہ	
الف۔ روایت اور تعارف	
i. اردو ادب میں مکتوب نگاری کی روایت ii. سلسلہ قطبیہ میں مکتوب نگاری کی روایت iii. سلسلہ قطبیہ کے مکتوب نگار: تعارف	۱۱۲
ب۔ فکری جائزہ	
i. سلسلہ قطبیہ کی مکتوب نگاری کے متصوفانہ پہلو (مآثر شیریزدانی، یسقون من رحیق مختوم) ii. سلسلہ قطبیہ کی مکتوب نگاری کے اخلاقی و معاشرتی پہلو (ابر کرم، جواہر کرم جلد دوم) iii. سلسلہ قطبیہ کی مکتوب نگاری کے اصلاحی پہلو (پیامِ جلوی، جواہر کرم جلد دوم)	
ج۔ فنی و اسلوبی جائزہ	
i. فنی پہلو شخصی و ذاتی عناصر (خصوصی حوالہ ابر کرم) کاتب و مکتوب الیہ (خصوصی حوالہ مآثر شیریزدانی)	

صداقت (خصوصی حوالہ جواہر کرم) مشمولات (تمام خط) ii. اسلوبی پہلو سادگی و بے تکلفی (خصوصی حوالہ جواہر کرم) شگفتگی (خصوصی حوالہ ابرِ کرم) زبان و بیان (تمام خطوط)	
حوالہ جات	
باب چہارم: سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی مکتوب نگاری کا جائزہ	
الف۔ روایت اور تعارف	
i. ادب میں سفر نامہ کی روایت اردو ii. سلسلہ قطبیہ میں سفر نامہ نگاری کی روایت iii. سلسلہ قطبیہ کے سفر نامہ نگار: تعارف	
ب۔ فکری جائزہ	
i. سلسلہ قطبیہ کے سفر نامہ نگاری کے مذہبی پہلو (متاعِ دید، سفر حجاز) ii. سلسلہ قطبیہ کے سفر نامہ نگاروں کے تاریخی و جغرافیائی پہلو (اسپین کا مطالعاتی سفر) iii. سلسلہ قطبیہ کے سفر نامہ نگاروں کے اصلاحی پہلو (ترکی میں ایک ہفتہ)	
ب۔ فنی و اسلوبی جائزہ	
i. فنی پہلو مشاہدات (خصوصی حوالہ متاعِ دید، سفر حجاز)	

علم تاریخ (خصوصی حوالہ ترکی میں ایک ہفتہ) علم جغرافیہ (خصوصی حوالہ اسپین کا مطالعاتی سفر) ii. اسلوبی پہلو منظر نگاری (متاع دید، ترکی میں ایک ہفتہ) جزئیات نگاری (تمام سفر نامے)	
حوالہ جات	
باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات	
الف۔ مجموعی جائزہ ب۔ نتائج	
ج۔ سفارشات	

ABSTARCT

Title: AN ANALYTICAL STUDY OF THE PROSE WRITING OF THE MUTHUSALEEN OF THE SILSILA E QUTBIYA (BIOGRAPHY, LETTERS & TRAVELOG)

For the establishment, stability and evolution of a better society and society, philanthropy, respect for humanity, service to the people, modesty and good morals are required. By writing biographies adorned with such social and moral qualities, Qutbia biographers have not only served Urdu literature but have also paved the way for the revival of a noble society.

A letter is half a meeting and a private affair, and this series is more of a heart than a pen affair in Qutbia. The themes of the letters of the Qutbiya series include Sufism, true love, knowledge, conduct, obedience, learning to surrender, the journey from God's pleasure to Mustafa's pleasure, attachment to your perfect mentor, heartfelt commitment to family friends, Tariqat Urdu is the symbolism of untangling the knots of Shariat, abandoning non-Allah, maintaining love for the people of Allah, consistency in words and deeds, and the symbols of moving the lowliness of one's being to the heights.

If we look at the religious aspects of the travelogues of the Qutbiya , then the prayers are decorated with sincerity and literature. These itineraries not only contain the complete procedures for performing Umrah, but also provide complete details of the places where the prayers, Nawafl and azkar are to be performed, providing the reader and the new traveler with the religious rites. Paying becomes easy. The travelogues of Qutbia have taken care of the traditional interest and writing of travelogues. There, the observation was not allowed to remain in the travelogues with deep vision, detailing, scenery and anecdotes and other compositional elements.

We can say that the attitude, temperament, behavior and teachings of these great people are completely different and rare from other people, so every single moment of their life is preserved as a living story so that the future humanity will remember them. He could not only be enlightened by the teachings of but also be able to do his own training and guidance.

اظہارِ تشکر

الحمدللہ!

میں سب سے پہلے اپنے اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کا شکر گزار ہوں کہ مجھے اس کام کی تکمیل کی توفیق اور ہمت عطا فرمائی۔ اس کے بعد اساتذہ اکرام کی محنت اور توجہ کہ انھوں نے مجھے ہر ہر گام اپنی قیمتی آراء سے نوازا جس سے آج میں اس قابل ہوا کہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کو مکمل کر سکا ہوں۔ اپنی والدہ کا شکر گزار ہوں کہ ہمیشہ انھوں نے اپنی نیک دعاؤں سے نوازا اور مجھے کام کے دوران ہمیشہ فرصت بہم پہنچائی تا کہ میں اپنا تحقیق کا کام آرام سے مکمل کر سکوں۔ والدِ محترم (مرحوم) خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے کہ انھیں میرے ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا مگر قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا اور وہ میرے ڈاکٹر بننے سے قبل ہی دوسرے جہان چلے گئے، ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مجھے محنت کا درس دیا۔

استادِ محترم اور میرے مقالے کے نگران ڈاکٹر نازیہ ملک کا شکریہ کہ جنھوں نے محنت، مشقت اور جانفشانی سے میری سپروژن کی اور ہر گام پر مجھے نہ صرف سمجھایا بل کہ کئی ایک کوتاہیوں کو بھی درست فرمایا جس کی بدولت آج یہ مقالہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔ اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر اسد، پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور ڈاکٹر عابد سیال (صدرِ شعبہ اردو)، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر عنبرین تبسم، ڈاکٹر بشریٰ اور دیگر اساتذہ کا بھی ممنون ہوں کہ مقالے کی تسوید و تحقیق میں ہر صورت میری رہنمائی فرمائی اور مجھے اس منزل تک پہنچایا۔

خاص طور پر ممنون احسان ہوں پیر محمد طاہر حسین قادری کا، جنھوں نے مواد کی فراہمی کو میرے لیے ممکن بنایا اور اپنی ذاتی لائبریری "کتاب خانہ ابنِ کرم" تک نا صرف رسائی دی بل کہ دورانِ تحقیق رہائش اور کھانے کے انتظامات بھی فرمائے۔

اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ہر صورت مجھ پہ فرض ہے کہ ان کے بغیر یہ سپاس نامہ ادھورا ہے۔ سب سے پہلے جناب اویس عبداللہ کہ ہر کتاب کو پیدا کرنا اور اسے کسی محقق تک پہنچانا ان کا مرغوب مشغلہ ہے اور مجھے ان کی نہ صرف رہنمائی رہی بل کہ ہر گام مدد بھی ملتی رہی۔ خصوصاً اپنی شریکِ حیات کا ممنون ہوں کہ وہ کبھی بھی

میرے کام میں مخل نہیں ہوئیں۔ گھریلو مصروفیات کے علاوہ کمپوزنگ کے مراحل میں بھی میری معاونِ کار رہیں اور جناب مظہر دانش اور رانا لیاقت علی نے پروف ریڈنگ کے ساتھ اپنی قیمتی آرا سے میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔

اس کے علاوہ لالہ محمد رفیق طاہر، ساجد اقبال، قمر شہزاد، طیب خالد، بہار حسین، عبدالخالق اور عمیر احمد کا ممنون احسان ہوں۔ اس کے علاوہ ہر وہ شخص جس نے کسی بھی طرح میری مدد کی اس کا شکر گزار ہوں۔

اپنے چاروں ہم جماعتوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے ہر ملاقات اور کال پہ کام کے متعلق اچھے مشوروں سے نوازا یعنی محمد عبداللہ غازی، خلیق الرحمٰن، مظہر حسین اور عثمان غنی آپ کا بہت بہت شکریہ!

آخر پہ میں اپنی والدہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے اپنی تسلی، تشفی اور دعاؤں سے ہمیشہ نوازا۔ اور اپنے عزیز از جان بیٹوں حسین، حسن اور محسن نے ہر طور خدمت کی اور میرے کام مخل نہ ہوئے۔ علاوہ خاندان کے تمام افراد، جنھوں کے مقالہ کی تکمیل تک نہ صرف توجہ دلاتے رہے بلکہ آسانیاں بھی پیدا کرتے رہے۔

ساجد امتیاز

باب اول

تعارف و بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

i. موضوع کا تعارف:

اردو زبان وادب کی تاریخ کے باقاعدہ اشارے جناب امیر خسرو کی شاعری سے ملتے ہیں۔ شاہان اودھ، گولکنڈہ، بہار، ہیدو، گجرات، لکھنو ایسی ریاستوں میں اردو شعر وادب کے حوالے سے دربار خاص طور پر فعال نظر آتا ہے۔ شعر کے حوالے سے قلی قطب شاہ کا دیوان باقاعدہ اردو غزل کا پہلا دیوان تسلیم کر لیا گیا ہے۔ شعر و نثر دونوں کے حوالے سے چودھویں، پندرہویں اور سولھویں صدی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ان صدیوں میں اشعار کے زیادہ تر اور نثر کے کم کم نمونے ملتے ہیں۔ باقاعدہ نثری تصنیف ملا وجہی کی ۱۶۳۵ء میں سامنے آتی ہے تو اردو نثر کے باقاعدہ آغاز و ارتقاء کی بنیاد گزار ثابت ہوتی ہے۔ سلاسل ہائے فقر و صوفیائے اکرام نے اس سلسلے میں اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ سلسلہ قادریہ اور سلسلہ نقشبندیہ بطور خاص اس حوالے سے بہت معتبر دکھائی دیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان سلاسلِ فقر کی ذیلی شاخیں اس ضمن میں بہت فعال نظر آتی ہیں۔ بطورِ خاص سلسلہ قطبیہ نے شعر و نثر میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جن سے کسی بھی طور پر صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

سلسلہ قطبیہ کا قیام:

سلسلہ قادریہ کے کئی بزرگوں کے ناموں کی نسبت سے مختلف ذیلی شاخیں قائم ہوئیں۔ جنہوں نے اسلام کی تبلیغ اور رشد و ہدایت کے کام کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سلسلہ عالیہ قادریہ کی ایک ایسی ہی شاخ "قطبیہ"

ہے۔ جس کے بانی حضرت سید قطب علی شاہ قادری (ستمبر ۱۸۴۹ء --دسمبر ۱۹۲۷ء) ہیں۔ آپؒ کے فیض باطنی اور مساعی جمیلہ سے طریقت اور ولائیت کا یہ منظم اور مستقل سلسلہ قائم ہوا۔ جس کا کام اللہ کے دین کا پرچار، تہذیب اسلام کا احیا، لوگوں کو تزکیہ نفیس اور تقویٰ و پاکبازی کی تعلیم دینا تھا۔ صوفیہ کی تعلیمات میں تزکیہ نفس اور اخلاقیات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ ۱۸۷۲ء میں سلسلہ قادریہ کے بزرگ حضرت سید چراغ علی شاہ قدس سرہٗ کی بیعت سے مشرف ہوئے اور منازل سلوک طے کرنا شروع کیے اور دو سال کی قلیل مدت میں گوہر مقصود پایا اور ۱۸۷۴ء میں خرقہ خلافت سے نوازے گئے۔ آپؒ کے مرشد نے آپ کے ذمہ امور شریعت و طریقت لگائے اور امیر سلسلہ مقرر فرمایا۔ اس وقت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے لیے یہ دور بڑا عبرت ناک اور مسلسل کرب و اذیت کا تھا۔ نہ صرف کئی سو سالوں پر محیط مسلم سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا بلکہ انگریزوں نے مسلمانوں کو ہر طرح سے دیوار سے لگانے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کے لیے کوئی عزت والی نوکری نہ تھی۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو ذلت بھری زندگی سے نکالنے، انہیں سہارا اور تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے میں صوفیہ اور علماء نے اہم کردار ادا کیا۔

ایسے حالات میں ہی حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ نے سلسلہ قطبیہ کی بنیاد رکھی اور پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں سندھیلیانوالی شریف (ٹوبہ ٹیک سنگھ) میں بیٹھ کر لوگوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہو گئے۔ آپؒ کی تعلیمات میں قرآن، حدیث، فقہ اور علم تصوف کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ آپؒ کی عبادات اور معمولات شریعت اور سنتِ نبوی ﷺ کے عین مطابق تھے۔ آپؒ اپنے دور کے مجدد تھے۔ آپؒ نے تصنیف و تالیف میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ گیارہ نثری کتب کے علاوہ ایک شعری مجموعہ "دیوان قطبیہ" یادگار ہیں۔ آپؒ نے اپنے متوسلین کو بھی علم و عمل کی تلقین فرمائی۔ ان کی تعلیمات و کمالات کا شہرہ عام تھا۔ سلسلہ قطبیہ کے بزرگ و خلفا آج بھی سلسلہ کی تعلیمی روایات کو آگے بڑھا رہے ہیں اور سلسلہ فیض جاری و ساری ہے۔

ii. بیانِ مسئلہ:

حضرات صوفیا نے جہاں مشرق میں اسلام کی نظریاتی بنیادوں پر عملاً جم کر کام کیا وہاں تہذیب و تربیت میں بھی بنیادی کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں سلسلہ قطبیہ کے متوسلین نے مذہبی نثر، ملفوظات، مکتوبات، سوانح، تذکرہ نویسی اور تاریخ کے علاوہ دیگر تمام شعری و نثری اصناف میں گراں قدر تصنیفی کام کیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سلسلہ سے متعلق جملہ زبان و ادب کی فتوحات کو جامعاتی سطح پر زیرِ تحقیق لایا جائے تاکہ اس موضوع کے جملہ ابعاد اور طرفوں کو زیرِ بحث لا کر تجزیہ کیا جائے تاکہ اس کام کی اہمیت، حیثیت اور وقعت کو واضح کیا جا سکے۔

سلسلہ قطبیہ کے قابلِ لحاظ کاموں کو سائنٹفک طریقے سے جمع کر کے اردو کے علمی سرمائے کو تحفظ فراہم کیا جا سکتا ہے جو کہ زبان و ادب کی زندگی کے لیے اہم کام ہو گا اور آنے والی نسلوں کے لیے علمی سرمایہ فراہم کیا جا سکے گا۔ موجودہ عہد میں سلاسل سے وابستہ شعرا و ادباء کے رجحانات اور افکار کو جاننے سے ایک نیا در روشن ہو گا۔ زیرِ نظر تحقیقی منصوبہ اسی حوالے سے پیش ہے۔

iii. مقاصد تحقیق:

۱۔ سوانح، مکتوبات اور سفر نامے کے خصوصی حوالے سے سلسلہ قطبیہ کی نثری کاوشوں میں تنوع کا جائزہ لینا۔

۲۔ سلسلہ قطبیہ کی نثری خدمات کی ادبی اہمیت کا جائزہ لینا۔

iv. تحقیقی سوالات:

۱۔ سوانح، مکتوبات اور سفر نامے کے خصوصی حوالے سے نثری ادب میں اس سلسلہ کے مصنفین کی خدمات کی جہات کیا ہیں؟۔

۲۔ سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی نثری خدمات کی ادبی اہمیت کیا ہے؟۔

v. نظری دائرہ کار:

اردو زبان و ادب کی معلوم تاریخ میں خانقاہوں کا کردار اور اس کی ترویج و ترقی میں ان کا حصہ اظہر من الشّمس ہے۔ ہندوستان میں اردو زبان کے پودے کو پروان چڑھانے اور اس کی پرداخت میں اولیائے کرام اور صوفیہ کرام کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو ادب دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ نظم جس میں شاعری کی تمام اصناف شامل ہیں اور دوسرا حصہ نثر جس میں نثر کی تمام اصناف شامل ہیں۔ سلسلہ قطبیہ کے بزرگان اور متوسلین ان دو جہتوں میں اپنا بھرپور قلمی حصہ ڈالا۔ اردو نظم میں بالخصوص، حمد، نعت، منقبت، مثنوی، نظم اور غزل میں سلسلہ قطبیہ کا ایک خاطر خواہ حصہ ہے۔ جس میں علم شریعت، تصوف، حسن و عشق، فلسفہء، فلسفہء زندگی جیسے موضوعات شامل ہیں اور اسی طرح حصہ نثر میں مضامین، سفر نامے، ملفوظات، مکتوبات، آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں وغیرہ شامل ہیں۔ سلسلہ قطبیہ کے بزرگان اور متوسلین کی مذکورہ جہت دوم کے حوالے سے کاوش کو سامنے لایا جائے گا اور اس کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔

vi. تحقیقی طریقہ کار:

تحقیق کا موضوع سلسلہ قطبیہ کی نثری خدمات کا تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے لہذا موضوع سے متعلق معلومات کی جمع آوری، ترتیب اور مطالعہ، تجزیہ کرنا۔ اس میں ادبی تحقیق اور تجزیاتی و تاریخی تحقیق اور دستاویزی طریقہ تحقیق زیادہ معاون طریقہ ہوں گے۔ علاوہ ازیں ضرورت کے پیشِ نظر مزید کسی تحقیقی طریقے کو اپنایا جا سکتا ہے۔ بنیادی مآخذات میں مذکورہ سلسلہ کے نثر نگاروں کی کتابیں، ثانوی مآخذات میں ان کے فکر و فن کے متعلق چھپنے والے مضامین، کتب اور رسائل کا مطالعہ کیا جائے گا۔ جن تک رسائی کے لیے لائبریریوں سے رجوع کرنے کے علاوہ انٹر نیٹ اور دیگر مآخذات سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کیا جائے گا۔

vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

قبل ازیں محققین و ناقدین مختلف علاقوں اور دبستانوں کے زیرِ اثر تخلیق پائے جانے والے ادب کا جائزہ لیتے رہے ہیں لیکن تصوف و طریقت کے کسی سلسلے سے تعلق رکھنے والے مصنفین کی ادبی خدمات کو یکجا انداز میں دیکھنے کی

طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے اور اردو زبان میں تو یہ رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس سے پہلے دیگر کئی ایک سلاسل کی اردو خدمات پر کام ہو چکا ہے اور سلسلہ قطبیہ کے حوالے سے ایم اے کی سطح پر پنجابی زبان میں ڈاکٹر غلام حسین ساجد کا مقالہ قطب شاہ لڑی دے شاعر ہو چکا ہے۔ مگر اردو میں نثری خدمات کے حوالہ سے کوئی بھی کام کسی بھی جامعہ سے نہیں ہوا۔ مذکورہ سلسلہ پر یہ اس نوعیت کا پہلا کام ہو گا۔

viii. تحدید:

سلسلہ قطبیہ نے زبان و ادب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں مگر مجوزہ تحقیق میں مذکورہ سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی نثری خدمات کو زیر بحث لایا جائے گا۔ یہ مطالعہ مذکورہ سلسلہ طریقت کے متوسلین کی نثری خدمات میں سے سوانح، آپ بیتی، مکتوبات اور سفر نامے تک محدود رہے گا۔ سوانح، مکتوبات اور سفر نامے کے خصوصی حوالے سے صرف ان کتب کا انتخاب کیا گیا ہے جو موضوع اور ادبی حوالے سے اہم ہوں گی۔

ix. پسِ منظری مطالعہ:

اردو ادب میں تصوف کی روایت اور اردو زبان میں صوفیا کی خدمات پر بے شمار تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ جن میں سلسلہ قادریہ، سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ نقشبندیہ پر کئی کام ہو چکے ہیں مگر زیادہ تر کام ملفوظات پر مشتمل ہے۔ سلسلہ قطبیہ کا تعلق سلسلہ قادریہ کی ذیلی شاخ کا ہے۔ سلسلہ قادریہ کی شاخ سلسلہ نوشاہیہ پر تحقیقی کام سامنے آچکا ہے، خونوادہ سیال شریف اور ان کے خلفا کا فروغ علم میں کردار کے حوالے سے تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اسی نوعیت کا کام خانقاہ گولڑہ شریف کے حوالے سے بھی منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ مگر سلسلہ قطبیہ کے حوالے سے پی ایچ ڈی کی سطح پر کوئی بھی تحقیقی کام میری نظر سے نہیں گزرا۔ بیسویں صدی لے کر تا حال سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی نثری خدمات پر مربوط پہلا تحقیقی کام ہو گا۔

x. تحقیق کی اہمیت:

سلاسل طریقت سے وابستہ حضرات نے جس طرح اردو کے ابتدائی دور میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ سلسلہ قطبیہ جس کی ابتدا بیسویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے۔ اس مطالعہ سے نہ صرف پچھلی صدی کے اوائل سے ہوتی

ہے۔اس مطالعہ سے نہ صرف پچھلی صدی کے ادبی رجحانات اور تصوف و اسلامی افکار سے شناسائی ہو گی بلکہ موجودہ صدی کے متوسلین کے شعر و نثری نمونوں کو جدید سماجی حالات کے تناظر میں دیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔اس مطالعہ سے جہاں اردو کے وقیع علمی سرمائے کو تحفظ ملے گا وہاں سلسلہ قطبیہ کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کے نقوش بھی اجاگر ہوں گے۔

ب۔ سلسلہ قطبیہ کا پس منظر و تعارف:

خدا تعالیٰ اور انسان کا تعلق ازلی ہے اللہ تعالیٰ نے محبت میں کائنات تخلیق فرمائی اور انسان جب سے دنیا میں آیا خدا کی محبت اور قربت اس کی خواہش و جستجو رہی۔اسی جذبہ محبت کو انبیاورسل اپنی اپنی امتوں میں پروان چڑھاتے رہے اور یہ سلسلہ مختلف نام اور شکلیں بدلتا ہوا پیہم چلتا آرہا ہے آدم ہوں یا آدم ثانی، ابراہیم خلیل اللہ ہوں، عیسیٰ روح اللہ یا موسیٰ کلیم اللہ ہوں اسی قربت کے طلبگار اور اسی راہ کے شہ سوار نظر آتے ہیں۔ فخر الانبیا ﷺ غارِ حرا سے اس راہ کی منزلیں طے کرتے ہوئے قربت خاص کی معراج پاتے ہیں، ابو القاسم قشیری رسالہ قشریہ میں بیان کرتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے لیے مومن کے متعلق لفظ 'صحابی' سے بڑھ کر کوئی دوسرا لفظ قابل فخر اور افضل نہیں ہو سکتا چنانچہ اس وقت افاضل اس لفظ سے موسوم ہوئے۔اس کے بعد جب دوسری نسل آئی تو ان اصحابیوں کو دیکھنے والوں کے لیے تابعین کی اصطلاح رائج ہوئی پھر ان کی آنکھیں دیکھنے والے تبع تابعین کہلائے۔اس کے بعد جب امت زیادہ پھیلی اور لوگ طرح طرح کے پیدا ہونے لگے جن لوگوں کو امور دین میں زیادہ سوجھ بوجھ اور انہماک حاصل ہوا، انہیں زہاد و عباد کہا جانے لگا لیکن بدعتوں کا ظہور ہوا اور کئی فرقے بن گئے تو ہر فرقہ اس کا مدعی بن بیٹھا کہ زہاد و عباد اسی میں ہیں اس وقت اہلِ سنت کے طبقہ خاص نے جو ذکر الٰہی میں مشغول اور غفلتوں سے دور رہتے تھے اپنے لیے ''اہلِ تصوف'' کی اصطلاح قائم کی۔ابھی ہجرت کو دو صدیاں نہیں ہوئی تھیں یہ لقب اس طبقہ خواص کا اکابر کے لیے مخصوص ہو گیا۔ برصغیر میں بھی دوسری صدی ہجری میں صوفیانہ تعلیم پہنچ چکی تھی یہاں تصوف و طریقت کے مختلف بزرگان تشریف لائے اپنی تعلیمات سے اس خطہ کو روشن کیا۔

i. سلاسل طریقت:

لفظ 'سلاسل' سلسلہ کی جمع ہے جس کے معنی، لغات مختلف ہیں۔ زنجیر اور بیڑی کے ہیں اور طریقت کے معنی ا۔ راہ، باٹ، رستہ، ڈگر ۲۔[تصوف] صوفیائے کرام کے مسلک کا نام جس میں عشق الٰہی کو تمام عبادات پر فوقیت حاصل ہے، شریعت کو قلب کی گھرائیوں سے محسوس کرنے کی کیفیت[۱]۔

شریعت ان امور و احکام کا مجموعہ ہے جو انسان کی حیات ظاہری کی تشکیل کرتے ہیں جب کہ طریقت ان لزات روحانی اور کیفیات معنوی کا نام ہے جو قلب مومن پر اثر پزیر ہوتی ہیں۔ ظاہری اعمال میں اتباع رسول ﷺ شریعت ہے لیکن باطن کا نور مصطفے سے منور ہو جانا طریقت ہے۔ شریعت و طریقت کی مثال جسم و روح کی ہے۔ لہٰذا شریعت، طریقت لازم و ملزم ہیں۔ قرب الٰہی کی طرف نفس امارہ کی پیدا کردہ مشکلات اور رکاوٹیں دور کرنا اور ایمان غیبی کو درجہ ایمان شہودی تک پہنچانا کار طریقت و معرفت ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں

> "طریق صوفیہ حقیقت میں علوم شرعیہ کا خادم ہے۔ تصوف و طریقت کو اختیار کرنے کا مقصد یہ ہے کے تزکیہ نفس اور طصنیفیہ قلب کے ذریعے اعمال کو اخلاص کے نور سے منور کیا جاٰے تا کہ وہ بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت کے لائق ہو سکیں۔"[۲]

تصوف اور صوفی کی مصنوعی تعبیر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہر صوفی نے اپنے وجد و زوق اور حال کے مطابق اس کو بیان کیا ہے۔ اس لیے بعض دفعہ ایک ہی صوفی کی بیان کی ہوئی تعبیرات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے مگر زوق و حال کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ تضادات دفع ہو جاتے ہیں۔ لفظ تصوف اور صوفی کے بارے مختلف اکابرین نے مختلف آرادیں ہیں۔ ان میں چند ایک زیر بحث لائی جاتی ہیں۔ حضرت امام محمد بن علی بن امام حسینؓ بن علی المرتضیٰ فرماتے ہیں کہ

> "پاکیزہ اخلاق کا نام تصوف ہے۔ جس کے جتنے پاکیزہ اخلاق ہوں گے اتنا ہی زیادہ صوفی ہو گا۔" [۳]

حضرت جنید بغدادیؒ سے تصوف کے معنی پوچھنے پر آپ نے فرمایا:

"دل کو رجوع خلق سے صاف کرنا اور صفات بشریت کو دل سے محو کرنا، خواہشات نفسانی کو ترک کرنا اور صفات روحانی پر پہنچ جانا۔ تمام امت کو نصیحت کرنا اور شریعت میں جناب رسالت مآب کی پوری اور سچی۔۔۔۔۔۔۔ کرنا۔" (۴)

حضرت شیخ سہیل بن عبد اللہ تستری کے نزدیک صوفی وہ ہے

"جو ہر قسم کی میل کچیل سے پاک ہو، ہمہ تن غور و فکر ہو، مخلوق کو چھوڑ کر اللہ کا ہی ہو گیا ہو اور اس کے نزدیک سونے کی ڈلی اور مٹی برابر ہو۔" (۵)

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ المعانی اپنی کتاب "فتوح الغیب" میں تصوف کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

"تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے۔ سخاوت ابراہیمؑ، رضائے اسحاقؑ، صبر ایوبؑ، مناجات زکریاؑ، غربت یحییٰؑ، خرقہ پوشی موسیٰؑ، تجرد عیسیٰؑ، اور فقر محمد ﷺ۔" (۶)

حضرت پیر محمد کرم حسین قادری سے تصوف کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا، "جب علم عمل ہو جائے اور قال، حال بن جائے یہی تصوف ہے۔" (۷)

شیخ عبد الواحد بن زید کا قول "صوفی وہ لوگ ہیں جو اپنی عقل کے ذریعہ سنت نبویؐ پر تہہ دل سے عمل کرتے ہیں"۔ (۸)

امام ابو نعیم اصفہانی "حلیتہ الاولیا' قصہ اول" میں حضرت امام جعفر صادق کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی ظاہری زندگی کو اپنائے وہ سنی ہے یعنی سنت پر گامزن اور جو آپ ﷺ کی باطنی زندگی کو اختیار کرے وہ صوفی ہے۔ باطنی زندگی سے مراد حضور ﷺ کے پاکیزہ اخلاق اور رجوع الی الآخرت ہے۔ چناچہ جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی پسندیدہ اشیا میں اپنا دل لگالیا اور آپ ﷺ کی کراہت فرمودہ اشیا سے دوری اختیار کی پس وہ تمام غلاظتوں سے صاف ہو گیا۔ اس صفائی کی بدولت اسے صوفی کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی تصوف کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں

"اسلامی تصوف کی بنیادیں قرآن کی تعلیمات، احادیث نبوی ﷺ، صحابہ کرام کی پاک زندگی، تابعین اور تبع تابعین کی سیرت پاک سے استوار ہوئی ہیں اور سچے مسلمان صوفی کبھی نہ کبھی حدود

شریعیہ سے باہر نکلے ہیں اور نہ انھوں نے ترک دنیا، ترک اسباب، رہبانیت، بے عملی، سستی اور کاہلی کی تلقین کی ہے"۔[۹]

تصوف کی ان تعبیرات سے واضح ہو جاتا ہے کہ طریقت وہ راستا ہے جس کو اختیار کر کہ بندہ قرب الٰہی حاصل کرتا ہے یا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس راستا کی رہنمائی کے لئے وہ اپنے لیے ایک رہبر یا شیخ مقرر کرتا ہے۔ اس راہ کا مسافر بننے کے لیے اپنا ہاتھ اپنے پیر کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ اس کے شیخ کا ہاتھ اپنے شیخ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اسطرح یہ سلسلہ دست علی المرتضی سے دست رسول خدا ﷺ تک جا پہنچتا ہے۔ اور ایک سلسلہ طریقت وجود میں آتا ہے یوں ایک بندہ مومن کا دست بدست زنجیر بناتے ہوئے دست مصطفی ﷺ کے ذریعے قرب خدا تک پہنچنا سلسلہ طریقت کہلاتا ہے۔ دنیا میں طریقت کے بے شمار سلاسل موجود ہیں پاکستان اور ہندوستان میں بھی کافی سلاسل موجود ہیں مگر ان میں چار کو زیادہ شہرت و مقبول عام حاصل ہے۔ یہ نامور سلاسل اربعہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سلسلہ چشتیہ　　۲۔ سلسلہ نقشبندیہ

۳۔ سلسلہ سہروردیہ　　۴۔ سلسلہ قادریہ

سلسلہ چشتیہ کا تعارف:

اس سلسلہ کی بانی شخصیت خواجہ ابو اسحاق شامی چشتی [م ۳۲۹ھ۔ ۹۴۰] ہیں۔ آپ ہی وہ پہلے بزرگ ہیں جن کے نام کے ساتھ تذکروں میں چشتی کا لفظ ملتا ہے۔ ہندوستان میں سلسلہ قادریہ نے بہت خدمات انجام دیں۔ سندھ میں راشدی سلسلہ اور پنجاب میں نوشاہی سلسلہ، قطبیہ قادریہ اور گیلانیہ قادریہ اس سلسلہ کی مشہور شاخیں ہیں۔ اس سلسلہ کی مشہور خانقاہیں درج ذیل ہیں۔

حضرت محمد غوث بندگی اوچی، داتا شاہ چراغ لاہوری، حضرت غوث بالا پیر ستگھرہ۔ حضرت قطب علی شاہ سندھیلیانوالہ، حضرت داؤد بندگی، حضرت شیر محمد گیلانی فتحپوری، میاں محمد بخش کھڑی شریف، حضرت سلطان باہو، حضرت بھلے شاہ، حضرت وارث شاہ اور پیر محمد کرم حسین قادری خانقاہ منگانی شریف جھنگ وغیرہ۔

سلسہ چشیہ:

اس سلسلہ کی بانی شخصیت خواجہ ابو اسحاق شامی[م۳۲۹۔۔۔۔۹۴۰ ء] آپ ہی وہ پہلے بزرگ ہیں جن کے نام کے ساتھ تذکروں میں چشتی کا لفظ ملتا ہے۔ ہندوستان میں یہ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری [۶۳۳ھ۔۱۲۳۵ ء] کے ذریعے آیا اور آپ نے اسے خوب پھیلایا۔ آپ کے بعد شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر [م۶۶۴ھ۔۱۲۶۵ ء]کے خلفائے کرام نے اس سلسلے کو برصغیر کے کونے کونے تک پہنچایا۔برصغیر میں اس سلسلہ کی مشہور خانقاہیں درج ذیل ہیں۔خواجہ معین الدین چشتی،خواجہ قطب الدین بختیار کاکی،خواجہ فریدالدین گنج شکر،خواجہ نظام الدین،خواجہ نصیرالدین، محمود چراغ دہلی،خواجہ سلیمان تونسوی،خواجہ قمر الدین سیالوی،پیر مہر علی شاہ گولڑوی،پیر حیدر شاہ جلالپوری،پیر کرم شاہ بھیروی وغیرہ۔

سلسلہ نقشبندیہ:

اس سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ محمد اتالیسوی[۵۶۲ھ۔۱۱۶۶ ء]ہیں جن کا تعلق ترکستان سے تھا۔خواجہ عبدلخالق عجدوانی نے اسے ترقی دی اس وقت یہ سلسلہ خواجگان کہلاتا تھا۔لیکن اس کو بام عروج تک حضرت خواجہ بہاوالدین نقشبندیہ نے پہنچایا۔اس کے بعد یہ سلسلہ نقشبندیہ کہلایا۔ برصغیر میں یہ سلسلہ سب سے آخر میں حضرت خواجہ محمد باقی[باقی باللہ] سمرقندی کے توسط سے پہنچا۔پاکستان میں مختلف مقامات پر نقشبندی خانقاہیں موجود ہیں۔ ان کے اہم بزرگ حضرت علاوالدین عطار، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت معصوم،حضرت نقشبند محانی،شاہ قطب الدین،شاہ عیسی ولی بابانور محمد،خواجہ محمد زبیر،حضرت یعقوب حرفی شامل ہیں۔

سلسلہ سہروردیہ:

شیخ ضیاالدین ابو لنجیب عبدالقادر سہروردی[۵۶۳ھ۔۱۱۶۷ ء] سلسلہ سہروردیہ کے بانی ہیں لیکن اس کو شہرت عام شیخ شہاب الدین سہروردی[۶۳۲ھ۔۱۲۳۴ ء]سے حاصل ہوئی۔ ہندوستان میں آپ کے خلیفہ شیخ بہاوا لدین زکریااور قاضی حمید الدین ناگوری نے سلسلہ کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ شیخ جلال الدین بخاری اوچی اوران کے خلفانے اس سلسلہ کو سندھ اور پنجاب میں خوب پروان چڑھایا۔

ان تمام سلاسل کے اکابرین ظاہری اور باطنی علوم کے ماہر تھے بڑے بڑے بزرگان کے نام اس لیے درج کیے گئے ہیں کہ ان سے ہر خاص وعام شناسا ہے۔ ان کے نام سے ہی آپ سلاسل تصوف کی علمی وادبی خدمات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو کہ ہر دور میں بہت نمایاں ہیں اگلے چند صفحات میں ان سلاسل کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا۔

سلسلہ قادریہ:

سلسلہ قادریہ کا آغاز شیخ المشائخ حضرت محی الدین ابو محمد عبد القادر جیلانی قدس سرہ،(م ۵۶۱ھ / ۱۱۶۴ء) سے ہوا۔ بانی سلسلہ سلطان الاولیاء اور عظیم روحانی پیشوا تھے۔ آپؒ عرف وعام میں غوث اعظمؒ اور پیران پیر کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ حضرت غوث اعظمؒ کی ولادت شریف یکم رمضان المبارک ۴۷۰ مطابق ۱۸ مارچ ۱۰۷۸ء کو ایران کے صوبہ گیلان کی ایک مضافاتی بستی ''نیف'' میں ہوئی[۱۰]۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ آپؒ کی ولادت عراق کے علاقہ ''الجیل'' میں ہوئی۔ اسی مناسبت سے آپؒ کو گیلانی یا جیلانی کہا جاتا ہے۔ حفظ قرآن کے بعد تحصیل علم کے لیے بغداد کا رخ کیا۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، اور تصوف کی تعلیم نامور اساتذہ سے حاصل کی- بیعت وخلافت حضرت شیخ ابو سعید مخرمی قدس سرہ سے حاصل کیا۔ آپؒ نے مدرسہ اور خانقاہ کو لازم وملزم بنا دیا۔ آپؒ کے مواعظ اور ارشاد و تلقین نے دنیائے تصوف میں ایک نئی روح پھونک دی۔ سلاسل طریقت اور عالم اسلام میں ایک دینی انقلاب آگیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں

> ''آپؒ سے پہلے کسی بزرگ نے تصوف کو اسلام کے زریں اصولوں کی نشر و اشاعت کا ذریعہ اس طرح نہیں بنایا تھا۔ ارشاد و تلوین کا جو ہنگامہ انہوں (سید غوث اعظمؒ) نے برپا کیا۔ وہ اسلامی تصوف کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ غور، غرجستان، باسیاں اور ارد گرد کا تمام علاقہ مہایانہ بدھ مت کے زیر اثر تھا۔ اسلام کا کچھ اثر اس علاقہ میں پہنچا تھا تو کرامیہ فرقہ کے ذریعے سے شیخ جیلانیؒ کی تعلیم سے افغانستان اور اس کے قرب و جوار میں ایک زبردست دینی انقلاب آیا اور ہزاروں آدمیوں نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کی۔''[۱۱]

کتب تصوف، اولیاء کے تذکروں اور سلسلہ قادریہ کی بیشتر کتابوں میں آپ کے بے شمار خواص، کمالات اور اخلاق وعادات کا ذکر ملتا ہے۔ خلعت خاص رسول خدا ﷺ نے اپنے دست پاک سے شیخ عبد القادر جیلانی تک پہنچائی۔ اس

وقت ملائکہ اور رجال الغیب اس مجلس میں موجود تھے اور زمین پر کوئی ولی اللہ ایسا نہیں رہا جس نے سر تسلیم خم نہ کیا ہو۔ حضرت محمد ﷺ اور حضرت علیؓ کے حسب لارشاد منبر پر وعظ و نصیحت اور دعوت پر دین کا کام شروع کر دیا۔[۱۲] آپ کی تبلیغی مساعی نے دین اسلام میں ایک نئی روح پھونک دی۔ گویا آپ نے دین کو زندہ کیا، اس لیے آپؒ محی الدین کہلائے۔ حضور غوث الاعظم نے قصیدہ غوثیہ میں خود بھی اس کا اظہار فرمایا ہے۔

"انا الجیلی محی الدین اسمی

واعلامی علیٰ راس الجبال"[۱۳]

(میں جیلانی ہوں، محی الدین میرا نام نامی ہے

پھریرے میرے شوکت کے ہیں لہراتے پہاڑوں پر)

یہ تسلیم شدہ حقیقیت ہے کہ آپ کے فیوض وبرکات عراق سے افریقہ تک غالب رہے، سید فاروق القادری اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں۔

> "سیدنا غوث اعظمؓ کے آوازہ حق کی صدائے بازگشت پوری دنیائے اسلام میں سنی گئی اس خانقاہی پروگرام اور طریق کار سے آپؒ کے خلفاء اور سلسلہ کے مبلغین نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے اس نے اسلامی تاریخ پر زبردست اور گہرے اثر چھوڑے ہیں۔ عراق کے علاوہ یمن، حضر موت، مصر اور ہندوستان میں آپ کے سلسلہ کی برکت سے اشاعت اسلام کا زبردست کام ہوا۔ حضرمی مشائخ اور تاجروں کے ذریعے جاوا اور سمائرا میں لاکھوں غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔"[۱۴]

وعظ و نصیحت اور ترتیب نفس کے لیے آپ نے خانقاہ قائم کی۔ خانقاہ میں طالبان حق اپنے شیخ کی رہنمائی میں راہ سلوک کی منازل طے کرتے ہوئے قرب الہیٰ حاصل کرتے تھے۔ اس طرح سینکڑوں افراد تیار ہوئے انھوں نے اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کر دیا۔ شیخ نے جو اصول وضوابط متعین فرمائے وہی سلسلہ قادریہ کی بنیاد بنے۔ پابندئ شریعت اور اتباع سنت کی بدولت ہی تمام علماء ومشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ سیدنا غوث اعظمؓ کا سلسلہ تمام سلاسلِ اولیاء پر فوقیت رکھتا ہے۔ آپؒ سے منسوب بہت سی کرامات کا تفصیلی ذکر "بہجتہ الاسرار، تحفۂ قادریہ، انیس القادریہ اور

مناقب غوثیہ میں موجود ہے۔ آپؒ کتب کثیر کے مصنف ہیں۔ آپؒ کی دستیاب ۶۳ کتب کی فہرست کتاب ''غوث الثقلین'' میں موجود ہے جسے ورلڈ ویو پبلشر لاہور نے شائع کیا ہے۔ ان میں تفسیر الجیلانی، غنیۃ الطالبین، الفتح الربانی، فتوح الغیب، سر الاسرار اور جلاء الخواطر زیادہ اہمیت و شہرت کی حامل ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ قادریہ کے سب سے پہلے بزرگ حضرت عون المعروف قطب شاہ قادریؒ (م ۵۵۶ھ) تھے۔[۱۵] ان کے بعد حضرت شیخ عبداللہ انصاری بدایونیؒ عرف جھنڈے والے پیر بدایوں میں ۵۹۹ھ میں تشریف لائے۔ اسی طرح حضرت سید عرب بخاری بدایونیؒ (م ۶۱۸ھ)، حضرت شیخ قطب الدین مدنیؒ (م ۶۷۷ھ)، حضرت سید ابو الحسن علی گیلانی بن سید مسعود احمد حلبیؒ (م ۷۱۵ھ)، حضرت شیخ باباؒ، حضرت شاہ عطا اللہ بغدادیؒ (م ۸۱۷ھ)، حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ (م ۸۳۴ھ)، حضرت سید محمد قادری امجھریؒ اپنے چالیس خلفاء کے ہمراہ ۸۴۶ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ لیکن ان حضرات سے سلسلہ زیادہ پھیلا نہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ قادریہ کا باقاعدہ آغاز و فروغ حضرت سید محمد غوث گیلانی اوچویؒ کی یہاں آمد سے ہوا۔ اس لیے بانی سلسلہ قادریہ آپ ہی کو کہا جاتا ہے۔ آپ کا اسم مبارک ''محمد'' اور مصروف القابات غوث، بندگی، مخدوم، محبوب سبحانی سے یاد کیا جاتا ہے۔[۱۶] صاحب شریف التواریخ اور ڈاکٹر اصغر یزدانی نے آپ کی کنیت ''ابو عبداللہ'' لکھی ہے جو اس سے قبل لکھے گئے تذکروں میں موجود نہیں۔ آپؒ کے سن ولادت کے بارے میں مختلف روایات موجود ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے آپ کی ولادت ۷۹۳ھ اور وصال ۸۹۴ھ تحریر کیا ہے[۱۷] لیکن متاخر مورخین نے ان سنون سے اختلاف کیا ہے۔ مصنف ''بحر السرائر'' لکھتے ہیں ''آپ نے ۹۰ سال کی عمر میں ۹۲۳ھ (مطابق ۱۵۱۷ء) رحلت فرمائی''۔[۱۸] ان کے مطابق سن ولادت ۸ ہوا۔ ان دونوں تذکرون کے بعد تحریر ہونے والی مقبول کتاب ''شجرہ الانوار'' کے مصنف آپ کی عمریوں درج کرتے ہیں۔ '' آپ نے ۱۲۰ سال کی عمر میں ۹۲۳ھ کو وصال فرمایا''۔[۱۹]

یوں آپ کا سن ولادت ۸۰۳ھ مطابق ۱۴۰۱ء بنتا ہے۔ سلسلہ نوشاہیہ کی ادبی تاریخ کے مصنف نے بھی یہی تاریخ ولادت بیان کی ہے۔ مگر حضرات گیلانیہ کے کثیر تذکرہ نگاروں نے سن ولادت ۸۳۳ھ قرار دیا ہے اور مقام ولادت ''حلب'' تحریر کیا ہے۔[۲۰] آپ نے ابتدائی تعلیم و تربیت اور بیعت و خلافت اپنے والد ماجد سید شمس الدین

گیلانیؒ سے حاصل کی۔ بیشتر اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کی اور کئی مرتبہ زیارت حرمین الشریفین سے مشرف ہوئے۔ پہلی مرتبہ ہند کے سیاحت کے دوران لاہور اور ناگور میں قیام فرمایا۔ بار دوم اپنے والد کی وفات کے بعد براستہ خراسان ملتان تشریف لائے اور اوچ (ضلع بہاولپور) میں سکونت اختیار کی۔

برصغیر میں آپؒ کی آمد سے سلسلہ قادریہ کو بے حد فروغ ملا۔ آپ کو مقبول عام حاصل ہوا اور بادشاہ وقت کے ارادت مندوں میں شامل تھا۔ مولانا قاضی برخوردار ملتانی لکھتے ہیں۔

> ''جوق در جوق مردمان بیعت کر کے غلامی میں داخل ہوئے، بادشاہ وقت بھی حلقہ ارادت میں شامل ہو کر نہایت اخلاص و اطاعت کی راہ رسم کو مرعی رکھتا تھا ملازمت ان عالی جناب کو سرمایہ فخر سمجھ کر حاضر خدمت رہتا۔''(۲۱)

حضرت محمد غوث بندگیؒ فارسی زبان کے عمدہ شاعر تھے۔ قادری تخلص فرماتے، آپ کی غزلیات کا ایک دیوان ''دیوان قادریؒ'' کے نام سے پیر محمد طاہر حسین قادری نے ترجمہ و تعلیمات کے ساتھ میں شائع کروایا ہے۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالرحمن جامی اپنے اشعار آپؒ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ آپؒ کی علمی خدمات ''مفتاح الاخلاص'' منظوم حکایات اور دیوان قادری یادگار ہیں۔ حضرت غوث بندگی کی وفات (۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء) اور مقام مدفن اوچ متبر کہ ہے۔(۲۲)

سید محمد غوثؒ چار بیٹوں میں سے حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ (م ۹۴۰ھ) جانشین بنے۔ آپؒ کی تعلیم و تربیت حضرت غوث بندگی نے فرمائی۔ تکمیل سلوک کے بعد اجازت و خلافت سے سرفراز فرما کر والد بزرگوار نے اپنی حیات مبارکہ میں اپنا جانشین مقرر فرمایا۔(۲۳) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں'' آپؒ کے والد ماجد نے اپنی حیات میں آپ کے بھائیوں کے سامنے آپ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا''۔ جوانی میں موسیقی کے دلدادہ تھے۔ یہاں تک کہ جہاں جاتے آلات طرب اور مزامیر اونٹوں پر لدے آپ کے ہمراہ ہوتے تھے۔ لیکن سجادہ نشینی کے بعد تمام تر تکلفات سے دور ہو گئے اور حضرت شیخ عبدالقادر ثانیؒ کہلائے۔ آپ کے احوال و کمالات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تابع تھے۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ

" اپنے وقت کے امام شریعت، طریقت اور عارف حقیقیت تھے۔ علوم ظاہری اور باطنی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی تھی۔ جامع علوم وفنون تھے نیز علوم منقولات ومعقولات میں بڑی دسترس حاصل تھی، ہندوستان کے مشائخ کبار سے تھے۔ سینکڑوں مشرکین اور فاسق و فاجر آپ کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور تائب ہو کر راہ ہدایت پر آئے۔ حضرت غوث اعظم کے ساتھ نسبت خاص تھی۔ حضرت غوث ہی سے عبد القادر ثانی کا خطاب بھالم باطن پایا"۔[۲۴]

حضرت سید زین العابدین اپنے والد سید عبد القادر ثانی کی حیات میں ہی وصال فرما گئے۔ آپ کے فرزند جن کا اسم گرامی "محمد" تھا مگر سید محمد غوث، بالا پیر کے نام سے شہرت پائی۔ مصنف "حیات الامیر" نے آپ کی ولادت ۱۱ رمضان المبارک ۹۱۷ھ مطابق ۱۵۱۰ء کو تحریر کی جبکہ پیر محمد طاہر حسین قادری نے بحر السرائر کے حوالے سے آپ کی ۵۵ سال عمر کے مطابق سن ولادت کا تعین ۹۰۴ھ مطابق ۱۴۹۸ء کیا ہے۔ علوم ظاہری اور کمال باطنی میں یکتائے زمانہ تھے۔ عین التصوف میں تحریر ہے "آپ نے ابتداء میں علوم ظاہری کی تکمیل فرمائی اور اس میں کمال حاصل کیا لیکن آپ کی تعلیم و تربیت جد امجد سید عبد القادر ثانیؒ نے فرمائی۔ دادا کے وصال کے بعد اپنے چچازاد حضرت سید حامد گنج بخش سے اختلافات کی بنا پر اوچ سے ہجرت فرما کر ستگھرہ ضلع اوکاڑہ میں سکونت اختیار فرمائی اور بے شمار لوگوں کو چشمہ علم و معرفت سے سیر اب فرما کر ۹۵۹ھ میں اسی مقام پر دار فانی سے کوچ فرما گئے۔[۲۵] حضرت سید محمد غوثؒ کے صاحبزادے "عبد القادر" جنھوں نے "عبد القادر ثالث" کے نام سے شہرت دوام پائی۔ ایک صاحب کمالات و برکات اور شان عظیم کے حاصل بزرگ تھے۔ آپؒ کی بیعت و خلافت اپنے والد ماجد سیدنا غوث بالا پیر سے تھی۔ آپؒ نے ۹۹۶ھ / ۱۵۸۸ء میں رحلت فرمائی اور مقام مدفن روضہ مبارک حضرت شاہ چراغ لاہوری ہائیکورٹ لاہور ہے۔[۲۶] آپؒ کے وصال کے بعد آپ کے بیٹے حضرت سید عبد الوہاب گیلانیؒ سجادہ نشین ہوئے۔ خلق کثیر نے آپ کے علمی و روحانی کمالات وبرکات سے فیض پایا۔ آپؒ نے ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء کو لاہور میں وصال فرمایا۔[۲۷]

حضرت سید زین العابدین گیلانیؒ (م ۱۰۴۵ھ) کی اول بیعت اپنے جد بزرگوار حضرت سید عبد القادر سے تھی بعد از وصال اپنے والد سیدنا عبد الوہاب کے دست اقدس پر تجدید بیعت کی اور تکمیل سلوک کے بعد اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ آپؒ کے زمانہ سجادگی میں سلسلہ قادریہ کو مقبولیت حاصل تھی۔ اوچ کے بعد لاہور کی سرزمین

قادریت کا دوسرا بڑا مرکز تھی۔ ان دنوں آپ ایک معاصر بزرگ حضرت میاں میر قادر لاہوری کی عظمت کا سورج نصف النہار پر تھا۔ جنھوں نے قادریہ سلسلہ کے مرکز اوچ کی بجائے ایک اور شاخ سے فیض پایا۔ آپؒ کی بیعت و خلافت حضرت خضر سیوستانیؒ سے تھی۔ انہیں کے حکم پر سیہون شریف (سندھ) سے لاہور تشریف لائے۔ آپ اپنے دور کے امام طریقت اور واقفِ رموزِ حقیقت تھے۔ عارف کامل اور علوم ظاہری و باطنی میں یکتائے روزگار تھے۔

حضرت سید عبد الرزاق گیلانی المعروف شاہ چراغ لاہوری بڑے باکمال بزرگ تھے۔ بڑے بڑے تذکرہ نگاروں نے آپؒ کی عظمت و رفعت کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر رضا بخاری رقم طراز ہیں۔

> " الشیخ السید عبد الرزاق المعروف حضرت شاہ چراغ لاہوری، سلسلہ قادریہ کے عظیم المرتبت اور جلیل القدر بزرگ تھے۔ آپ وہ معرکۃ الآرا ہستی تھے جن کے اجداد میں ایک شخصیت بھی ایسی نہیں جو نامور اور مرجع ء خلائق نہ ہو، بل کہ یہ بات یہیں تک محدود نہیں ہے اس خاندان کی تو خواتین بھی بزرگی کے درجہ کمال پر فائز ہیں۔ "(۲۸)

آپؒ کے دستِ اقدس پر اقوام گجر، وینس اور گکھڑ مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ دیگر لاتعداد غیر مسلم بھی آپؒ کی بدولت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ محمد علی چراغ لکھتے ہیں۔

> " حضرت شاہ چراغ علوم ظاہر و باطنی میں صاحب کمال تھے۔ آپ ایک سچے عاشقِ رسولؐ اور دینی امور کے پابند والہ و شیدا تھے۔ ان کی دینی عظمت اور دینوی وجاہت ہر اعتبار سے معتبر اور مسلمہ ہے۔ انہوں نے لاتعداد غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ بادشاہ شاہجہان بھی ان کے عقیدت مندوں میں تھا۔ "(۲۹)

حضرت عبد الرزاق المعروف شاہ چراغ لاہوری کا وصال ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۸ء بروز جمعۃ المبارک لاہور میں ہوا۔ آپ کا مزار متصل لاہور ہائی کورٹ مرجع ء خلائق ہے۔(۳۰)

حضرت شاہ چراغ کے سات فرزندوں میں سے سید مصطفیٰ شاہ گیلانی (م: ۱۰۸۴ھ) بڑے بزرگ اور صاحب کرامت تھے۔ آپؒ کی بیعت اپنے والد ماجد سے تھی۔ اور انہیں کے جلیل القدر خلیفہ ہوئے۔ اہل لاہور آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ حضرت سید محمود گیلانی کی بیعت اپنے برادر اکبر حضرت سید مصطفیٰ گیلانی سے تھی۔ تکمیل سلوک

کے بعد اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ مرشد و برادرِ بزرگ کے وصال کے بعد مقام و منزلت کے پیشِ نظر خانقاہ گیلانیہ لاہور کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ آپؒ نے بروز بدھ ۱۰۸۴ھ کو رحلت فرمائی۔ حضرت سید مجتبیٰ گیلانیؒ کے والد حضرت سید مصطفیٰ گیلانی کے وصال کے بعد آپ کی پرورش آپؒ کے چچا حضرت محمود گیلانی نے فرمائی اور اجازت و تربیت کے بعد خانقاہ کی سجادگی کے لیے بھی اپنی اولاد کے باوجود آپؒ کو نامزد فرمایا۔[۳۱]

آپؒ عمدہ نثر نگار اور بہترین شاعر تھے۔ ''عین التصوف'' کتاب بابِ تصوف میں ایک یادگار ہے۔ آپ قادری سلسلہ کے ایک عظیم رہنما تھے۔ جن کی بدولت اس سلسلہ نے خوب فروغ پایا۔

سلسلہ قادریہ کے ایک اور عظیم روحانی پیشوا حضرت سید حیدر بخش گیلانی قدس سرہٗ تھے۔ آپؒ کی بیعت و خلافت حضرت سید مجتبیٰ گیلانی سے تھی۔ آپؒ نے سلسلہ قادریہ کو پھیلانے میں نہایت جانفشانی سے کام کیا۔ فارسی کی بجائے اردو کو اظہار کلام کا ذریعہ بنایا۔ مختلف مقامات کے دورے کئے۔ درویشوں کی ایک جماعت ہمیشہ ساتھ رکھتے۔ آپؒ کے مرید و خلیفہ حضرت سید غلام غوث گیلانی بن سید غلام مرتضیٰ بن سید نصر اللہ بن حضرت شاہ چراغ لاہوریؒ تھے۔ مرشد کامل نے آپ کی اعلیٰ استعداد کے پیش نظر خوب توجہ فرمائی اور تھوڑے ہی عرصہ میں تکمیل سلوک کے بعد اجازت و خلافت مرحمت فرمائی اور اپنے جد امجد حضرت غوث بالا پیر کی خانقاہ مبارکہ ستگھرہ شریف پر دعوت و تبلیغ کا فریضہ سونپا۔[۳۲]

حضرت سید امان اللہ شاہ (م:۱۲۲۵ھ) کا شمار سید غلام غوث گیلانیؒ کے اجل خلفاء میں ہوتا ہے۔ آپؒ ایک کثیر الفیضان بزرگ تھے۔ یہ آپؒ کے مرشد کی نگاہِ کرم کا کمال تھا کہ آپ سید امان اللہ سے سلطان ہاتھیوانؒ کے بلند مرتبہ پر فائز ہوئے۔ لاکھوں لوگ آپ کی نگاہ سے فیض یاب ہوئے۔ جو بھی تشنہ کام آیا سیر اب ہو کر لوٹا۔[۳۳]

حضرت سلطان ہاتھیوانؒ کے بعد مسند ارشاد پر آپؒ کے پوتے حضرت سید علی شیر قادری متمکن ہوئے۔ آپؒ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مادری ولی اللہ تھے۔ آپؒ حافظ قرآن، عالم اور مسائل شرعیہ کے شارح تھے۔ تکمیل سلوک کے بعد اجازت و خلافت عطا فرما کر حضرت سلطان ہاتھیوانؒ نے اپنی حیات مبارکہ میں اپنا جانشین مقرر فرما دیا۔ خلقِ خدا کی ایک کثیر تعداد آپ کے کمالات روحانی سے فیض یاب ہوئی۔

حضرت سید علی شیر قادریؒ کے خلیفہ اور سجادہ نشین حضرت سید چراغ علی شاہ قادری (م:۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء) کا تعلق (میرک سیال) شور کوٹ سے تھا۔ شرعی علوم اپنے والد سے حاصل کئے۔ علوم باطنی پر دسترس خدا کی طرف سے عطیہ تھا۔ ہمیشہ جذب و مستی میں رہتے۔ نہایت متوکل اور متحمل بزرگ تھے۔ کبھی کسی کے حق میں بد دعا نہ کی۔ آپ سے سیکڑوں افراد فیض یاب ہوئے۔ کئی قبیلوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ آپ کی صحبت سے ہر دکھی شاد اور ہر بیمار شفا پاتا تھا۔[۳۴]

حضرت کے خلفاء اور مریدین میں سب سے معروف اور کامل و اکمل خلیفہ حضرت سید قطب علی شاہ (م: ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۲ء) تھے۔ جن کا تفصیلی ذکر اسی باب میں آگے آئے گا۔

بر عظیم میں سلسلہ قادریہ کے مشائخ کی تعداد بے شمار ہے۔ جن کا تفصیلی ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں۔ تاہم قادریت کے فروغ میں جن حضرت کی خدمات لازوال ہیں ان کے نام درج زیل ہیں مخدوم سید عبد القادر ثانی (م ۹۴۰ھ) سید مبارک حقانی (م ۹۵۶ھ)، سید حامد جہاں بخش (م ۹۷۸ھ) حضرت غوث بالا پیر (م ۹۵۹ھ) حضرت سید اللہ بخش گیلانی (م ۹۹۴ھ)، حضرت شیخ داؤد کرمانیؒ (م ۹۸۲ھ) عبد القادر ثالث (م ۹۹۶ھ)، حضرت موسیٰ پاک شہید (م ۱۰۱۰ھ)، حضرت شاہ ابو المعالی قادری (م ۱۰۲۴ھ)، حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ)، حضرت نوشہ گنج بخشؒ (م ۱۰۶۴ھ)، حضرت شاہ چراغ لاہوری (م ۱۰۶۸ھ)، نواب سید موسیٰ پاک دین (م ۱۰۷۴ھ)، حضرت سید مصطفیٰ گیلانی (م ۱۰۷۴ھ)، حضرت سید عبد القادر آخرین (م ۱۱۹۰ھ)، حضرت سید محمد راشد عرف پیر پاگارا (م ۱۲۳۳ھ)، حضرت شاہ محمد رمضان شہید (م ۱۲۴۰ھ)، دیگر سفینۃ الاولیاء اور سکینۃ الاولیاء کے مصنف شہزادہ دارا شکوہ قادری نے سلسلہ قادریہ کے بزرگوں کا تذکرہ بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری نے "تاریخ ابنِ کرم" میں سلسلہ قطبیہ کے مشائخ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ شریف التواریخ کے مصنف حضرت شرافت قادری نے سلسلہ نوشاہیہ قادریہ کے مشائخ کے احوال تفصیل سے قلم بند کئے ہیں۔

بر صغیر پاک و ہند میں سلسلہ قادریہ کے مشائخ اور خانقاہی زاویے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ بعض مشائخ عظام کے اسمائے گرامی کی نسبت سے کئی ذیلی شاخیں بھی موجود ہیں۔

ii. سلسلہ قطبیہ کا تعارف:

سلسلہ قادریہ کے کئی ایسے بزرگ ہیں جن کے اسمائے گرامی کی نسبت سے ذیلی شاخیں قائم ہوئیں۔ جنھوں نے اشاعت اسلام اور اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ سلسلہ عالیہ قادریہ کی ایسی ہی ایک شاخ" قطبیہ" ہے۔ جس کے بانی شیخ المشائخ حضرت سید قطب علی شاہ قادری[۱۲۶۵،۱۸۴۹][۱۳۴۶ھ/۱۹۶۷ء]ہیں۔[۳۵] آپ کی مساعی جمیلہ اور فیض باطنی سے تصوف اور ولائیت کا یہ منظم و مستقل سلسلہ قائم ہوا۔ ہزارہا لوگ آپ کے دامن کرم سے وابستہ ہوئے، درجنوں خانقاہیں آپ کی نسبت سے وجود میں آئی۔ جن کا کام دین متین کا پرچار، تزکیہ تنفس اور تقوی و پاکبازی کی تعلیم دینا تھا۔

حضرت قطب علی شاہ بخاری نے ۱۸۷۲ میں سلسلہ قادریہ کے بزرگ حضرت سید چراغ علی شاہ کے بیعت ہوئے۔ ایک عرصہ اپنے شیخ کامل کی زیر تربیت و توجہ میں رہ کر منازل سلوک کے مراحل طے فرمائے۔ مرید ہونے کے دو سال بعد ۱۸۴۲ء میں حضرت سید چراغ علی شاہؒ نے آپ کو خرقہ ءخلافت عطا فرما کر امیر سلسلہ مقرر کیا"۔[۳۶] اس وقت ہندوستان میں اسلامی سلطنت آخری ہچکی لے رہی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی اخلاقی، روحانی اور مذہبی حالت پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ سلسلہ قطبیہ کے پس منظر اور اس کے قیام کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کا معاشی، معاشرتی اور سیاسی استحصال کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی زندگیاں اجیرن ہو گئیں۔ ہر سمت مسلمان بے یارو مددگار تھے۔ ہر علاقے کے مسلمانوں کے لیے کسی نہ کسی خضر کی ضرورت تھی۔ پیر محل، کمالیہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ اس وقت پسماندہ علاقوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ حضرت سید قطب علی شاہ اس سرزمین پر اپنی روحانی وجاہت، تدبر اور شجاعت کے ساتھ مظلوم مسلمانوں کا سہارا اور امید بن کر سامنے آئے۔ آپ نے نہ صرف مظلوم مسلمانوں کی مالی، اخلاقی امداد کی بل کہ مسلمانوں کو نیا حوصلہ اور عزم دے کر منظم اور یکجا بھی کیا اور عوام الناس کو یہ شعور دیا کہ انگریزوں سے آزادی ہماری ملی اور مذہبی بقا کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ آپ نے ہر علاقے میں تبلیغی دورے کیے اور اپنے خطبات کے ذریعے ان میں خودداری اور آزادی کا جذبہ بیدار کیا۔

تخت پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے تمام ادیان ہند کے لیے بے شمار مشکلات پیدا کر دیں۔ ملک بھر میں عیسائی پادریوں کی سرگرمیوں کو منظم طریقے سے پھیلانا شروع کر دیا گیا۔ سکولوں، کالجوں، جیل خانوں اور بازاروں میں

عیسائیت کا پرچار کرنے لگے۔ ایسے مواقع پر انگریز سپاہی بھی ان کے ہمراہ ہوتے۔ وہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام ہی لوگوں تک نہ پہنچاتے بل کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی رسومات کا مذاق اڑاتے۔ مذہبی راہنماؤں کو برا بھلا کہتے۔ مشنری سکولوں کے علاوہ گورنمنٹ سکولوں میں بھی بائیبل کی تعلیم زبردستی دی جانے لگی۔ ان حالات کی عکاسی رسالہ بغاوت ہند میں چھپنے والے پادری ایڈمنڈ کے خط کے اقتباس سے بخوبی ہوتی ہے۔

> " اب ہندوستان میں عمل داری ایک ہو گئی ہے تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی ہے۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی ہے۔ مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لیے مناسب ہے تم لوگ بھی عیسائی مذہب ہو جاؤ۔"(۳۷)

حکومت اور عیسائی پادری نہ صرف خود اکثر پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کرتے بل کہ ایسے افراد اور گروہوں کی پشت پناہی بھی کرتے۔ انگریزوں کی آمد سے جو مذہبی و اخلاقی انتشار پیدا ہوا۔ اس میں کئی فرقہ اور گروہ سر گرم ہوئے۔ مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے ان کے مذہبی و ملی اتحاد کو توڑنا ضروری تھا۔ انھی دنوں پیر محل میں بھی مختلف گروہ سر گرم عمل ہوئے جن میں اہل تشیع نے خوب زور پکڑا۔ کیوں کہ سادات پیر محل علاقہ میں رئیس طبقہ تھے۔ انھوں نے لکھنؤ سے ذاکر اور شیعہ علماء بلائے۔ جس سے یہ علاقہ اہل تشیع کی مجالس کا مرکز بن گیا۔ حضرت قطب عالم پیر محلویؒ نے جھنگ سے مولانا نور محمد چیلہ کو بلوا کر محافل میں تقاریر کروائیں اور اپنی تصانیف میں اہل تشیع کی کتابوں کا ایسا رد کیا کہ وہ لاجواب ہو گئے ان کتابوں میں شوائظ البرقات فی رد رمی الجمرات، رد شیعہ بقول امامیہ اور فہرست نہج البلاغت خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

حضرت سید قطب علی شاہؒ قادری نے اس مذہبی انتشار کے زمانے میں سلسلہ قطبیہ کی بنیاد رکھی اور مرکز سے دور پنجاب کے پسماندہ اور دور افتادہ علاقہ سندھیلیانوالی شریف میں بیٹھ کر لوگوں کی تعلیم و تربیت میں سر گرم عمل رہے۔ آپ نے اس دور میں پائی جانے والی مختلف بدعات اور خلاف شریعت باتوں کا جائزہ لیا اور ان کا سد باب اپنی لاجواب تصنیفات سے کیا۔ دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت آپ کی حیات مبارکہ کا سب سے اہم مشن تھا اور آپ زندگی کی آخری سانس تک اس عظیم جدوجہد میں مصروف عمل رہے۔ مولانا حاجی ادریس بھوجیانی "ارباب تصوف" میں اور علامہ عالم فقری "اولیاء اللہ" میں لکھتے ہیں۔

''آپ مسلکاً اہل سنت والجماعت حنفی تھے اور تمام عمر اسی کی تبلیغ فرماتے رہے۔ اور جگہ جگہ تبلیغی دورے کرتے رہے۔ آپ ایک ہی وقت میں علامۃ الدہر روحانیت میں بلند مقام، اعلیٰ مبلغ و خطیب اور بلند پایہ مصنف بلکہ ہمہ صفت موصوف تھے''۔[۳۸]

کسی شخصیت کے مقام و مرتبہ کے تعین کے لیے ضروری ہے دیکھا جائے کہ وہ شخصیت سماج پر کس قدر اثر انداز ہوئی۔ کسی شخص کی ذاتی صفات اگر معاشرے کو فلاح کی طرف موڑتے ہیں کہ کامیاب ہو جائے تو وہ شخص تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید ہو جاتا ہے۔ حضرت سید قطب علی شاہؒ نے سلسلہ دعوت و تبلیغ شروع کیا تو ایک خلقت کا رخ آپ کی طرف پھر گیا اور آپ کے ارادت مندوں میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ملک کے اطراف سے جوق در جوق لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ آپ کی تعلیمات میں قرآن و حدیث کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ آپ ''دیوان قطبیہ'' میں فرماتے ہیں۔

شریعت میں ہو پہلے محکم پسیر
تا ہو طریقت کی تجھ کو خبر[۳۹]

حضرت قطب عالمؒ کے معمولات، اشغال اور عبادات شریعت اور سنت نبوی کے تابع تھے۔ اسی چیز کی تعلیم آپ نے اپنے مریدین اور متوسلین کو بھی دی۔ آپ ہمیشہ کلام مجید کی تلاوت اور نماز پنجگانہ کے ساتھ وظائف کی تلقین فرماتے اور غیر شرعی امور سے سختی سے منع فرماتے۔ توکل استغنا، اخلاص اور فقر آپ کی شخصیت کا طرہ امتیاز تھا۔ ان کے فضل و کمال اور تعلیمات کا شہرہ چار سو پھیلا ہوا تھا۔

حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ اپنے خلفاء کو بھی تبلیغ اسلام کے لیے مختلف مقامات پر بھیجا کرتے تھے۔ آپ کے خلفا میں چند کے اسمائے گرامی مع علاقہ اس طرح ہیں۔

۱- حضرت پیر سید شیر محمد گیلانی، فتح پور شریف، اوکاڑہ (م ۱۳۵۰ھ / ۱۹۳۲ء)

۲- حضرت پیر سید نور سلطان قادری، میرک شریف، جھنگ (م ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء)

۳- حضرت میاں اللہ یار کملانہ، جلال پور شریف، شورکوٹ (۱۳۷۲ / م ۱۹۴۱ء)

۴- حضرت میاں محمد فاضل سہو دودہ شریف، نزد ہڑپہ (م ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء)

۵-حضرت سید سخی محمد شاہ بخاری سعد اللہ، پور شریف، ساہیوال (م۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء)

۶-حضرت سید عبد اللہ شاہ قادری، شاہ ذکریا، بورے والا (م ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء)

۷-حضرت سید رمضان علی شاہ قادری، شاہ ذکریا، بارے والا (م ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء)

۸-حضرت سید مراد علی شاہ بخاری، چیچہ وطنی (م۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء)

۹-حضرت بابا فقیر محمد رمضان ابدال، جابہ اسٹیٹ نواب کالا باغ (م۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء)

سلسلہ قطبیہ کا فیضان آج بھی پوری آب و تاب سے جاری و ساری ہے اور اس میں شامل ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

بانی سلسلہ قطبیہ حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ:

حضرت سید قطب علی شاہ بخاری سلسلہ قطبیہ کے بانی، قطب الاقطاب اور عظیم روحانی پیشوا تھے۔ مورخین نے آپ کو قطب عالم پیر محلوی، مجدد سلسلہ،[۴۰] قدوۃ السالکین،[۴۱] قطب دوراں،[۴۲] علامہ الدہر،[۴۳] ایسی کئی صفات سے یاد کیا ہے۔

نام و نسب:

حضرت سید موج دریا ایک سیلانی فقیر تھے۔ پیر محل میں اکثر آیا جایا کرتے۔ حضور قطب عالم کے والد پیر امام شاہؒ ان کے معتقد تھے۔ جب حضور قطب عالم کی ولادت ہوئی تو پیر امام شاہ اور مائی صاحبہ نے ملازموں کو سید موج دریا کو تلاش کرنے کو کہا تا کہ بچہ کا نام رکھوایا جائے اور گرتی ڈلوائی جائے ابھی گھڑ سواروں کو نکلے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ آپ بغیر اطلاع خود ہی تشریف لے آئے۔ سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نام رکھنے کے ضمن میں پیر محمد طاہر حسین قادری لکھتے ہیں کہ

> ”جب نام رکھنے کے بارے عرض کی گئی تو حضرت سید موج دریاؒ نے فرمایا یہ مادرزاد قطب ہے اب قطب کا اور نام کیا رکھیں؟ یہ ہے بھی قطب اور نام بھی“ سید قطب علی شاہ رکھتے ہیں۔ یہ قطبوں کا قطب ہو گا ایک جہان کی زبان پر قطب قطب ہو گا“۔[۴۴]

حضرت سید قطب علی شاہ بخاریؒ کا شجرہ نسب سترہ(۱۷) واسطوں سے حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت اور پینتیس واسطوں سے سبط رسول سید الشہداء حضرت امام حسین سے جا ملتا ہے۔ حضور قطب عالم نے اپنے مطبوعہ ملفوظات ''مراۃ الفقراء'' میں خود اس طرح بیان فرمایا ہے سید قطب علی شاہ بن سید امام شاہ بن سید اکبر شاہ بن سید امیر شاہ بن سید فتح شاہ بن سید حسین بن پیر سید زین العابدین بن پیر سید شیخ حسین گنجِ علم بن پیر سید احمد بن پیر سید فتح خان بن پیر شیخ اسماعلؒ بن شیخ حامد بڈھا بن شیخ احمد کلاں بن سید محمود کیمیا نظر بن سید رکن الدین ابو الفتح بن سید مخدوم شیخ حامد کبیر بن سید ناصر الدین بن حضرت پیر سید مخدوم جہانیاں جہانگشت علیہ الرحمت بن سلطان سیدی احمد کبیر بن حضرت سید شیر شاہ جلال حسینی البخاری علیہ الرحمت بن سید علی بن سید جعفر بن سید محمد بن سید محمود بن سید احمد بن سید عبد اللہ بن سید علی اصغر بن سید جعفر ثانی بن امام علی نقی علیہ السلام بن امام محمد تقی علیہ السلام بن امام علی موسیٰ رضا علیہ السلام بن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بن امام جعفر صادق علیہ السلام بن امام محمد باقر علیہ السلام بن امام زین العابدین علیہ السلام بن حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام بن امیر المومنین سیدنا امام علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم۔

ولادت:

حضرت سید قطب علی شاہ کی ولادت باسعادت اس وقت ہوئی جب برصغیر میں مغلیہ سلطنت اپنی آخری ہچکی لے رہی تھی۔ آپ کی ولادت یک شنبہ ۲۱ شوال ۱۲۶۵ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۸۴۹ء موضع سندھیلیانوالی شریف، پیر محل ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ صوبہ پنجاب پاکستان [۴۵] میں ہوئی۔ حضرت قطب عالم نے کتاب ''مراۃ الفقراء'' میں اپنی تاریخ ولادت اس طرح بیان کی ہے

''بماہ بھادوں ۱۹۰۶ بکرمی اور چاند کی اکیس تاریخ یک شنبہ کی نصف رات کو دعا گو تولد ہوا۔''[۴۶]

بماہ بھادوں ۱۹۰۶ بکرمی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مصنف ارباب طریقت حاجی محمد ادریس بھو جیانی اور مصنف ''اولیاء اللہ'' علامہ عالم فقری نے اندازہ لگا کر سن ولادت ۱۸۵۰ء لکھا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

بچپن، لڑکپن:

حضرت سید قطب علی شاہؒ ابھی سن بلوغت کو نہ پہنچے تھے کہ والد بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی سید شاہ نوازنے آپ کی تربیت پر خاص توجہ دی۔ حضرت سید قطب عالم کا گھریلو ماحول متمولانہ اور رئیسانہ تھا مگر ساتھ ہی یہ اہل سنت والجماعت سادات کرام کا ایک معروف مذہبی گھرانہ تھا۔ آپ ایک مادرزاد ولی تھے۔ اس لیے بچپن میں ہی آپ کی حرکات وسکنات سے شان قطب ظاہر ہوتی تھی۔ پیر محمد طاہر حسین قادری نے لکھا ہے کہ حضرت قطب عالم بچپن سے بڑے حسین و جمیل تھے، ہونہار، ذہین، باادب اور اچھے اخلاق کے حامل تھے۔ والدین نے پوری کوشش سے ایسی تربیت کی کہ بچپن سے ہی آپ کی طبیعت نیک کاموں کی طرف راغب تھی۔

پیر انوار حسین جلو آنوی لکھتے ہیں کہ

> " آپ کا لڑکپن مروجہ تعلیم حاصل کرنے زہد و تقویٰ کو اپنانے قرآن مجید فرقان حمید کی بنظر نما ئت تلاوت فرمانے، عبادات و ریاضات کی حقیقت پانے فرائض و واجبات سنن و نوافل میں مسلسل مصروف رہتے اور تہجد کا خاص اہتمام فرمانے میں گزرا جو بعد ازاں آخری دم تک جاری و ساری رہا ہے"۔[۴۷]

حضور قطب عالمؒ نوجوانی میں بھی طبعاً زہد وعبادت کی طرف مائل تھے لیکن اپنے علاقہ کے رئیس زادہ ہونے کی وجہ سے بول چال اور لباس میں خاص وقار رکھتے جو آخری عمر تک برقرار رہا۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس دور کے رواج کے مطابق جیسے امیر زادے شکار سے شغف رکھتے تھے آپ بھی اس زمانے میں ملازموں کی معیت میں کبھی کبھار شکار کو نکلتے مگر مرید ہونے کے بعد شکار کھیلنا بلکل ترک کر دیا۔

تحصیل علوم:

تاریخ ابن کرم کے مصنف کے بقول آپ کی تعلیم کا آغاز مسجد سے ہوا۔ کم عمری میں ناظرہ قرآن پڑھ لیا۔ حافظہ کی یہ کیفیت تھی جو کچھ پڑھتے ازبر فرمالیتے۔ اس زمانے میں قرب وجوار کوئی قابل ذکر تعلیمی ادارہ یا مدرسہ نہ تھا۔ آپ کے

والد ماجد بھی کافی عمر رسیدہ ہو چکے تھے لہذا دور دراز مقام پر بھیجنا گوارانہ کیا۔ حضرت قطب عالم خود فرمایا کرتے میں نے بچپن میں صرف "کریما" اپنے ایک خاندانی بزرگ سے پڑھی بعض لوگ ان کا نام "پیر کرم شاہ" بتاتے ہیں۔ اہل تشیع سے اختلاف بڑھا تو آپ نے ذہنی علوم کے حصول کے لیے مولانا غلام علی قریشی کو اپنے پاس بلوایا اور ان سے عربی، فارسی، اور مروجہ نصاب کے علاوہ "مشکوۃ شریف" تک سبقاً پڑھا۔ باقی جو کچھ آپ کی تصانیف وہ سب علم لدنی ہے۔ اسی لیے بڑے بڑے علماء نے آپ کی تصانیف دیکھ کر آپ کے علم و فضل کو سراہا اور اپنی کتب میں جابجا اس کی تعریف کی۔

علامہ عبدالحکیم شرف قادری تذکرہ "اکابر اہلسنت" میں لکھتے ہیں

> " قدواۃ السالکین حضرت مولانا سید قطب علی شاہ قدس سرہٗ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم و عارف تھے۔ آپ سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے۔ ظاہری علوم میں بھی باکمال تھے۔ آپ کے فضل و کمال پر آپ کی تصانیف شاہد عدل ہیں"۔[۴۸]

بیعت و خلافت:

ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد آپ کو باطنی علوم کے حصول کا شوق پیدا ہوا۔ مرد حق کی تلاش میں کئی جگہ گئے لیکن گوہر مراد چراغ حق نما سید چراغ علی شاہؒ کی صورت میں نظر آیا۔ تذکرہ نگار اس بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ خانوادہ سلطان ہاتھیوان کے موجودہ سندھیلیانوالی میں چند گھرانے مرید تھے۔ سید چراغ علی شاہؒ یہاں تشریف لایا کرتے تو کئی کئی روز یہاں قیام کرتے۔ ایک مرتبہ دوران قیام حضرت چراغ حق نماؒ "چاہ ماچھی والا" نواح سندھیلیانوالی شریف میں ایک درخت (ون) کے نیچے تشریف فرما تھے کہ عالم جوانی میں حضرت قطب عالم ہاتھ میں بندوق لیے اپنے ملازموں کے ہمراہ شکار پر جاتے ہوئے پاس سے گزرے۔ حضرت سید چراغ علی شاہؒ خلاف معمول آپؒ کو کافی دیر جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ مرد کامل کی توجہ کام کر چکی تھی۔ شکاری خود شکار ہو چکا تھا۔ حضرت قطب عالمؒ راستہ بھر آپؒ کے خلقہء ارادت میں شامل ہونے کے متعلق سوچتے رہے۔ آخر شکار کا پروگرام ملتوی کر کے واپس گھر تشریف لائے اور اپنی والدہ ماجدہ سے حضرت چراغ حق نما سید چراغ علی شاہؒ کی بیعت اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ ایک برگزیدہ اور پارسا خاتون تھیں اس نیک ارادے کو سن کر از خوش ہوئیں اور فرمایا" راہ خدا میں دیر نہیں کرنی چاہیے ابھی جاؤ اور ان

کی بیعت اختیار کرو"۔[۴۹] والدہ سے اجازت کے بعد آپؒ سیدھے حضرت چراغ حق نماؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور تئیس ۲۳ سال کی عمر میں دست بیعت سے سرفراز ہوئے۔ اپنے ملفوظات "مراۃ الفقراہ" میں آپؒ تاریخ بیعت کے متعلق اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

"بماہ پوہ ۱۹۲۹ بکرمی کو ہادی پیشوا حضرت سید چراغ علی شاہ دام اللہ برکتہ کی خدمت شریف میں دعا گو مشرف ہوا۔"[۵۰]

علم و تقویم کے اعتبار سے یہ تاریخ ۱۵ دسمبر ۱۸۷۲ء مطابق ۱۴ شوال ۱۲۸۹ھ یک شنبہ اتوار بنتا ہے۔

مرید ہونے کے بعد آپؒ نے اپنے اعمال سے دکھایا کہ آپؒ مال و جان اور دل سے بیع ہو گئے ہیں۔ ہمہ وقت ہر قسم کی خدمت بجالانے کے لیے تیار رہتے۔ ایک مرتبہ شیخ کامل سے خود عرض کی کہ گھوڑے کا گھاس دانہ اور خدمت مجھے عطا کی جائے۔ حضرت چراغ حق نماؒ نے فرمایا "یہ درویشوں کی ریاضت ہے، آپ سے ہم یہ کام نہیں کروانے"۔ مگر حضرت قطب عالم کا یہ حال تھا کہ حضرت کی خدمت کا جذبہ آپؒ کو بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تاریخ ابن کرم میں آپ کی خدمت مرشد کا ذکر کرتے ہوئے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ میرک شریف لنگر میں حضرت سید چراغ علی شاہؒ کی سواری والے گھوڑے کو ہمیشہ چنے پیس کر ڈالے جاتے تھے۔ ایک رات خدمت پر مامور شخص چنے پیسنا بھول گیا اور چنے چکی پر ہی پڑے رہے۔ حضرت قطب عالمؒ کو معلوم ہوا تو آپؒ نے خاموشی سے نصف شب چنے پیسنے شروع کر دیے۔ ابھی کام ختم بھی نہ ہوا تھا کہ حضرت چراغ شاہؒ بھی چکی کی آواز سن کر ادھر تشریف لے آئے چونکہ آٹا لگنے سے حضرت قطب عالمؒ کی شکل پہچانی نہ جاتی تھی۔ آپؒ نے دریافت فرمایا کون ہے؟ مگر حضرت قطب عالمؒ خاموش رہے۔ حضرت چراغ حق نماؒ نے بغور دیکھ کر آپؒ کو پہچان لیا اور بے اختیار ہو کر آپؒ کو سینے سے لگالیا اور فرمایا "قطب شاہ تو نے میری چکی پیسی ہے ایک زمانہ تیری چکی پیسے گا۔"[۵۱]

حضرت قطب عالمؒ نے شیخ کامل کی بارگاہ میں رہ کر اپنی جان سے بڑھ کر ہر خدمت سرانجام دی اور ہر لمحہ حکم بجا لانے کے لئے تیار رہتے۔ آپؒ کا ارشاد ہے "جب تک مرید اپنے پیر و مرشد پر پروانہ وار نہ ہو گا، اپنی منزل مقصود کو بھی نہیں پا سکتا اور ساری عمر حیران و پریشان پھرتا رہے گا۔"

اسی طرح حضرت قطب عالمؒ اپنے شہر و آفاق کلام "دیوان قطبہ" میں مناقب حیدری کے آخر میں فرماتے ہیں۔

" میں بے پر، پروانہ ہوں، اس شمع چراغ نورانور کا قطب علی شاہ کا خصمانہ ہیں تو صاحب لج پرور کا"[۵۲]

حضرت قطب عالمؒ نے ایک عرصہ اپنے شیخ کامل کی زیر تربیت و توجہ رہ کر منازل سلوک کے مراحل طے فرمائے۔ آپؒ پر شیخ کی خاص نگاہ التفات ہوئی کہ ابھی مرید ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ خلافت سے مشرف ہوئے۔ اس ضمن میں تذکرہ نویس لکھتے ہیں۔

" مرید ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ حضرت سید چراغ علی شاہؒ نے خرقہ ء خلافت و اجازت اور فتوحات روحانیہ سے سرفراز کیا اور فرمایا: قطب شاہ ہم نے پنجاب کی دھرتی پر تیرے نام کا بیج پھیلا دیا ہے جو تا قیامت پھلتا پھولتا رہے گا"۔[۵۳]

آپؒ کے حالات اور بزرگان سلسلہ کے بیانات سے یہی اندازہ ہوتا کہ مرید ہونے کے تقریبا دو سال بعد آپؒ کو اجازت خلافت عطا ہو گئی جو ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء بنتی ہے۔

سلسلہ طریقت:

حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ کا سلسلہ طریقت اس طرح ہے۔

۱۔ حضرت سید قطب علی شاہ بخاری قادریؒ (م:۱۳۴۶ھ۔ ۱۹۲۷ء سندھیلیانوالی شریف، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ، پاکستان)

۲۔ حضرت سید چراغ علی شاہؒ (م:۱۳۰۶ھ۔ میرک شریف)

۳- حضرت سید علی شیر بن حضرت سید فتح خان بن حضرت سلطان ہاتھیوانؒ (تاریخ وصال نامعلوم، مزار میرک شریف تحصیل شورکوٹ ضلع جھنگ)

۴- حضرت سید ایمان اللہ شاہ المعروف سلطان ہاتھیوانؒ (تاریخ وصال نامعلوم، مزار محلہ سلطان ہاتھیوان، جھنگ شہر پاکستان)

۵- حضرت سید غلام غوث بن سید غلام مرتضیٰ بن سید نصیر اللہ بن حضرت شاہ چراغ لاہوریؒ (وصال ۱۱۸۰ھ، مزار بیرون روضہ حضرت غوث بالا پیر بجانب جنوب سنگھرہ شریف ضلع اوکاڑہ، پاکستان)

۶- حضرت سید حیدر بخش بن سید اللہ بخش بن سید اسمعیل گیلانی بن حضرت شاہ چراغ لاہوریؒ (وصال نامعلوم، مزار قصبہ سلطان پور لودھی ریاست کپورتھلہ، ہندوستان)

۷- حضرت سید مجتبیٰ گیلانی بن حضرت سید مصطفیٰ گیلانیؒ (وصال ۱۱۲۳ھ بیرون روضہ حضرت شاہ چراغ بجانب مغرب نزد ہائیکورٹ لاہور، پاکستان)

۸- حضرت سید محمود گیلانی بن حضرت شاہ چراغ لاہوریؒ (وصال جمادی الاول ۱۰۸۶ھ، مزار بیرون روضہ حضرت شاہ چراغ نزد ہائیکورٹ لاہور، پاکستان)

۹- حضرت سید مصطفیٰ گیلانی بن حضرت شاہ چراغ لاہوریؒ (وصال ۱۳ شعبان المعظم ۱۰۸۴ھ، مزار بیرون روضہ حضرت شاہ چراغ بجانب مغرب نزد ہائیکورٹ لاہور، پاکستان)

۱۰۔ حضرت سید عبد الرزاق المشہور حضرت شاہ چراغ لاہوری بن حضرت سید عبد الوہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۲۲ ذیقعد ۱۰۶۸ھ مزار" روضہ حضرت شاہ چراغ "نزد ہائیکورٹ لاہور، پاکستان)

۱۱۔ حضرت سید زین العابدین بن حضرت سید عبد الوہاب رضی اللہ عنہٗ (تاریخ وصال نامعلوم مزار "اندرون روضہ حضرت شاہ چراغ" نزد ہائیکورٹ لاہور، پاکستان)

۱۲۔ حضرت سید عبد الوہاب بن حضرت سید عبد القادر ثالث رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۱۰۳۷ھ مزار "اندرون روضہ حضرت شاہ چراغ" نزد ہائیکورٹ لاہور، پاکستان)

۱۳۔ حضرت سید عبد الثالث بن حضرت سید محمد غوث بالا پیر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۱۰۲۲ھ مزار "اندرون روضہ حضرت شاہ چراغ" نزد ہائیکورٹ لاہور، پاکستان)

۱۴۔ حضرت سید محمد غوث بالا پیر حضرت سید زین العابدین بن حضرت سید عبد القادر ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۵ شوال المکرم ۹۵۹ھ مزار سنگھرہ شریف ضلع اوکاڑہ)

۱۵۔ حضرت سید عبد القادر ثانی بن حضرت سید محمد غوث گیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۱۸ ربیع الاول شریف ۹۴۰ھ مزار" اندرون روضہ حضرت سید محمد غوث گیلانی" اُوچ شریف ضلع بہاولپور پاکستان)

۱۶۔ حضرت بندگی سید محمد غوث گیلانی اوچوی بن حضرت سید ناشمس الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۷ رجب المرجب ۹۲۳ھ مزار اُوچ شریف ضلع بہاول پور، پاکستان)

۱۷۔ حضرت سیدنا شمس الدین بن حضرت سیدنا شاہ میر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۸۳۴ھ مزار حلب، شام)

۱۸۔ حضرت سیدنا شاہ میر بن حضرت سیدنا ابو الحسن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۸ ماہ ذیقعد ۷۶۶ھ مزار حلب، شام)

۱۹۔ حضرت سیدنا ابو الحسن علی بن حضرت سیدنا مسعود احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۲ محرم الحرام ۷۱۵ھ مزار حلب، شام)

۲۰۔ حضرت سیدنا مسعود احمد بن حضرت سیدنا ابو العباس احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۵ شعبان المعظم ۶۶۰ھ مزار حلب شام)

۲۱۔ حضرت سیدنا ابو العباس احمد بن حضرت سیدنا عبد السلام سوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۲۵ رجب المرجب ۶۳۰ھ مزار حلب، شام)

۲۲۔ حضرت سیدنا صفی الدین عبد السلام صوفی بن حضرت سیدنا عبد الوہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۳ رجب المرجب ۶۱۱ھ مزار مقبرہ حلبہ۔ بغداد شرف، عراق)

۲۳۔ حضرت سیدنا سیف الدین عبد الوہاب بن حضور سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۲۵ شوال المکرم ۵۹۳ھ مزار مقبرہ حلبہ۔ بغداد شریف، عراق)

۲۴۔ محبوب سبحانی غوثِ صمدانی حضور سیدنا شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی قدس سرہ النورانی (وصال ۱۱ ربیع الثانی ۵۶۱ھ مزار باب الازج المشہور باب الشیخ۔ بغداد شریف، عراق)

۲۵۔ حضرت شیخ ابو سعید مبارک المخرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۷ محرم الحرام ۵۱۳ھ مزار منطقہ سعیدیہ۔ بغداد شریف، عراق)

۲۶۔ حضرت شیخ ابو الحسن علی ہکّاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال یکم محرم الحرام ۴۸۶ھ مزار قصبہ ہکار۔ بغداد شریف، عراق)

۲۷۔ حضرت شیخ ابو الفراح یوسف طرطوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۳ شعبان المعظم ۴۴۷ھ مزار طرطوس شام)

۲۸۔ حضرت شیخ ابو الفضل عبد الواحد تمیمی یمنی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۹ جمادی الثانی ۴۲۵ھ مزار مقبرہ امام احمد بن حنبلؒ بغداد شریف، عراق)

۲۹۔ حضرت شیخ ابو بکر جعفی شبلی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۲۸ ذی الحجہ ۳۳۴ھ مزار مقام سامرہ بغداد شریف، عراق)

۳۰۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۲۷ رجب المرجب ۲۹۷ھ مزار گورستان شونیزیہ بغداد شریف، عراق)

۳۱۔ حضرت شیخ سِرّی سقطی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۳ رمضان المبارک ۲۵۳ھ مزار گورستان شونیزیہ بغداد شریف، عراق)

۳۲۔ حضرت شیخ معروف کرخی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ (وصال ۲ محرم الحرام ۲۰۰ھ مزار الکرخ۔ بغداد شریف (کہنہ)، عراق)

۳۳۔ حضرت سیدنا امام علی رضا علیہ السلام (شہادت ۱۹ صفر ۲۰۳ھ مزار مشہد مقدس۔ ایران)

۳۴۔ حضرت سیدنا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (شہادت ۵ رجب المرجب ۱۸۳ھ مزار کاظمین شریفین بغداد شریف عراق)

۳۵۔ حضرت سیدنا امام جعفر صادق علیہ السلام (شہادت ۲۴ شوال المکرّم ۱۴۸ھ مزار جنت البقیع، مدینہ منورہ)

۳۶۔ حضرت سیدنا امام محمد باقر علیہ السلام (وصال ۷ ذوالحجہ ۱۱۴ھ مزار جنت البقیع، مدینہ منورہ)

۳۷۔ حضرت سیدنا امام زین العابدین علیہ السلام (شہادت ۱۸ محرم الحرام ۹۴ھ مزار جنت البقیع، مدینہ منورہ)

۳۸۔ سید الشہدا، سبطِ رسول اللہ حضرت سیدنا امام حسین علیہ علیٰ ابیہ وامّہٖ وجدّہٖ الصلوٰۃ والسلام (شہادت ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ مزار کربلائے معلیٰ عراق)

۳۹۔ اسد اللہ غالب، امام المشارق و المغارب امیر المومنین حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم (شہادت ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ مزار اقدس نجفِ اشرف، عراق)

اخلاق و اوصاف:

مشائخِ عظام واولیا اللہ کی سوانح حیات یاران طریقت کے لیے قندیل راہ کا درجہ رکھتی ہیں مگر ان کی سوانح حیات کے مطالعہ سے یہ بات کثرت سے مشاہدہ میں آئی ہے کہ صوفیہ کرام کے سوانح و سیرت لکھتے وقت سوانح نگار اور

تذکرہ نویس ان کے محیر العقول واقعات اور کرامات پر سارا زور لگا دیتے ہیں اور ان کی شخصیت ایک تصوراتی انسان کی معلوم ہوتی ہے جو ایک خاص قسم کے لباس میں ملبوس ہے اور اپنی روحانی طاقت سے تمام ناممکنات کو ممکنات میں بدل سکتا ہے۔اس طرز سے ان بزرگوں کی اصل شخصیت، تعلیم و تربیت، دینی خدمات اور روحانی و اصلاحی کاوشوں کے وہ پہلو سامنے نہیں آپاتے جو عوام الناس کے لیے ہمت افزا اور سبق آموز ہوں۔

سلسلہ قطبیہ کی مآخذ کتب میں بھی بزرگان کے بہت سے خوارق و کرامات کا تذکرہ ملتا ہے مگر ساتھ ساتھ ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو ان کی حقیقی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ سلسلہ قطبیہ کی کتب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سید قطب علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف و روحانیت کے تمام مقامات سے بہرہ ور ہونے کے باوجود ایسی زندگی بسر کی جو ایک سادہ عام انسان کی عکاس ہے۔ آپؒ نے اسوۂ حسنہ کو طرزِ حیات بنایا ہے آپؒ اپنے ایک قول میں سالک کے لیے طرز حیات کی تلقین کرتے ہیں۔" سالک کی صفت یہ ہے کہ شریعت پر عامل اور حقیقت میں کامل ہو، متقی، پرہیز گار اور حضور ﷺ کی گفتار و رفتار و کردار سب پر ہوشیار ہو"۔ آپؒ کی ذات جامع کمالات اور مجموعۂ اوصاف تھی۔ یہاں آپؒ کی شخصیت کے کچھ پہلو پیش کیے جارہے ہیں۔

ا. شریعت کی پاسداری:

حضرت سید قطب علی شاہؒ کے جملہ اقوال و افعال، اعمال و اطوار، وضع قطع، نشست و برخاست، لباس و خوراک، معمولات اور عبادات شریعت کے تابع تھے۔ سفر ہو یا حضر تمام زندگی حضرت قطب عالمؒ کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ نماز تہجد صبح تین بجے ادا فرماتے پھر نوافل و مراقبہ میں مشغول رہتے۔ نماز فجر کے بعد چھ پارے قرآن مجید کی تلاوت فرماتے اور ہر پانچویں روز قرآن مجید ختم کرتے۔ نوافل اشراق کے بعد گھر سے باہر تشریف لاتے۔ رات کو بلا ناغہ سو رکعت نفل ادا فرماتے تھے۔ آپؒ ہر طور شریعت کی پاسداری فرماتے۔ یہاں تک کہ حاضر ہونے والوں کے غیر اسلامی نام تبدیل فرمادیتے۔ کسی بھی قسم کے غیر شرعی افعال اور وظائف کی اجازت نہ تھی بل کہ اتباع سنت کی ترغیب دی جاتی۔ پیر محمد طاہر حسین قادری نے لکھا ہے

> " اس وقت جہالت عام ہونے کی وجہ سے لوگ عورتیں لے کر فرار ہو جاتے اور بغیر نکاح کے ساتھ رکھتے، حضور سید قطب علی شاہؒ نے اس برائی کو ختم کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا کہ ارد گرد

علاقوں میں جہاں ایسے افراد کا سنتے انہیں نکاح کی ترغیب دیتے اور فرماتے بغیر نکاح کے عورت گھر میں رکھنا گناہ عظیم ہے۔"(۵۴)

اپنی مجالس اور اشعار میں کئی مواقع پر آپ شریعت کی پابندی اور اہمیت پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ دیوان قطبیہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

شریعت میں ہو پہلے محکم پسر
تاں ہو طریقت کی تجھ کو کبر(۵۵)

آپؒ نے تمام زندگی نہ صرف خود شریعت کی پاسداری میں احتیاط اختیار کی بل کہ اپنے مریدین و متوسلین کو بھی یہی تلقین فرماتے۔ گویا آپؒ کے ذات ستودہ صفات شریعت محمدیؐ کا عملی نمونہ تھی۔ کتاب لمعات قطب میں آپؒ کا قول ہے۔

"جو سنت رسولؐ کے ایک ذرہ بھر بھی خلاف کام کرے تو وہ ہر گز ولی نہیں ہوتا اور نہ وہ کسی منازل و مدارج کو پہنچ سکتا ہے۔"(۵۶)

اس طرح آپؒ کے قول و فعل سے شریعت کو طریقت پر فوقیت دیتے ہیں۔

۲. علم دوستی:

حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ علم سے محبت اور مطالعہ سے خاص شغف رکھتے تھے۔ مطالعہ کے لیے اوقات مقرر تھے۔ دن ۱۲ بجے سے ظہر تک بلاناغہ مطالعہ اور تالیف و تصنیف کا کام کرتے۔ آپؒ اکثر کتابوں پر حاشیہ تحریر فرماتے اور دستخط بھی فرمادیتے۔ بعد از وصال بھی بنگلہ کے تہ خانہ سے کئی نایاب کتب دستیاب ہوئیں جو آپؒ کے زیر مطالعہ رہ چکی تھیں۔ حضرت قطب عالمؒ نے فرمایا۔" آج کل بزرگوں کی مجلس نہیں ملتی اس لیے اولیااللہ کی تصانیف کا مطالعہ کیا کرو۔"(۵۷) (آپؒ اپنے متوسلین اور مریدین کو بھی حصول علم اور مطالعہ کی بے حد تاکید فرماتے۔ حضرت

شیر محمد گیلانی قادریؒ اس بات کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں)۔ کتب سلسلہ میں مذکور ہے کہ حضرت سید شیر محمد گیلانی فتحپوری کا منظوم کلام پنجابی مکاتیب کا مجموعہ "مکتوبات عشق" حضرت قطب عالمؒ کی ایما پر طبع ہوا اور اس کے آخر میں حضرت پیر سید حسین میرک شریف کا منظوم کلام آپؒ نے ہی حضور شیریزدانیؒ کو اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا۔

" کھلے طالعہ نال مطالعہ دے، نقطہ دسیاں محلوی پیر مینوں "(۵۸)

خلیفہ میاں اللہ یار کملانہؒ کے ذاتی احوال پر مشتمل ۹ خطوط " الہامات الٰہیہ " کے نام سے ۱۹۲۵ میں خانقاہ قطبیہ سے شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں ایک وہابی مولوی کے ۳۳ سوالات کا دندان شکن جواب حضرت قطب عالمؒ کے حکم پر حضرت پیر غلام محمد جلو آنوی نے "نور الایمان فی علم العرفان" کے نام سے لکھا اور اس کا مقدمہ حضرت قطب عالمؒ نے خود تحریر فرمایا۔ سلسلہ قطبیہ سے وابستہ کئی علما و خلفا نے مختلف موضوعات جو کتب تصنیف کی ہیں یہ آپؒ کے ہی روشن کردہ علمی و روحانی چراغ کی کرنیں ہیں جو اب تک ہر سو روشنی بکھیر رہی ہیں۔

۳. خدمت خلق:

حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ نے ہمہ وقت خود کو لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کیے رکھا۔ ان کی ظاہری مالی امداد کے ساتھ ساتھ ان کے باقی دکھ اور مصائب و مسائل بھی حل فرماتے۔ لانگریوں کو آپؒ کا حکم تھا کہ بلا امتیاز مذہب و ملت ہر آنے والے کو کھانا کھلاؤ۔ آپ خاندانی رئیس اور نمبر دار تھے۔ ہمیشہ اپنا روپیہ پیسہ عام عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ فرماتے۔ سلسلہ کی معتبر کتب میں آپؒ کے کئی ایسے واقعات موجود ہیں۔ یہاں ان میں سے ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس سے آپؒ کی خدا ترسی اور خدمت خلق جیسی صفات اجاگر ہوتی ہیں اور آپ کی فکری اپج نمایاں کرتی ہیں۔ حضرت قطب عالم نے دربار شریف پر جب پختہ مسجد کی تعمیر شروع کروائی تو دو مرتبہ چھت ڈالنے کے قریب پہنچ کر آپ مسجد شہید کروا دیتے کہ جیسے میں چاہتا ہوں ویسے تیار نہیں ہوتی تیسری مرتبہ جب چھت قریب پہنچی تو حضور پسند فرماتے ہوئے چھت ڈالنے کا حکم صادر فرمایا۔ معماروں نے جسارت کر کے پوچھ ہی لیا کہ پہلے دو مرتبہ بھی ایسے ہی بنی تھی۔ ضرور کوئی خاص وجہ ہے آخر ان کے اصرار پر فرمایا، ہمارے علاقے میں ان دنوں قحط پڑا ہوا ہے اور مسجد کی تعمیر پر غرباء کی مزدوری کا بہانہ خدا ساز موقع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت طویل عرصہ جاری رکھنے کی غرض سے دو مرتبہ

گرادیا گیا۔ اب چونکہ بحران ختم ہو چکا اس لیے چھت ڈالنا مناسب سمجھا۔ آپؒ کی زندگی میں ایسی کئی مثالیں موجود رہیں جو کا آپ جذبہ خدمت خلق کو جاگر کرتی ہیں۔

۴. صبر و تحمل:

حضرت قطب عالمؒ خوش اخلاق، کریم النفس اور بڑے متحمل مزاج تھے۔ جس طرح آپؒ باقی اوصاف میں سنت کے تابع رہے یہاں تک کہ آپؒ کی نشست و برخاست اور چال ڈھال، لباس و خوراک سب میں اسوہ حسنہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ آپؒ کے سوانح میں درج ہے کہ آپ کا حجام ضعیف العمر اور کمزور نظر تھا۔ اس کے اوزار بھی اسی کی طرح بوڑھے تھے حضرت قطب عالم مزاح کے طور پر فرمایا کرتے تھے "جس کی یہ حجامت کرے اس پر قبر کا عذاب معاف ہو جاتا ہے"۔[۵۹] یعنی اس کا حجامت بنانا اتنا تکلیف دہ ہوتا تھا۔ مگر حضرت ایسے بردبار اور غریب نواز تھے کہ اس کی بجائے حجامت کسی اور سے کرواتے اور اسے فارغ کر دیتے۔ آپؒ اسی غریب حجام سے حجامت بنواتے تھے۔

۵. فقر و استغناء:

حضرت سید قطب علی شاہؒ کا ارشاد ہے "فقیر کو کمال کی حالت میں سوال کرنا مطلق زوال ہے"۔[۶۰] آپؒ کی سوانح کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ توکل و قناعت حضرت کا شعار تھا۔ ملک محمد نواز کھوکھر بیان کرتا ہے کہ میں نے اپنی ساری زندگی دیکھنے کے علاوہ یہ سنا بھی نہیں کہ حضور نے کبھی کسی درویش سے کچھ طلب فرمایا ہو۔ آپؒ کا ارشاد ہے کہ "غنا کی حقیقت یہ ہے کہ تو اپنے ہم جنسوں سے مستغنی ہو جائے"۔ حضرت قطب عالمؒ کی ذات کا ایک نمایاں وصف دنیا کی محبت سے بے توجہی تھی۔ دنیاوی مال و متاع سے کسی قسم کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ نہ ہی دولت جمع کی اور نہ ہی دولت سے محبت تھی۔ میاں لال درویش روایت کرتا ہے کہ میری موجودگی میں سرگانہ قوم کا آدمی حضرت قطب عالمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا، حضور کا بڑا خرچ ہے" آپ نے جواب میں فرمایا ہمارا کوئی خرچ نہیں مخلوق بھی خدا کی اور خرچ بھی خدا کا"۔ ہم تو خداوند کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ سے مخلوق کو کھلا رہا ہے چھوٹا سا ٹکڑا لنگر کا ہم بھی کھا لیتے ہیں۔ میاں امیر بخش نول سے مروی ہے کہ حضور قطب عالمؒ فرماتے "یہ فانی دنیا ڈھلتا پچھانواں ہے" پھر وضاحت

فرماتے کہ یہ دنیا سائے کی مانند ہے جس کے پیچھے چلیں تو آگے بھاگتا ہے اور اگر اس سے پشت کر کے چلیں تو یہ پیچھے دوڑتی ہے"۔

آپؒ اپنے اشعار میں بھی یوں فرماتے ہیں

"ہے یہ دنیا بے وفا پر مکر فن

نوجواں آتی نظر پر پیر زن

کیوں تو ہے مغرور اس کے حسن پر

آج کل جاوے گا تو بھی چھوڑ کر"(۶۱)

حضرت قطب عالمؒ ایک رئیس اور بڑے زمین دار تھے لیکن آپ نے دنیا اور دنیا کی دولت کو فقط جیب تک رکھا اور بھی دل میں اس کی محبت نہ ڈالی اور ہمیشہ اسے راہ خدا میں خرچ کیا۔

۶. مہمان نوازی:

آپؒ بے حد مہمان نواز تھے۔ خانقاہ پر آنے والوں کے لیے مہمان خانے اور لنگر خانے تعمیر کروائے۔ مہمانوں کی آمد سے نہایت خوش ہوتے۔ اس معاملے میں مرید و غیر مرید اور امیر غریب میں کوئی فرق نہ تھا البتہ علماء اور سادات کرام کا خاص خیال فرماتے۔ مہمان جتنے دن زیادہ ٹھہرتے حضور اتنے ہی شاد ہوتے۔ اکثر اجازت طلب کرنے پر فرماتے اچھا تھا کچھ دن اور رک جاتے، اکثر اوقات جانے والوں کو ساتھ لے جانے کے لیے بھی کھانا عطا فرماتے۔ میاں محمد چراغ آرائیں سے منقول ہے ہمیں جب اجازت ملتی تو لانگری کو حضرت قطب عالمؒ فرماتے انھیں سات آٹھ روٹیاں دے دو"(۶۲) ہم خود بھی کھاتے اور گاؤں واپس پہنچ کر ان کے ٹکڑے پیر بھائیوں میں بطور تبرک تقسیم کرتے۔

۷. سخاوت و فیاضی:

حضرت سید قطب علی شاہؒ بڑے فیاض اور رحم دل تھے۔ غم زدوں کی دل جوئی، غریبوں کی دست گیری مصیبت زدوں اور ناداروں کی مدد آپؒ کا شعار تھا۔ سائل اور حاجت مند کبھی آپؒ کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹا۔ حاجت روائی کا یہ عالم تھا کہ بن مانگے عطا فرما دیتے۔ مولوی انور علی کھوکھر سے روایت ہے کہ ایک نابینا جو آپ کا

مرید تھا اکثر ان کے ساتھ ہی دربار شریف پر آیا کرتا۔ نابینا افراد کا کرایہ گاڑی پر معاف ہوتا تھا لیکن وہ جب بھی آتا حضرت قطب عالمؒ کچھ نہ کچھ روپے اس کی جیب میں ڈال دیتے۔ وہ نہ لینا چاہتا پھر حضور فرماتے حافظ یہ کرایہ ہے، رکھ لو۔ آپؒ بے حد درجہ سخی تھے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری تحریر کرتے ہیں

> ''ایک مرتبہ حضرت قطب عالمؒ کی سواری والی گھوڑی جسے ''لکی'' کہتے تھے ڈاکو چوری کرنے کے لیے آئے، ساری رات گھوڑی کو لے کر باغ میں پھرتے رہے مگر انھیں باہر نکلنے کا راستہ نہ مل سکا، صبح کو پکڑے گئے اور حضور کے خدمت میں پیش کیے گئے تو معافی کے طلبگار ہوئے۔ آپؒ نے فرمایا ''بھائی گھوڑی تو مجھے بھی پیاری ہے کہ سوار ہوتا ہوں لیکن محنت تم لوگوں نے بھی بہت کی ہے اسے لے جاؤ۔''(۶۳)

آپؒ نے نہ صرف انھیں معاف فرمادیا بلکہ وہ گھوڑی بھی انہیں عطا فرما دی۔ قطب سلسلہ میں حضرت سید قطب علی شاہؒ کے اور بہت سے اوصاف منقول ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ پیکر، عجز وانکسار، حلیم الطبع، شریف النفس اور خلیق انسان تھے۔ بڑوں سے ادب و احترام سے پیش آتے اور چھوٹوں پر شفقت فرماتے۔ رعب و جلال کے باوجود بے حد شفیق و مہربان تھے۔ بیماروں کی بیمار پرسی فرماتے اور عزیز و اقارب کی خبر گیری رکھتے۔ کبھی کسی کی دل شکنی نہ فرماتے۔ راست گوئی اور شیریں بیانی آپؒ کے کلام کا خاصہ تھا۔ آپؒ سراپا محبت تھے ایسے اوصاف و اطوار ہی زائرین و سالکین کو آپ کا گرویدہ بنادیتے۔

آپؒ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں جن کا ذکر مختلف کتابوں میں موجود ہے مگر آپؒ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ آپؒ مردہ دلوں کے مسیحا تھے۔ جو شخص آپ کی بارگاہ میں آتا اس کا دل ذکر سے زندہ ہو جاتا اور وہ آپؒ کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر شریعت کا عامل اور طریقت کا راہی بن جاتا۔

ازواج و اولاد:

حضرت سید قطب علی شاہ بخاریؒ نے تین شادیاں کیں۔ آپ کی پہلی شادی سیدہ ناظم خاتون عرف اداموں مائی سے ہوئی۔ جن کے بطن سے دو صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے تولد ہوئے۔ جن کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔

۱۔ سیدہ جندوڈی صاحبہ:

آپ حضرت سید قطب عالمؒ کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں۔

۲۔ حضرت سید فضل حسین شاہؒ:

آپؒ حضرت قطب عالمؒ کے پہلے فرزند ارجمند تھے۔ آپؒ کا سن ولادت ۱۸۷۵ء ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر حاصل کی۔ بعد ازاں اس دور کے مروجہ علوم نامور علماء سے حاصل کئے۔ آپؒ صاحب کمالات و کرامات تھے۔ جوانی میں شکار سے شغف رکھتے تھے۔ آپؒ کی بیعت و خلافت حضرت سید شیر محمد گیلانی فتحپوریؒ سے تھی جو حضرت سید قطب علی شاہؒ حضرت سید قطب عالمؒ کے حکم پر حضرت شیر یزدانیؒ نے سائیں فضل حسین شاہ کو بیعت سے مشرف فرمایا۔ حضور شیر یزدانیؒ نے آپؒ کے والد ماجد حضرت قطب علی شاہؒ کی تدفین کے بعد خلافت عطا فرما کر حضرت قطب عالمؒ کا سجادہ نشین مقرر فرمایا۔ آپؒ پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ اپنے مرشد و مربی کے ہجر و فراق میں لکھے گئے ''بارہ ماہ'' اور کربلا نامہ'' یادگار ہیں۔ اُپؒ کا وصال ۱۵ جولائی ۱۹۳۹ء کو ہوا۔ اپنے والد ماجد حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ کے پہلو میں دفن ہیں۔

۳۔ سیدہ دولت خاتون:

آپ سائیں فضل حسین شاہؒ سے چھوٹی تھیں۔ آپ کی عمر ابھی سات سال تھی کہ والدہ ماجدہ کا سایا سر سے اٹھ گیا۔ حضرت سید قطب علی شاہؒ کی پہلی زوجہ کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد دوسری شادی سیدہ سردار بیؒ جن سے آپ کی تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں۔ **اول: سیدہ فتح بیگم عرف فتولال، دوم: سیدہ جنت بیگم اور سوم: سیدہ امیر بیگم**

حضرت قطب عالمؒ نے تیسری شادی بخت بھری عرف مائی بکھاں سے فرمائی جن کے بطن سے ایک صاحبزادی سیدہ زہرہ بیگم عرف زہرو پیر اور ایک صاحبزادے پیر سید محمد غوث متولد ہوئے جو بچپن میں وصال فرما گئے تھے۔

تصانیف:

حضرت قطب عالم اپنے زمانہ کی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے، جن کے علمی و ادبی مقام سے انکار ممکن نہیں۔ آپ کا ایک وسیع المطالعہ علم دوست تھے۔ آپ کا نادر کتابخانہ اس ضمن میں بطور یادگار ہے جو کہ خانقاہ منگانی

شریف کی لائبریری "کتابخانہ ابن کرم" میں علیحدہ گوشہ کے طور پر محفوظ ہیں۔ آپ ایک اچھے شاعر، عمدہ نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک با عمل صوفی اور پر اثر خطیب بھی تھے آپ کی دستیاب تصانیف تقریباً ۹ ہیں جن میں ایک آپ کی شاعری "دیوان قطبیہ" اور دوسرے آپ کے ملفوظات "مراۃ الفقرا" بھی شامل ہیں۔ان کا مختصر تعارف ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے۔

۱- اسرار المعرفت:

یہ کتاب حضرت قطب علی شاہ کی پہلی نثری تصنیف ہے۔یہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب کا مقدمہ بھی حضرت قطب عالمؒ نے خود تحریر فرمایا۔ تین اشخاص قاضی غلام میراں از اولاد علی حیدر صاحب (قاضی غالب)، سید سردار علی شاہ از خاندان حضرت شیخ اسمٰعیل اور خلیفہ یار محمد مجاور خانقاہ متبرکہ خواجہ محمد حسن شہید ملتانیؒ نے اس کتاب کے قطعات تاریخ لکھے۔ یہاں پر خلیفہ یار محمدؒ کا قطعہ تاریخ کا ایک ٹکڑا پیش ہے۔

"چونکہ حضرت قطب شاہ قطب زماں
ہست کامل باغبانِ معرفت
کرد تصنیف ایں کتابے مستطاب
واہ چہ عمدہ بوستان معرفت
دہ امانش یا خدا از بو الفضول
کن نصیب نکتہ دان معرفت
سال تصنیفش خرد گفتہ چنیں
گو خلیفہ "داستانِ معرفت"
۱۳۰۶ھ (۶۴)

اس کتاب کی کم و بیش نو (۹) اشاعتیں ہو چکی ہیں۔ آخری مرتبہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دو خطی نسخے "کتابخانہ ابن کرم" منگانی شریف (جھنگ) میں موجود ہیں جن میں اس کا پہلا نام "ہدایت الانسان سر العارفان" اور شروع میں یہ رباعی تحریر تھی۔

کتاب کا بھی نام سن تو اے جوان ہدایت الانسان سر العارفان پس عدد اس نام کے کر تو بیان تیرا سو چھ سہ ہجری ہے عیان بعد میں جب نام ابرار المعرفت تجویز کیا گیا تو یہ رباعی بھی حذف کر دی گئی۔ حضرت قطب عالمؒ نے اس کتاب میں اسلامی عقائد و عبادات اور تصوف کو شریعت اور طریقت کے معیارات کو سامنے رکھ کر تحریر کیا ہے جس سے اسلامی تصوف اور عبادات کی اصل صورت واضح دکھائی دیتی ہے۔ اس کتاب کو قبولیت عامہ کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت قطب عالمؒ نے اس کتاب کو دس فصلوں میں کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے۔

۱- در حقوق و آداب۔ ۲-عقائد اسلام۔ ۳-در مذمت دنیا و اہل دنیا

۴-در توبہ و رحمت الٰہی ۵-در فرائض و ظاہر و باطن و عبادات

۶-در بیان معرفت ۷-در ذکر سرور و فضیلت عشق

۸-در مسائل متوفقہ ۹-در حرکات شیطان ۱۰-در ختم ارواح۔

درج بالا موضوعات سے کتاب میں شامل مواد کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر اس کتاب کا اسلوب اور قاری سے خطابت کا انداز اس کی اہمیت کو دوچند کر دیتا ہے۔

۲۔ رد شیعہ بقول امامیہ:

یہ کتاب حضرت قطب عالمؒ کے دو رسائل کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اہل تشیع کے رد میں تحریر کیے۔ آغاز میں وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”ایک شیعہ صاحب نے بذریعہ کاغذ مجھ سے جواب طلب کیا کہ کتاب نہج البلاغت میں وہ کون کون سے مواقع ہیں جہاں جناب امیر علیہ السلام نے اصحابہ کرام یعنی خلفائے ثلاثہ کی تعریف کی ہے؟ اس کتاب کے مواد کو درج ذیل عنوانات سے ترتیب دیا گیا ہے جن کے لکھنے سے ہی ان کی اہمیت روشن ہو جاتی ہے۔

۱-خلفائے ثلاثہ کے ایمانِ کامل کا ثبوت ۲-خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا ثبوت

۳-نہج البلاغت میں شیعوں کی خیانت و غلطی کا ثبوت۔

۴-خدا کے قرآن میں لفظ شیعہ کی مذمت

۵-قرآن شریف میں لفظ سنت کی تعریف

۶-آئمہ علیہم السلام کے مذہب کا بیان اور بدعت کا ذکر

۷-اُن بدعتوں کا ذکر جو مذہب شیعہ میں ہیں

۸-جناب امیر علیہ السلام کی اولادِ اکرام کے مذہب کا بیان

کتاب میں شامل دوسرے رسالے کا نام ''رد رسالہ برہان جلی'' ہے۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہونے کی اطلاعات ملتی ہے۔ اس کتاب کا دستیاب ایڈیشن بو کتاب خانہ ابن کرم میں ہے جو ۱۳۶۹ء میں گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے چھاپا ہے۔ کل صفحات ۲۱۲ ہیں ۷۴ صفحات پر ''رسالہ رد شیعہ اور پھر رسالہ برہان جلی'' ہے۔ بقیہ صفحات پر اشتہار مباحثہ اور شرائط مباحثہ تحریر ہیں۔

۳۔ فہرست نہج البلاغت:

کتاب ''نہج البلاغت'' حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم کے خطبات کا مجموعہ ہے۔ جو علامہ سید شریف مرتضیٰ حلی (م: ۴۳۶) نے مرتب کیا۔ حضرت سید قطب علی شاہؒ نے اس معروف کتاب کا خلاصہ جو کہ ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے نہایت عرق ریزی سے مرتب فرمایا اور اگلے ۱۰ صفحات میں ایک الحاقی خطبہ ''شقیقیہ'' پر بحث کی ہے شیعہ حضرات نے یہ خطبہ اپنی طرف سے شامل کتاب کیا ہے۔ چونکہ اکثر خطبات میں جناب امیر علیہ السلام نے خصوصاً اصحابِ ثلاثہ اور اصحاب دیگر کی بھی ضمناً تعریف فرمائی ہے لہذا، تمام خطبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ خطبہ الحاقی اور غلط ثابت ہوتا ہے۔ تمام شیعہ کا مذہبی دارومدار صرف اسی خطبہ پر ہے، جس کی رو سے خلافت کے حقدار صرف جنابِ امیر ہی تھے اور اجماع غیر نے حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ نامزد کیا تو جنابِ امیر کو نہایت غم ورنج پہنچا، اس من گھڑت افسانہ کی تکذیب میں حضور قطبِ عالمؒ کا موقف یہ ہے کہ ''اگر اس خطبہ میں جنابِ امیر نے خلفائے ثلاثہ کی شکایت فرمائی تو پھر دیگر خطبات میں ان کی تعریف وتوصیف کیا معنی رکھتی ہے؟۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خطبہ الحاقی ہے جو بعد میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مطبع اسلامیہ لاہور اور گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ دونوں ایڈیشن ''کتابخانہ ابن کرم'' میں موجود ہیں۔

۴- شوائظ ابر قات: (۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۵):

یہ حضرت کی تمام کتابوں میں جامع اور ضخیم ہے۔ سن تصنیف ۱۳۱۳ھ درج ہے اور مقدمہ بھی حضرت قطب عالمؒ نے خود تحریر فرمایا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں ہوئی جو ۱۲*۸ کی تقطیع پر حسب فرمائش لالہ پاری رام و امیر چند کتب فروشان موضع سندھیلیانوالی شریف ڈاکخانہ تلمبہ ضلع ملتان کریمی سٹیم پریس لاہور سے طبع ہوئی۔ دوسری اشاعت ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۰۹ء بحکم سید اسرار حسین شاہ صاحب ولد سید فضل حسین شاہ صاحب قدس سرہ سجاد نشین سندھیلیانوالی المعروف پیر محل با اہتمام حافظ سید محمد تاجر کتب سندھیلیانوالی ضلع لائل پور میں شائع ہوئی۔ تیسری اشاعت بشکل نو کی صورت میں پیر سید اسرار حسین شاہ قدس سرہ نے اپنے دیباچہ کے ساتھ ستمبر ۱۹۹۴ء میں شرکت پرنٹنگ پریس لاہور شائع کروائی۔ اس کا قلمی نسخہ اور طبع زاد نسخہ جات کتاب خانہ ابن کرم میں محفوظ ہیں۔ کتاب کے ماخذ، مصادر کی فہرست اسے تحقیقی حوالے بھی اہم بنا دیتی ہے۔ اس نادر اور لاجواب کتاب میں مذہب شیعہ کے ہر طعن کا بطلان اور اصحاب ثلاثہ کے ایمان و شان کو مکمل دلائل اور حوالہ مستند جات سے عیاں کیا گیا ہے جس سے اس کی مقبولیت اور اہمیت طبقہ علماء کے ساتھ ساتھ میدان تحقیق میں بھی مسلم ہے۔

۵- مناظرہ ہیر و قاضی:

یہ کتاب نظم و نثر کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس کے حصہ اول میں حافظؒ فتح محمد علیہ الرحمہ کی پنجابی سی حرفی جو ہیر و قاضی کے مابین ایک مکالمہ ہے۔ حضرت قطب عالمؒ نے ہر بند کی اردو نثر میں شرح بیان کی ہے۔ حضرت نے نہ صرف ہر بند کو عنوان دیا بلکہ اس کی شرح میں قرآن و حدیث، حکایات و واقعات اور بزرگان کے احوال درج کر کے اسے عام فہم بنا دیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں حضرت سید قطب علی شاہؒ کے خلفا اور مریدین کا پنجابی کلام شامل کیا گیا ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جن میں سے چار کتابخانہ ابن کرم میں موجود ہیں۔ ایک ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں میاں سردار بخش و حافظ سید محمد تاجران کتب سندھیلیانوالی شریف ضلع ملتان کی فرمائش پر ''مطبع کریمی سٹیم پریس لاہور'' سے چھپا جو ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا اور اس پر بار ششم لکھا ہوا ہے۔ صفحات ۱۲۰ ہیں تیسرا پاکٹ سائز اخباری کاغذ پر بغیر سن اشاعت ہے۔ اور چوتھا بشکل نو ستمبر ۱۹۹۸ء میں حضرت پیر سید اسرار حسین شاہؒ نے اپنے دیباچہ کے ساتھ ''شرکت پرنٹنگ پریس'' لاہور سے چھپوایا مگر اس میں دوسرا حصہ شامل نہیں ہے۔

۶- انوار قدسیہ فی رد رموز بدیعہ:

یہ کتاب بھی حضرت قطب عالمؒ کے دو رسائل کا مجموعہ ہے سن تصنیف ۱۳۴۰ھ ہے۔ یہ کتاب ۹۲ سال پہلے چھپی اور دوبارہ کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ پہلا رسالہ جو بکواس ٹاٹویہ کے رد میں انوار قدسیہ فی رد رموز بدیعہ بکواس ٹاٹویہ کے نام سے لکھا گیا جو ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے دوسرا رسالہ جو ایک شیعہ کے سوالات پر تحریر ہوا۔ یہ سیف امامیہ بر مذہب شیعہ کے نام سے ۱۴ صفحات پر مبنی ہے یہ کتاب ۹*۶ کی تقطیع پر ہے اور سرورق پر امداد الہیہ لکھا ہے اور اسی نام سے مشہور ہے۔ کتابت ''عارف حسین کاتب تلمیذ حضرت امتیاز رقم ایمن آبادی، لاہور'' نے کی ہے۔

۷- رسالہ حیات النبی ﷺ:

یہ کتاب ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں تحریر ہوئی۔ اس کتاب میں حضور ﷺ اور اولیائے کرام کے بارے میں پیدا ہونے والے اختلافی مسائل کا جواب دیا گیا ہے۔ اس حوالہ سے ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ بھی حضور قطب عالم نے خود تحریر فرمایا جس میں اس کتاب کے تحریر کرنے کے متحرکات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۸- دیوان قطبیہ:

یہ حضرت قطب علی شاہؒ کی شاعری کا مجموعہ ہے جسے ۲۰۰۴ء میں حضرت پیر محمد طاہر حسین قادری نے مرتب کیا ہے۔ حضرت قطب عالم نے باقاعدہ شاعری تو نہیں کی لیکن مختلف اوقات میں اپنے ذوق کی تسکین کے لیے فارسی، اردو اور پنجابی شعر موزوں کرتے رہے۔ آپ کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے غلبہ حال کے لطیف جذبات، احساسات کو شعر میں ڈھالنے کا ملکہ رکھتے تھے اور شعری اصناف و تراکیب سے خوب واقف تھے۔ شاکر کنڈان دیوان قطبیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دیوان قطبیہ میں تصوف اور رموز انسان و کائنات پر فکر و آگہی کے جو نمونے ہمیں ملتے ہیں انھیں پڑھ کر ایمان کی پختگی ہوتی ہے اور یقین و اتحاد بحال ہوتا ہے چونکہ آپ نے شاعری کو اپنا ذریعہ اظہار مستقلاً نہیں سمجھا سو کہیں کہیں فنی اسقام بھی دکھائی دیتے ہیں جنھیں فکر و خیال کی عمدگی میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۳۴ صفحات کے اس شعری مجموعے کے آخر میں اقوال و ارشادات قطبیہ بھی طراوت روح کا سامان مہیا کرتے ہیں''۔[۶۵]

۹- مراۃ الفقراء:

یہ کتاب حضرت پیر سید قطب علی شاہ قادریؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس میں آپ کی سترہ مجالس بیان کی گئی ہیں۔ آخر میں دیوان قطبیہ کی غزلیات اور منظوم شجرہ قادریہ دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے صفحات ۱۳۷ ہیں۔ کئی بار اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ کتاب کے مرتب سلطان بن محمد رضوان فقیر سکنہ کوٹ کمالیہ ہیں۔ جو اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

> ''فقیر اپنے پیر جناب قطب الاقطاب ہادی راہنما حضرت سید قطب علی شاہ دامت برکاتہ کی خدمت میں رہتا تھا لیکن عرصے سے دل میں خواہش تھی کہ اگر میرا پیر ہادی رہنما اجازت فرمائیں تو میں چند مسائل جو آپ کی زبان در فشاں سے مبین ہوں بطور ملفوظ تحریر کروں، مگر ہیبت کے سبب سے عرض نہ کر سکتا تھا۔ ایک روز خود ہی آپ نے کرم فرما کر اشارہ کے طور پر فرمایا کہ زہے سعادت اس مرید کی جو کچھ اپنے پیر کی زبانی سنے۔ لکھ لیوے''۔[۶۶]

حضرت قطب عالمؒ سے اجازت طلب کرنے پر آپ نے فرمایا: بہت بہتر ہے تم لکھو نیک کام کرنا عین سعادت ہے۔ مرتب تحریر کی اجازت حاصل ہونے کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے ''بندہ کو ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ بروز جمعہ عام اجازت ملی اور تمام مراد دلی حاصل ہوئی''۔

ان تصانیف کے علاوہ آپؒ کی مکتوب نگاری اور خطبات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مگر وہ کسی کتابی صورت میں آنے تک محفوظ نہ رہ سکے۔ ایک خط ''کتابخانہ ابن کرم'' منگانی شریف میں موجود ہے۔ علاوہ آپؒ خطوط کا بروقت جواب دیتے تھے۔ اس ضمن میں آپؒ کے خلف اکبر حضرت سید شیر محمد گیلانیؒ کی کتاب ''مکتوبات عشق'' میں نمایاں آثار موجود ہیں دیکھیے۔

> ''خط ویندیاں سار نہال ہویا خوش حال ہویا خوش حال ہویا
> چم چٹ کلیجڑے نال لایا سینہ صاف جو بدر مثال ہویا
> زیادہ شوق سیتی اکھیں نیر پلٹے، روح غوطیاں نال نڈھال ہویا
> کریں شیر محمد شکر ہر دم تھیتھے پیر دا ترس کمال ہویا''[۶۷]

حضرت قطب عالمؒ نے نظم و نثر میں اردو اور فارسی زبان کے علمی و ادبی سرمائے میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ وقت کے لحاظ سے اہم دینی اور سماجی موضوعات پر سیر حاصل خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا تصنیفی کام شاہد ہے کہ وہ ایک عمدہ نثر نگار اور بہترین شاعر تھے۔

وصال / وفات:

سلسلہ قطبیہ کی معتبر کتب میں آپ کی تاریخ وفات کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے۔ حضرت پیر غلام محمد جلو آنوی نے آپؒ کے وصال پر رسالہ وصال نامہ تحریر کیا اس میں تاریخ وفات اس طرح بیان کی گی ہے۔

"بروز خمیس بوقت اشراق بتاریخ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ بمطابق ۲۲ دسمبر ۱۹۲۷ء مطابق ۸ پوہ ۱۹۸۴ بکرمی کو اس آفتاب سپہر نہایت و ماہتاب فلک ہدایت نے اس دار فانی سے طرف عالم جاودانی کے اپن نگاہوں کو پھیر لیا۔[۶۸]

مزید قطع تاریخ وصال یوں تحریر کرتے ہیں۔

"بوقت آمد اشراق وروز پنجشنہ کہ بود دست و ششم از جمادی الثانی ہزار و سہ صد و چہل و شش از سن ہجری بگشت واصل حق آں حبیب سبحانی بگفت ہاتف غیبم کہ سال ترحیلش بجوز محو خدا شاہ قطب ربانی"۔ ۱۳۴۶ھ[۶۹]

مولوی احمد دین کمالوی جن کا تخلص احمد ہے۔ حضرت قطب عالمؒ کا قطعہ تاریخ ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں

"بو صل خدا قطب علی شاہ خرم

مشو محو رنج والم درد و ماتم

ہمہ حور و غلمان و رضوان جنت

شد آراستہ بہر تعظیم باہم

ملک در جناں بر وچوں روح اطہر

ملائک بکر دند ہمہ خیر مقدم

ندا آمد از غیب در گوش احمد

بہ جنت مکاں کرد شاہ قطب عالم"

۱۳۴۶ھ[۷۰]

مصنف "تاریخ ابن کرم" کے مطابق آپؒ کو جمعرات ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ عصر کے وقت بخار ہوا اور علاج معالجہ شروع ہوا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ایک ہفتہ علیل رہنے کے بعد آپؒ واصل حق ہوئے۔ آپؒ کی تاریخ وفات کے متعلق مصنف لکھتے ہیں جمعرات بوقت اشراق بتاریخ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۱۹۲۷ مطابق ۸ پوہ ۱۹۸۴ بکرمی کو وصال فرمایا۔[۷۱]

مدفن:

حضرت پیر سید قطب علی شاہ بخاری قادریؒ کا مدفن اور مزار مبارک سندھیلیانوالی شریف پیر محل (ٹوبہ ٹیک سنگھ) میں ہے۔ آپؒ نے اپنی حیات مبارکہ میں مسجد اور اپنے والد ماجد کے محل کی تعمیر (۱۹۲۰) کے بعد اپنے لیے ایک حجرہ تعمیر کروایا جس کے تین اطراف میں خوبصورت برآمدہ بنوایا گیا۔ آپؒ کی تدفین کے بعد سجادہ نشین اول حضرت پیر سید فضل حسین شاہؒ نے ۱۹۲۸ میں اٹھاس کے اوپر دل کش گنبد تعمیر کروایا۔ اس عمارت کی بلندی کم و بیش ۴۰ فٹ ہو گی۔ اندرون روضہ مبارک کو خوبصورت نقش و نگار سے مزّین کیا گیا۔ اکابر تذکرہ نگاروں نے اپنی کتب میں اس مزار پر انوار کا ذکر کیا ہے علامہ عبد الحکیم شرف قادری لکھتے ہیں آپؒ کا مزار پر انوار نہایت شاندار بنا ہوا ہے اور مرجع خلائق ہے سالانہ عرس پر بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔ اب یہ مزار محکمہ اوقاف کی تحویل میں آچکا ہے۔[۷۲]

مصنف "اولیا اللہ" اس ضمن میں بیان کرتے ہیں آپؒ کا مزار مرجع خلائق ہے اور سالانہ عرس پر بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔ آپ ایک بہت بڑے زمین دار بھی تھے۔ فیصل آباد ڈویژن میں بڑے زمینداروں میں شمار ہوتے ہیں۔[۷۳]

سجادہ نشین اوّل حضرت پیر سید فضل حسین شاہ قادریؒ کے وصال کے بعد آپؒ کی تدفین بھی حضرت قطب عالمؒ کے مغربی پہلو میں کی گئی۔ مزارات میں نہایت دل کش چولی پالکیاں تیار کروا کر رکھی گئیں۔ یہ روضہ مبارک تقریباً ۷۵ سال موجود رہا۔ دوسرے سجادہ نشین پیر سید اسرار حسین شاہؒ نے مسجد اور دربار کی تعمیر نو کے لیے نقشہ جات بنوائے مگر تعمیر سے پہلے ۱۹۹۹ میں وصال فرما گئے۔ آپؒ کو دادا حضرت سید قطب علی شاہؒ کے مشرقی پہلو میں دفن کیا گیا۔ تین مزارات کی بدولت اب دربار کی اندرونی جگہ تنگ ہو گئی تھی۔ حضرت سید قطب عالمؒ کے پڑپوتے اور تیسرے سجادہ نشین حضرت سید ابرار حسین شاہ قادری نے اپنے والد ماجد کی دیرینہ خواہش اور وقت کی ضرورت کے پیش نظر مسجد اور روضہ کی از سرِ نو تعمیر کی۔ نہایت خوبصورت وسیع و عریض اور عالیشان مسجد و روضہ تعمیر کیا گیا۔ دونوں عمارات کے درمیان ستر فٹ بلند مینار بنایا گیا۔ سنگِ مرمر اور چینی کے ٹائلوں سے ایک عظیم الشّان یادگار تعمیر کی گئی۔ جو اب بھی زائرین کے دل و نگاہ کو ٹھنڈک بخش رہا ہے۔

حوالہ جات

۱. احمد دہلوی، سید، فرہنگ آصفیہ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۲، ص:۱۴۷

۲. محمد اجمل خان مصطفائی، پیر علامہ، تصوف کا مکمل انسائیکلوپیڈیا، (جلد اوّل)، مکتہ، خیبر پختونخواہ، ۲۰۱۷، صفحہ:۳۳

۳. علی بن عثمان ہجویری، داتا گنج بخش، کشف المحجوب، قادری رضوی کتب خانہ، لاہور، دسمبر ۲۰۰۵، صفحہ:۸۸-۸۶

۴. نفیس اقبال، ڈاکٹر، اردو شاعری میں تصوف (میر، سودا اور درد کے عہد میں)، سنگِ میل، لاہور، ۲۰۰۷ صفحہ:۲۰

۵. غلام قادر لون، ڈاکٹر، مطالعہ تصوف (قرآن و سنت کی روشنی میں)، امن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ صفحہ:۵۹

۶. محمد فارق قادری، سید، فتوح الغیب! عبد القادر جیلانی، سید، فتوح الغیب، مترجم سید محمد فاروق قادری، المعارف، لاہور، سنہ ندارد، صفحہ:۱۳۱

۷. محمد طاہر حسین قادری، اداریہ مشمولہ آئینہ کرم شمارہ نمبر ۳۷، منگانی شریف، جھنگ، جون ۲۰۱۴ء صفحہ:۴

۸. محمد اسحاق مکدبازی، شیخ، التعرف لمزہب اہل التصوف، مطبوعہ المعارق، لاہور، سنہ ندارد، صفحہ:۴۳

۹. نفیس اقبال، ڈاکٹر، اردو شاعری میں تصوف (میر، سودا اور درد کے عہد میں) صفحہ:۲۹

۱۰. محمد طاہر حسین قادری، ''غوث الثقلین'' ورلڈ ویو پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۰، ص۳۵

۱۱. خلیق احمد نظامی، پروفیسر ن، تاریخ مشائخ چشت، ص۱۰۸

۱۲. داراشکوہ قادری، شہزادہ، سنفیتہ الاولیاء، ص۱۴-۱۵

۱۳. غلام سرور لاہوری، چشتی، ''خزینتہ الاصفیاء'' جلد اوّل ص۔۱۵۹

۱۴. محمد جمیل، خواجہ خواجگان، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص۱۵-

۱۵. فاروق القادری سید، احوال و آثار سید عبد القادر جیلانی، ص۹۲-۹۱

۱۶. محمد چاہر حسین قادری ''غوث الثقلین'' ص۱۸۸

۱۷. محمد طاہر حسین قادری، پیر، تاریخ ابن کرم، جلد دوم، ص۶۵۱

۱۸. عبد الحق محدث دہلوی، شیخ، اخبار الاخیار، ادبی دنیا نمبر ۵۱۰ مٹیا محل، دہلی نمبر ۶، سن ندارد، ص:۴۳۱

۱۹. سعد اللہ موسوی، سید، بحر السرائر؛ قلمی، مملوکہ کتابخانہ ابن کرم منگانی شریف جھنگ، ورق:۱۶۱

۲۰. علی اصغر گیلانی، سید، ''شجرۃ الانوار'' (قلمی) مملوکہ کتابخانہ ابنِ کرم، منگانی شریف، جھنگ ورق ۴۵

۲۱. موسیٰ پاک شہید، حضرت، تیسیر الشاغلین، بیکن بکس گل گشت ملتان، ۱۹۹۷ء، ص:۹۷

۲۲. غلام سرور لاہوری، مفتی، ''خزینۃ الاصفیاء'' مکتبہ نبویہ لاہور، ۲۰۱۰ء، ص:۱۹

۲۳. برخوردار ملتانی، مولانا، ''غوث اعظم'' کتب خانہ تجارتی، خضر ملتان، ۱۹۲۷ء، ص:۳۰۸

۲۴. محمد طاہر حسین قادری، پیر، ''تاریخ ابنِ کرم'' جلد اول، ص:۶۸۷

۲۵. عبد الحق محدث دہلوی، شیخ، '' اخبار الاخیار''، ص:۴۳۱

۲۶. غلام سرور لاہوری، مفتی، ''خزینۃ الاصفیاء'' مکتبہ نبویہ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص:۱۹۸

۲۷. مجتبیٰ گیلانی، سید، '' عین التصوف'' کتابخانہ ابنِ کرم، منگانی شریف، اشاعت اول، ۲۰۱۱ء، ص: ۲۴۵

۲۸. محمد طاہر حسین، پیر، ''تاریخ ابنِ کرم'' جلد دوم، ص:۷۸۸

۲۹. ایضاً، ص:۷۹۷

۳۰. طاہر رضا بخاری، ڈاکٹر، ''مجھے ہے حکمِ اذاں'' گیلانی ٹرسٹ، امیر آباد ملتان، ۲۰۱۰ء، ص:۵۷-۵۱

۳۱. محمد علی چراغ، '' انسائیکلوپیڈیا مسلم شخصیات'' نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۳۳۷

۳۲. محمد طاہر حسین قادری، پیر، ''تاریخ ابنِ کرم''، جلد دوم، ص: ۸۳۰

۳۳. مجتبیٰ گیلانی، سید، ''عین التصوف'' ص:

۳۴. محمد طاہر حسین قادری، ''آئینہ کرم'' شمارہ ۳۲، منگانی شریف جھنگ، ص:۴۸

۳۵. محمد طاہر حسین قادری، پیر، ''مآثر سلطانی'' کتاب خانہ ابنِ کرم، منگانی شریف جھنگ، ۲۰۲۲ء، ص: ۸۶

۳۶. ایضاً، ص:۹۶

۳۷. سید احمد خان، سر، رسالہ اسباب بغاوت ہند، ص:۳۵

۳۸. پیر محمد طاہر حسین قادری، تاریخ ابن کرم، جلد دوم، ص۹۶۵

۳۹. محمد طاہر حسین قادری، لمعات قطب، ص۱۰۸

۴۰. ایضاً، ص:۷۰

۴۱. حضرت سید قطب علی شاہ، دیوان قطبیہ، مرتبہ محمد طاہر حسین قادری، سلطان باہو پرنٹنگ پریس، جھنگ، ۲۰۰۴، ص۶۰

۴۲. پیر محمد طاہر حسین قادری، تاریخ ابن کرم، جلد دوم، ص۹۵۷

۴۳. علامہ شرف قادری، تذکرہ اکابر اہلسنت، ص۴۰۶

۴۴. یوسف طاہر، کلیات صالح محمد صفوری، ص۱۷۴

۴۵. علامہ ادریس بھوجیانی، ارباب طریقت، ص

۴۶. پیر محمد طاہر حسین قادری، لمعات قطب، ص۶۴

۴۷. پیر محمد طاہر حسین قادری، لمعات قطب، ص۶۵

۴۸. سید قطب علی شاہ، مراۃ الفقرا، ص۳

۴۹. ادریس بھوجیانی، ارباب طریقت، ص

۵۰. عالم فقری، اولیاء اللہ، ص

۵۱. انوار حسین جلو آنوی، پیر، ابتدائیہ دیوان قطبیہ، سلطان باہو پرنٹنگ پریس جھنگ، ۲۰۰۴، ص:۱۵

۵۲. پیر محمد طاہر حسین قادری، لمعات قطب، ص ۶۷

۵۳. پیر محمد طاہر حسین قادری، تاریخ ابن کرم، ص ۹۶۲

۵۴. عبدالحکیم شرف قادری، تذکرہ اکابر اہلسنت، ص

۵۵. محمد طاہر حسین قادری، لمعات قطب، ص ۷۰

۵۶. حضرت سید قطب علی شاہ، مراۃ الفقراہ، دین محمدی پریس بل روڈ، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۴، ۳

۵۷. علامہ

ادریس بھوجیانی، ارباب طریقت، ص

۵۸. محمد یوسف طاہر صفوری، صاحبزادہ، کلیات صالح محمد صفوریؒ، چنبہ ادبی اکیڈمی، فیصل آباد، ۲۰۱۱، ص: ۱۷۴

۵۹. پیر محمد طاہر حسین قادری، تاریخ ابن کرم جلد دوم، ص ۹۵۷

۶۰. علامہ عبدالحکیم شرف قادری، تذکرہ اکابر اہلسنت، ص ۴۰۶

۶۱. قطب علی شاہ قادری، سید، مراۃ الفقرا

۶۲. محمد طاہر حسین قادری، لمعات قطب، کتابخانہ ابن کرم، منگانی شریف جھنگ، طبع سوم ۲۰۱۹، ص ۶۳

۶۳. قطب علی شاہ قادری، سید، مراۃ الفقرا، ص

۶۴. عبدالحکیم شرف قادری، مولانا، تذکرہ اکابر اہلسنت، ص ۴۰۶

۶۵. شاکر کنڈان، تبصرہ (دیوانِ قطبیہ) مشمولہ عقیدت، سرگودھا، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۶، ص:۹۵

۶۶. سلطان محمد رمضان، دیباچہ مشمولہ مراۃ الفقرا، قطب علی شاہ، دین محمدی پریس بل روڈ، لاہور، ۱۹۷۴، ص:۱، حوالہ نمبر ۶۷

۶۷. ایضاً، ص:۲

۶۸. شیر محمد گیلانی، حضرت، مکتوبات عشق، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۴، ص:۲۵

۶۹. غلام محمد جلو آنوی، پیر، وصال نامہ، دین محمدی پریس، بل روڈ، لاہور، ۱۹۷۴، ص۵۶

۷۰. ایضاً، ص:۶۰

۷۱. ایضاً، ص:۶۴

۷۲. شرف قادری، علامہ، تذکرہ اکابر اہلسنت، ص:۴۰۶

۷۳. عالم فقری، اولیا اللہ، ص:۱۲۱

باب دوم

سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی سوانح نگاری کی روایت

الف۔ روایت و تعارف

i. اردو ادب میں سوانح نگاری کی روایت:

غیر افسانوی اصناف ادب میں سے خاکہ نگاری، روزنامچہ نگاری، سفر نامہ، رپورتاژ، خود نوشت، ملفوظات، مکتوب نگاری اور سوانح نگاری کا شمار سوانحی ادب میں ہوتا ہے۔ سوانحی ادب کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں، ۱۸۵۷ء کے بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اس کا آغاز ہوا۔ اردو میں یہ صنف انگریزی کے (Biographical Litrature) کے زیر اثر پروان چڑھی انسائیکلوپیڈیا بریٹانکا کے مطابق یہ ادبی اظہار کی سب سے پرانی شکل ہے۔ اس کے بنیادی عناصر فرد، تاریخ اور ادبیت ہیں لیکن ادبیت ہی سوانحی ادب کو تاریخ سے علاحدہ کرتی ہے۔ فنی اعتبار سے سوانح عمری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقیوم رقم طراز ہیں:

> ”فن سوانح نگاری کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے ۔۱۔ شخصیت کا انتخاب ۲۔ شخصیت کا ارتقاء3۔ واقعات کا انتخاب ۴ ۔ترتیب ۵۔ نتائج ۶۔ منصفانہ ۷۔ شخصی۸۔ اسٹائل“۔[1]

کسی فرد واحد کے مکمل یا جزوی حالات و واقعات کا خشک انداز میں جمع کرنا سوانحی ادب نہیں بلکہ کسی فرد کے ایک خاص زمانے یا پوری زندگی کے حقیقی حالات، سانحات اور واقعات کا ادبی انداز میں اپنے یا کسی اور کے ذریعے تحریری مواد سوانحی ادب کہلاتا ہے۔

سوانح نگاری کا فن:

"سوانح" جمع ہے سانحہ کی جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پیش ہونے والا، ظاہر ہونے والا واقعہ اور ماجرا کے ہیں۔ مختلف لغات میں سوانح کو حادثات، سانحے، واقعات، حالاتِ زندگی اور سرگزشت کے معنوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لفظ سوانح عمری کو سب سے پہلے ڈرائڈن نے ۱۶۸۳ میں اس طرح بیان کیا۔

"The History of particular men's lives"

"کسی خاص شخص کی زندگی کی تاریخ سوانح عمری ہے"۔(۲)

مختلف علمائے ادب نے سوانح نگاری کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانکا میں سوانح حیات کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"The new biography in consequence was after the record of the inner life, the relations of previously unsuspected aspects of character."(3)

بایو گرافی / سوانح عمری کی اس تعریف کے مطابق کسی فرد کے پیدا ہونے سے لے کر موت تک کے خارجی حالات اور اس کے اندرونی کوائف (جذبات و احساسات) کے احوال قلم بند کرنا سوانح نگاری کہلاتا ہے۔ اس طرح سوانح حیات سے مراد صرف پیدائش، خاندان، تعلیم، کارہائے زندگی اور وفات کا نام نہیں بل کہ یہ کسی فرد کی ظاہری و باطنی صفات، عادات و خصائل، معاشرتی و اخلاقی اطوار اور نفسیاتی کیفیات کا مکمل عکس دکھاتی ہے۔ سوانح نگار کے لیے وہ چھوٹی یا بڑی تمام باتیں اور واقعات اہمیت رکھتے ہیں جن سے شخصیت کی تصویر واضح طور پر ابھر کر سامنے آجائے۔

نکلسن نے سوانح عمری کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"سوانح حیات صاحب سوانح کی زندگی کی سچی دستاویز ہونا چاہیے۔ اس طرح وہ کہانیاں، اس سے خارج ہیں جو تاریخی صداقت کی حامل نہ ہوں اور جو شعوری طور پر فن کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر نہ لکھی گئی ہوں۔"(4)

سوانح نگاری کی مختلف تعریفوں کی روشنی میں سوانح عمری کے لیے اہم نکات درج ذیل ہوں گے۔ سوانح عمری کسی فرد کے مکمل تعارف اور آشنائی کا ذریعہ ہے۔ سوانح نگاری کے لیے ادبی آمیزش لازم ہے۔ تاریخ سے تعلق ہو اور اسی کی طرح سچائی و دیانت داری پر مبنی ہو۔ علاوہ سوانح حیات میں فنی قدروں کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔

ڈاکٹر مظہر مہدی فن سوانح نگاری کے خدوخال پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کے جملہ لوازمات واضح ہو جاتے ہیں۔ تحریر کرتے ہیں:

" سوانح نگاری ایک ایسی ادبی صنف ہے جس میں کسی فرد واحد (یا چند صورتوں میں افراد) کی داستانِ حیات بیان کرنے کے عمل میں نہ صرف زیرِ غور موضوع سے متعلق تمام دستیاب تحریری اور غیر تحریری مواد / حقائق کا استعمال کیا جاتا ہے بل کہ تخیلاتی اور تخلیقی قوت کو بھی فن کارانہ اور حقیقت پسندانہ طریقے سے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اس میں تخیلاتی اوت تخلیقی قوتوں کا استعمال ہی اس کو صنف ادب کے دائرے میں لے آتا ہے۔ موضوع اور مواد کی سطح پر جذبات اور احساسات میں اتنی گہرائی اور گیرائی ہونی چاہیے کہ اس سے اثر انگیزی میں اضافہ ہو سکے۔ دیانت داری اور انصاف پسندی اس کے لازمی اجزاء ہیں۔(5)

اردو میں سوانح نگاری کا آغاز و ارتقاء:

تاریخ انسانی جتنی قدیم ہے اتنی ہی پرانی روایت علم بشریات کی ہے۔ تمام الہامی کتب سماویہ میں مختلف انبیاء کے قصص بیان کیے گئے ہیں۔ جن سے پتا چلتا ہے کہ سوانحی عناصر مختلف شکلوں میں ابتداء سے ہی موجود تھے۔ اردو میں سوانح نگاری کی روایت سے پہلے مناسب ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں سوانحی آغاز و ارتقاء پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ اردو سوانح نگاری کون سی زبانوں کے اثرات لیے ہوئے ہے۔ مغرب اور مشرق کی سوانح

عمریوں کے معیار میں کافی حد تک امتیاز پایا جاتا ہے۔ مشرق کی سوانح عمریوں کا معیار مغرب کے درجے کا نہیں۔ البتہ چین مشرقی ممالک میں سوانح نگاری کے اعلیٰ نمونوں کا حامل ہے۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء میں آنسہ الطاف لکھتی ہیں:

"۔۔۔۔اہرامِ مصر کی اندرونی دیواروں پر جو عبارات کندہ ہیں وہی سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے کہے جاسکتے ہیں"(6)

اگرچہ سوانح عمری کے نمونے جو حجری سلوں، پتروں اور کتبوں کی صورت میں ملتے ہیں، انسانی فطرت کے قریب تر ہیں لیکن سوانح حیات لکھنے کا باقاعدہ رواج یہودیوں سے منسوب ہے۔ پلوٹارک نے تحقیقی انداز میں سوانح عمری کا نقش اول تیار کیا۔ اس ضمن میں نیر جہاں تحریر کرتی ہیں:

"سوانح عمری کی دنیا میں پلوٹارک کی اہمیت ایک راہنما کی ہے۔ اس کے بعد ایک ایسے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جب سوانح عمریاں بہت کثرت سے لکھی گئیں لیکن اس پر آسمانی کتابوں اور دیومالاؤں کا گہرا اثر صاف نظر آتا ہے یہی سبب ہے کہ اس دور میں زیادہ تر مذہبی راہنماءوں اور بزرگوں کے حالات کی زندگی سوانح کے سانچے میں ڈھلتے رہے یا پھر ان مشاہیر اور عظیم انسانوں کے حالات جن میں دیوتائوں کی تقدیس پائی جاتی ہے۔"(7)

انگریزی ادب میں سوانح نگاری کی روایت تین سو سال پرانی ہے مگر اس نے بے پناہ ترقی کی۔ یہاں تک کہ اس فن کے باقاعدہ اصول و ضوابط مقرر کئے گئے۔ انگریزی ادب میں مواد، موضوع اوار اسلوب پر علاحدہ علاحدہ بحثیں ملتی ہیں۔ مواد کے مستند ذرائع میں خود نوشت، روزنامچہ، مکتوبات، ہیرو کی تقاریر اور اقوال و افعال کی تحریریں، ذاتی ڈائری اور ذاتی معلومات شامل ہیں۔ انگریزی ادب سے ہی یہ صنف عربی اور فارسی میں در آئی۔ عربوں نے انگریزی سوانح نگاری کے اثرات قبول کرتے ہوئے اس فن پر خوب توجہ دی۔ اس کے علاوہ سیرت اور کتب حدیث نے بھی اس ضمن میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

"مسلمانوں میں سب سے زیادہ حدیث کی وجہ سے ترقی ہوئی کیوں کہ حدیث کے راویوں کے حالات زندگی کا جمع کرنا اور ان کی چھان بین کرنا حدیث کی صحت کے تعین کے لیے از بس ضروری تھا اس طرح علمائے حدیث نے ہزاروں نہیں بل کہ لاکھوں افراد کے سوانح جمع کیے اس سے اشخاص کی زندگی سے دلچسپی کی تحریک پیدا ہوئی۔[8]

مزید ڈاکٹر عبد القیوم لکھتے ہیں:

" عربوں کے بیان حقیقت نگاری کا تصور عام تھا وہ واقعات کا اظہار بر ملا کرتے تھے۔ چنانچہ رجال کی زندگی کی کی تلاش میں انہوں نے واقعیت پسندی کا ثبوت دیا اور علماء نے محاسن کے ساتھ ساتھ کمزوریوں کو بھی بیان کیا ہے۔۔۔۔بے لاگ تنقیدیں کی گئیں اور مشاہیر کے ظاہر و باطن دونوں کو اصلیت و واقعیت کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔"[9]

اسلام سے قبل ایران میں سوانح نگاری کے نقوش نہیں ملتے۔ ایران نے جہاں عقائد و نظریات اور معاشرتی زندگی کے لیے رنگ ڈھنگ میں اسلامی اثرات قبول کئے وہاں فارسی ادب میں سوانح نگاری بھی عربی ادب کے زیر اثر خوب پروان چڑھی۔ خاص طور پر شعیت کی تبلیغ کے لیے شیعہ حضرات نے سوانح نگاری کو اپنا ذریعہ بنایا۔

عہد صفوی میں اس رجحان کو زبردست طاقت ملی اور سوانح نگاری کے موضوع میں بھی وسعت پیدا ہو گئی۔ بقول ڈاکٹر محمد عمر رضا:

" عربی کی طرح فارسی مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ فقہی تصانیف کی زبان بنی رہی ہے ۔۔۔۔۔ محمد ابن طوسی کی "شوکتہ الطائفہ"، شیخ احمد کی "اسماء الرجال" حسن ابنِ یوسف کی "البضاح و اشتباہ" اور قصص العلماء کے علاوہ "کشف المحجوب" میں سوانحی مواد ملتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وزراء، اطباء اور شعرا کے تذکرے لکھے ہیں۔۔۔۔نور اللہ شوشیتر کی مجالس المومنین میں مشہور عرب ایرانی شیعوں کا ذکر ملتا ہے۔"[10]

اردو سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش ہمیں دکنی مثنویوں، مرثیوں اور تذکروں میں ملتے ہیں۔ دکنی ادب کے نمائندہ شعرا ملا وجہی، قلی قطب شاہ، نصرتی، غواصی اور ابنِ نشاطی کی مثنویوں میں منظوم سوانح نگاری کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ نصرتی نے اپنے والد علی عادل شاہ اور دیگر شخصیات کی سیرت و سوانح نہایت موثر انداز میں بیان کی ہے۔ اس دور کی تخلیقات درباروں اور مذہب کے زیر اثر لکھی گئیں۔

اردو کی پہلی سوانحی تصنیف کے بارے نقاد شکوک و شبہات کا شکار نظر آتے ہیں اور حتمی طور پر کسی بھی تصنیف کو اردو کی پہلی سوانح حیات نہیں کہہ سکتے اس بارے احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "یہ بالکل صحیح نہیں بتایا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلی کتاب جسے سوانح عمری کہہ سکیں کب اور کہاں لکھی گئی۔ "مجموعہ قصص" کے نام سے کتب خانہ انڈیا آفس میں ایک کتاب ہے جس میں نیم تاریخی واقعات افراد کو مرکز بنا کر لکھے گئے ہیں لیکن جیسا کہ خود اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے ،لکھنے والے کے پیشِ نظر "قصہ پن تھا" سیرت وغیرہ نہ تھی۔ اگر فضلی کی "دہ مجلس" کو امام حسین کی سوانح عمری مان لیں تو پھر ایک کتاب ۱۷۳۲ء کے قریب بھی اس میں مل جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ "روضۃ الشہداء" میں جس سے یہ کتاب ماخوذ ہے۔ امام حسین کی سیرت کے زیادہ واقعات کربلا کو مجموعی حیثیت سے پیش نظر رکھا گیا ہے پھر حیدر بخش حیدری نے ۱۸۱۲ء میں اس کتاب کا خلاصہ "گل مغفرت" کے نام سے شائع کیا۔"(11)

اردو شعراء کے تذکروں میں سوانح نگاری کے نقوش موجود ہیں اگرچہ یہ سوانح نگاری کے اعلیٰ نمونے نہیں ہیں تاہم سوانحی حوالے سے ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعراء" مصطفی خان شیفتہ کا "گلشنِ بے خار" کریم الدین کا "طبقات الشعراء اور ماسٹر رام چندر کا "تذکرۃ الکاملین" ابتدا میں سوانحی مواد موجود ہے لیکن محمد حسین آزاد کے "آبِ حیات" ۱۸۸۰ء کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ ادبی تحقیق کی بنیاد ڈالی۔ بلاشبہ آبِ حیات سوانح نگاری کے مقصد سے نہیں لکھی گئی لیکن اس میں فن سوانح نگاری کی صفات اتنی نمایاں ہیں کہ ہم اسے قدیم و جدید سوانحی طرز نگارش کی درمیانی کڑی تصور کرسکتے ہیں۔

جدید اردو نثر کے حوالے سے سر سید احمد خاں کا کردار امتیازی نوعیت کا ہے۔ کتاب "آثار الصنادید" ہو یا "سیر تِ فرید یہ" ان میں سوانحی نقوش کسی نہ کسی طور دیکھے جاسکتے ہیں۔ آثار الصنادید کے چوتھے باب میں سر سید احمد خاں نے دہلی کے مشاہیر اور اپنے مشہور ہم عصروں کے سوانحی خاکے شامل کئے ہیں۔

اسی دور میں آغا حسن رضوی تصنیف احسن التواریخ (۱۸۶۴ء) تاریخ کی بجائے راجا دگ وجئے سنگھ کی تفصیلی سوانح عمری ہے۔ ۱۸۷۱ء میں منشی مشتاق حسین (وقار الملک) نے انقلاب فرانس اور نپولین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ سر گزشت نپولین بوناپارٹ کے نام سے کیا۔ عنایت حسین نے اذانامۂ مسعود کے نام سے سر سالار مسعود غازی کی سوانح عمری لکھی۔ اگرچہ یہ تمام تصانیف باقاعدہ سوانح نگاری کے معیار پر پوری نہ بھی اترتی ہوں تو بھی ان سے اردو سوانح نگاری کی روایت مستحکم ہوتی ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کو اردو سوانح نگاری کا عہدِ زریں کہا جاسکتا ہے۔ حالی اور شبلی اس دور کے نمائندہ سوانح نگار ہیں انہوں نے اردو سوانح نگاری کو مغربی اصولوں پر استوار کیا اور صنف کو ادبی اصناف میں شامل ہونے کا معیار عطا کیا۔ بقول ڈاکٹر ممتاز فاخرہ:

> "یوں تو محمد حسین آزاد آب حیات میں سیرت نگاری کی طرف ایک قدم بڑھا چکے تھے لیکن مغربی ادب کے اثرات کی بنا پر پہلی بار اردو کے دو عظیم فنکار، حالی و شبلی نے اس صنف کا معیار بلند کیا۔"(12)

حالی نے سوانح کا تاریخی اور یادگاری دائرہ توڑ کر اسے ایک نئی وسعت سے روشناس کروایا۔ انہوں نے "حیاتِ سعدی" کے مقدمہ میں سوانح نگاری کے اصولوں پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ علاوہ ان کی حیات جاوید اور یادگار غالب بھی اردو ادب اور سوانح میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

شبلی بھی اس دور کے عظیم سوانح نگار ہیں۔ جنہوں نے سب سے پہلے مشاہیر اسلام پر قلم اٹھایا۔ انہوں نے سیرتِ نبی ﷺ، المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی اور سوانح مولانا روم جیسی کامیاب اور مفید سوانحی تصانیف

تحریر کر کے سوانح نگاری کو جدید اسلوب اور فنکارانہ رنگ عطا کیا۔ اگرچہ ان سوانح عمریوں کا مقصد مسلمانوں کو احساس کمتری سے نکالنا اور اپنے اسلاف کی یاد تازہ کرنا تھی۔ شبلی کے نظریے کے زیرِ اثر بے شمار سوانح عمریاں لکھی گئیں اور اس روایت میں ایک دبستان شبلی بنتا گیا۔ جس کے اہم پیروکار سید مصباح الدین، محمد نعیم صدیقی ندوی، عبد الرحمن اور شاہ معین الدین ندوی ہیں۔ اس دبستان کے مصنفین نے حقیقی طرز تحریر کو سوانح نگاری کا حصہ بنایا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حسن وقار گل رقم طراز ہیں۔

> "اکثر شخصیات پر روایت کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ مستند ماخذات دریافت نہیں ہوئے تھے۔ دبستان شبلی کے لکھنے والوں نے ان کی بازیافت کی سعی میں مشقت برداشت کی اور یہ راہ سمجھائی کہ حقائق تک پہنچے بغیر سوانح اور شخصیت نگاری کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔"(13)

اس روایت کو آگے بڑھانے میں عبد الرزاق کانپوری، شیخ محمد اکرام اور مولانا غلام رسول مہر نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

حالی و شبلی کے بعد تقسیم ہند تک اردو میں بے شمار سوانح عمریاں لکھی گئیں لیکن سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد السلام کے بطور خاص اہم ہیں۔ سلیمان ندوی نے "رحمت عالم"، "سیرت عائشہ" "حیات امام مالک اور حیات شبلی جیسی سوانحی تصانیف سے اردو زبان و ادب کو ایک وقیع سرمایہ مہیا کیا۔ مولانا عبد السلام ندوی نے "سیر عمر بن عبد العزیز" فقرائے اسلام اور اقبال کامل لکھ کر اپنے سوانحی تشخص کو قائم کیا۔ اسی طرح رئیس احمد جعفری نے تین سوانح عمریاں لکھیں جن میں سیرت محمد علی جناح قابلِ ذکر ہے۔

آزادی کے بعد سوانح نگاری اسی پس منظر میں برابر ارتقا پذیر رہی۔ آزادی کے بعد صنف نے باوجود کثرت مسائل کے ترقی کر چکی ہے۔ سوانح حیات کے علاوہ خود نوشت سوانح عمریوں کے وقیع و وسیع سرمایہ نے اردو زبان و ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ تقسیم ہند کے بعد دونوں طرف فن سوانح نگاری کے اصول اور تحقیقی معیارات بڑی حد تک واضح ہو گئے ہیں۔ ادب میں جدید سوانح نگاری کے امکان روشن نظر آتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد جن سوانح نگاروں نے قابل قدر کام کیا۔ طوالت کے اندیشہ کے پیش نظر ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کی سوانح عمری "غالب" ان کی تحقیقی کاوش کی آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "سیرت سید احمد شہید" بھی لکھی۔ "حیات اجمل" اور آثار ابوالکلام آزاد قاضی عبد الغفار کی یادگار ہیں۔ صالحہ عابد حسین کی یادگارِ حالی، تبسم نظامی کی "اکبر آبادی" عبد الماجد دریا آبادی کی "حکیم الامت نقوش تاثرات، ہنس راج رہبر کی "پریم چند" عبد المجید سالک کی "ذکر اقبال" جگن ناتھ آزاد کی "محمد اقبال" ابو سعید قریشی کی "منٹو" مظفر حنفی کی "شاد عارفی شخصیت اور فن" شاہ معین الدین ندوی کی "حیات سلیمان" احمد لاری کی "حسرت موہانی حیات اور کارنامے" نعیم صدیقی کی "محسن انسانیت" شفیع عقیل کی "مجید لاہوری" محمد ایوب قادری کی "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" وغیرہ اہم اور مشہور سوانح عمریوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔

ii. سلسلہ قطبیہ میں سوانح نگاری کی روایت:

اردو نثر کی ابتداء صوفی رسائل سے تسلیم شدہ ہے۔ سوانح نگاری کے ابتدائی خدوخال بھی صوفیا کی منظوم اور نثری تصانیف میں موجود ہیں۔ سوانحی مواد کے حوالے سے ملفوظات اور مکتوبات بطور خاص اہم ہیں۔ اگرچہ یہ مکمل سوانح پیش نہیں کرتے لیکن سوانح کی عمارت تعمیر کرتے وقت انہیں نظر انداز بھی نہیں کیا جاستا۔ سلسلہ قطبیہ میں سوانح نگاری کا آغاز بانی سلسلہ حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ سے ہوتا ہے۔ آپ نے باقاعدہ کوئی سوانح عمری تحریر نہیں کی ۔ تاہم آپ کے منظوم کلام اور دیگر تصانیف میں ایسا سوانحی مواد موجود ہے جس نے سلسلہ قطبیہ کی مضبوط سوانح نگاری کی روایت کو پروان چڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ آپ کی تصانیف میں سوانحی مواد کے واضح نقوش دیکھے جاسکتے ہیں اپنے منظوم کلام میں فرماتے ہیں:

؎ دین من روشن بنورِ شاہ چراغ

ہم دو عالم روشن اس جمال اوست[14]

اپنی کتاب "مراۃ الفقراء" میں انہوں نے مختلف بزرگوں کے احوال، اوصاف اور سوانحی خدوخال پیش کئے ہیں۔ اپنے مرشد سید چراغ علی قادریؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"آپ اہلِ حال، صاحبِ کمال، طبع حلیم اور خلقِ عظیم تھے۔ معرفت کی داستان میں شمس العرفان تھے۔۔۔۔ آپ کی شادی کے تین سال بعد مستور فوت ہو گئی۔ دوبارہ شادی کے واسطے بہت لوگوں نے عرض و نیاز پیش کی مگر آپ نے منظور نہ فرمایا۔"(15)

اردو سوانح نگاری میں حالی اور شبلی سے پہلے صوفیاء کے ملفوظات، سوانحی مثنویوں، چند تراجم اور شعرا کے تذکروں کے علاوہ اردو سوانح نگاری میں کچھ نہ تھا۔ دکنی دور کی مثنویاں سوانحی عناصر کے حوالے سے خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ سلسلہ قطبیہ میں حضرت قطب علی شاہ قادریؒ کے خلیفہ حضرت شیر محمد گیلانیؒ پنجابی کے نامور شاعر گزرے ہیں۔ پنجابی کلام "مکتوباتِ عشق" اور اردو میں ان کے ملفوظات "مرآۃ العاشقین" کے نام سے مشہور و مقبول عام ہیں۔ ان کے کلام میں سوانحی عناصر موجود ہیں۔ اپنے مرشد طریقت کا نام، اپنی بیعت کا سن اور مرشد کے مسکن کا تذکرہ کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

دہویں صفر تے تیرہ سو آٹھ، ہجری ہو یارب دا فضل کمال بیلی

ڈٹھا پیر میں پیر محل والا قطب علی ولی ابدال بیلی

ایہنویں وہندیاں سار فرار ہوئے دکھ درد تے کل جنجال بیلی

اگے رلدیاں نوں کئی سال گزرے، مٹ گئے تمام وبال بیلی(16)

پیر غلام محمد جلو آنوی خلیفہ حضرت شیر محمد گیلانیؒ فتح پوری ایک عالم اور باکمال مصنف تھے۔ آپ نے تحقیق العارفین کے علاوہ کئی کتب کے تراجم کئے۔ اسرار المقطعات، مکتوبات امام جلوی اور وصال نامہ تصوف اور اردو نثر کے حوالے سے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کی اکثر و بیشتر تصانیف میں سوانحی واقعات ایک سوانح نگار کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سوانح نگاری کے نقوش بہت واضح ہیں۔ پیر غلام محمد جلو آنویؒ شیریزدانی کے بارے بیان کرتے ہیں۔۔

"ایک روز حضور گھر سے تشریف لائے تو درویشوں نے عرض کی یہاں کچھ غریب لوگ آئے تھے مگر اب وہ چلے گئے ہیں۔ حضور نے فرمایا دوڑو اور انہیں ڈھونڈ کر لے آؤ۔ جب درویش انہیں ڈھونڈ کر لے آئے تو آپ نے فرمایا ان کو روٹی کھلاؤ۔"(17)

سلسلہ قطبیہ کے ان بزرگان کی فہرست طویل ہے۔ جن کی شعری اور نثری تصانیف میں سوانحی نقوش توانا ہیں۔ ان میں سے چند ایک اہم جن کے کردار کو سوانح نگاری کی روایت کے حوالے سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں میاں اللہ یار کملانہؒ، جن کا رسالہ الہامات الہیہ اور خطوط کا مجموعہ خود نوشت سوانحی مواد کا عمدہ حوالہ ہے۔ میاں محمد فاضل سہو کی پنجابی ابیات اور کافیوں پر مشتمل کتاب اسرار الٰہی، سید سخی محمد شاہ کی تذکرۃ الاصفیاء، سید عبداللہ شاہ کے فرزند سید محمد ظفر شاہ کی کتاب قلب سلیم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ علاوہ ازیں پیر سید اشرف شاہ، حافظ عاشق حسین انصاری، میاں محمد علی سیال، پیر حسین شاہ، مولانا نور محمد قادری، سید شاہ محمد گیلانی، میاں عطا محمد و دیگر نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

سید سردار علی شاہ قادریؒ ایک قادرالکلام، پر گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ تحفۂ عرفانی، راز عشق، ڈھولا سید سردا علی شاہ، القول المعقول اور شہباز قادری ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ کتاب تحفۂ عرفانی میں موجود سوانحی مواد اس سلسلہ کے سوانح نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے بیان کردہ واقعات شخصیت کے نفسیاتی پہلوئوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

جدید سوانح نگاری میں کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ تحفۂ عرفانی سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ایک دن میرے پیشوا حضور فتحپوری سرکار نے مجھے فرمایا "سردار شاہ! تجھ پر فلاں فلاں شخص بہت حسد رکھتے ہیں۔ اس کا جواب دو، میں خوف سے رونے لگا اور ایک مثال دے کر عرض کیا ، حضور ایک شخص کی دو بیویاں تھیں۔ ایک عورت کے دو لڑکے بالغ تھے اور دوسری کا صرف ایک لڑکا تھا وہ ابھی شیر خوار تھا۔ جو عورت دو جوان لڑکوں کی ماں تھی۔ اس کے پاس ایک بیگانی عورت آکر پوچھنے لگی کہ تیرا کوئی لڑکا ہے تو اس نے کہا تیری جوتیوں کا صدقہ دو عاجز (ٹیڑو) ہیں پھر اس نے پوچھا تیری سوکن کا کوئی لڑکا ہے ؟ تو کہنے لگی ہاں، بڑا موٹا تازہ (چگھا-بگھا) اٹھا کر پھرتی ہے

۔میری یہ مثال سن کر حضور فتح پوری ہنسنے لگے اور فرمایا۔ تیری اس مثال کا مطلب ہے کہ میرے پیر بھائیوں کے پاس دوہرے، دوہرے (ڈبل) فیض ہیں مگر انہیں ہیچ سمجھتے ہیں۔ تیرے پاس یگانی چیز جو کچھ ہے وہ میں جانتا ہوں۔ اس کو بڑا فخر (چگھا، بگھا) کہتے ہیں اور حسد میں سڑ، سڑ کر مرتے ہیں، میں نے عرض کی بجا ہے۔"[18]

"گوہر قادری" المعروف نذرانہ اصغر سلسلہ قطبیہ قادریہ میں باقاعدہ سوانح عمری کی غرض سے لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ جس کے مصنف سید غلام اصغر شاہ ہیں۔ یہ ۳ ذیقعد ۱۳۸۹ھ کو طبع ہوئی۔ یہ حضرت سید سردار علی شاہ دہڑویؒ کے احوال پر لکھی گئی ہے گو کہ یہ کتاب ایک مکمل سوانح کا احاطہ نہیں کرتی مگر علمی و فکری اعتبار سے یہ اس سلسلہ کی سوانح نگاری کی روایت میں ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے نہایت سادہ اور سلیس انداز میں حالات و واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ انہوں نے مختلف واقعات سے صاحبِ سوانح کے کردار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح وہ معمولی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے صاحب سوانح کے مختلف اوصاف جن کا تعلق باطن اور نفسیات سے ہے کو پیش کرتے ہیں۔ حضرت کے باطنی احوال، اخلاص اور عجز انکسار کو بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ قلم بند کرتے ہیں۔

"جس نالی کے ذریعے اس باغ کو پانی آرہا ہے۔ اس میں ایک اونٹ مرا پڑا ہے اور یہ بدبو اسی کی ہے۔ حضور قطب پاکؒ نے فرمایا کہ اسے جلدی نکال کر نالی کو صاف کرو۔ چونکہ اونٹ کافی دنوں کا مرا ہوا تھا اور بالکل گل چکا تھا جس کی وجہ سے بدبو اتنی تیز تھی کہ اسے نکالنا تو درکنار اس کے پاس کھڑا ہونا بھی مشکل تھا۔ وہ درویش جو حسب حکم جناب قطب پاک اونٹ نکالنے آئے تھے ۔حوصلہ ہار گئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کسی چوہڑے کو تلاش کیا جائے۔ جو اس اونٹ کو نکالے کیونکہ ہمارے بس کا روگ نہیں۔ ان درویشوں میں حضور دہڑویؒ بھی کھڑے تھے ان کی باتیں سن کر حضور نے فرمایا کہ بھئی میں پہلے چوہڑا ہی تھا اور چند دن ہوئے کہ میں آپ کے مذہب میں شامل ہوا ہوں۔ اس لیے اب تک میری بو مری ہوئی ہے آپ فکر نہ کریں میں اسے نکال دیتا ہوں۔"[19]

حضرت پیر محمد کرم حسین قادریؒ اولوالعزم صوفی، پنجابی، فارسی اور اردو کے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ انہوں نے مختلف متصوفانہ موضوعات کو عام فہم پیرائے میں بیان کیا۔ معمولات اور ذکر و اوراد پر ایک لاجواب تصنیف "تنویر الابرار" ہے جس میں بہت سے مقامات پر سوانح نگاری کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ آپ نے بے شمار مواقع پر سوانحی مرقعے پیش کئے ہیں۔ آپ کے ہاں سچائی اور صداقت کا اظہار بہت نمایاں ہے جو سوانح کے لیے اہم ہے کیونکہ اچھی سوانح عمری تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتی ہے۔ آپ نے نہ صرف خود تحریر و تقریر سے رشتہ قائم کیا بلکہ آنے والوں کے لیے راستہ متعین کر دیا۔ آپ تنویر الابرار ہیں اپنے مرشد کے لباس، سراپا اور اعمال کو بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

> "آپ کا لباس شریعت کا نمونہ تھا۔ آپ کا تہبند مبارک کبھی ٹخنوں سے نیچے نہ ہوتا، سر مبارک پر زیادہ تر کلاہ دستار مزین فرماتے، عموماً سفید لباس پہنتے، گلے میں ایک چوکور رومال شانوں پر لٹکا رہتا اگر بوقت استراحت یا بوقت قیلولہ کلاہ مبارک اتارتے تو سر مبارک پر وہ رومال لپیٹ لیتے، ہر دفعہ نہانے کے بعد خوشبو دار روغن لگانا، سرمہ استعمال کرنا آپ کا معمول تھا۔"(20)

آپؒ کی تصنیف "حلیہ مبارک" سوانحی اعتبار سے اہم ہے۔ اس میں آپ نے نبی کریمؐ کے شمائل کا خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ اپنے اسلوب اور جاذب دل تحریر کی بدولت محض سوانحی خاکہ نہیں بلکہ قاری کے دل میں شخصیت سے محبت اور عقیدت کے جذبات ابھارنے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف سرکار دو عالم ﷺ کے اوصاف قلب و نظر میں ابھرتے ہیں بلکہ ان کی زیارت کی تمنا بھی پیدا ہوتی ہے۔

> "رسول اللہ کا رنگ مبارک چمکتا ہوا تھا۔ آپ کی پتلی نہایت سیاہ تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے، مژگانیں آپ کی دراز تھیں۔ دونوں ابروؤں کے درمیان قدرے کشادگی تھی۔ ابرو خمدار تھے۔ بینی مبارک بلند تھی۔ دندان مبارک میں کچھ ریخیں تھیں (یعنی بالکل اوپر تلے چڑھے ہوئے نہ تھے)۔ چہرہ مبارک گول تھا جیسا چاند کا ٹکڑا۔ ریش مبارک گنجان تھی کہ سینہ مبارک بھر دیتی تھی۔ شکم اور سینہ ہموار تھا۔ دونوں شانیں کلاں تھے۔"(21)

سلسلہ قطبیہ کی سوانح نگاری کی روایت کا باقاعدہ آغاز سید عبد القادر کی کتاب "سوانح حیات حضرت سید محمد نواز قادری" سے ہوتا ہے۔ ان کی تحریر کردہ ۱۴۹ صفحات پر مشتمل سوانح عمری ۱۹۹۸ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ مصنف نے شخصیت کی پیدائش، تعلیم و تربیت اور اوصاف پر جامع تفصیل فراہم کی ہے۔ اس سوانح عمری نے سلسلہ کی سوانحی روایت میں ایک راستہ متعین کیا اور سوانح نگاری کی راہیں ہموار کیں۔

سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگاروں میں پیر محمد طاہر حسین قادری ایسے سوانح نگار ہیں جنہوں نے سوانح نگاری کے فن کو پھر سے زندہ کیا انہوں نے لمعات قطب، لمحات کرم، حافظ الکرم، تذکرہ شاہ سردار، مآثر سلطانی اور تذکارِ شیریزدانی جیسی سوانح عمریاں تحریر کر کے حالی اور شبلی کے دور کی یاد تازہ کر دی ہے۔ انہوں نے سوانح عمری لکھتے ہوئے سوانح نگاری کے اصولوں کو نگاہ میں رکھا ہے کیوں کہ ان کے سوانح نگاری میں ان کی منتخب شخصیت مافوق الفطرت نظر نہیں آتی بلکہ وہ ہمیں ایک عام بشر محسوس ہوتا ہے جو اخلاق و کردار کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے جو ایک ہیرو کی مانند ہے اور قابل تقلید کردار ہے۔ وہ اسے کوئی غیر مرئی کردار نہیں بنا دیتے۔ وہ جدید سوانح نگاری کے اصول اپناتے ہوئے شخصیت کے مکمل احوال پیش کرتے ہیں۔ ان کی منتخب شدہ شخصیت اگرچہ بزرگان دین ہیں مگر انہوں نے اپنی تحریر کو محض کرامات اور بے جا تعریف کا ملفوبہ نہیں بنایا بلکہ ان کی حقیقی تعلیمات اور خدمات کو اجاگر کیا جس سے قاری کے لیے ایک محرک کردار ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ لمعات قطب سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "پیر مبارک علی شاہ بغدادی بیان کرتے ہیں۔" ایک مرتبہ حضرت قطب عالمؒ مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے گڑھ بغداد تشریف لائے۔ میں نے خیال کیا آج حضور سفر کی نہایت تھکاوٹ کی وجہ سے رات کو سو نفل نہیں پڑھ سکیں گے۔ میں رات کو بیدار ہو کر آپ کے پاس حاضر ہوا تو حضور حسب معمول مصلیٰ پر کھڑے مشغول نوافل تھے۔"[22]

پیر محمد طاہر حسین قادری کے عہد کو سلسلہ قطبیہ کی سوانح نگاری کا عہدِ زریں کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف خود سوانح نگاری کو فروغ دیا بل کہ اپنے رفقاء میں بھی سوانح نگاری کی تحریک پیدا کر دی۔ انہی سے متاثر ہو کر ملک رب نواز نے تجلیاتِ کرم اور لالہ محمد رفیق نے کمال کرم سوانح عمریاں لکھ کر سوانحی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

"فیوضِ یار" جو کہ میاں اللہ یار کی سوانح حیات ہے اس کے مصنف میاں فیاض النصیر طاہر ہیں یہ سوانح عمری ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ اگرچہ یہ کتاب سوانح نگاری کے فنی تقاضوں پر پورا نہیں اترتی کیوں کہ مصنف نے شخصیت سے زیادہ مسائل تصوف اور مذہبی عوامل پر زور دیا ہے۔ تاہم انہوں نے سلسلہ قطبیہ قادریہ کی سوانح نگاری کی روایت میں اضافہ کیا ہے جو روایت کے زندہ رہنے کے لیے اہم کڑی ثابت ہو گا۔

iii. سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگار (تعارف):

ا۔ پیر محمد طاہر حسین قادری:

آپ کی ولادت اپنے وقت کی نابغۂ روزگار ہستی حضرت سائیں پیر محمد کرم حسین قادریؒ کے ہاں ہوئی۔ آپ کی تاریخ ولادت ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۹۷۶ء ہے۔[23] آپ نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ سکول دربار منگانی شریف سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول چک نمبر ۱۷۰ سے امتیازی حیثیت سے پاس کیا ۔ آپ کی روحانی، مذہبی تعلیم و تربیت آپ کے پدرو مرشد نے فرمائی۔ آپ علم و عرفان، صداق، عبادت و ریاضت، تقویٰ، تفویض اور تصرف و طریقت میں راسخ القدم ہیں۔ پنجابی، اردو، فارسی اور عربی شعر و ادب سے خاص لگاؤ ہے۔ مطالعہ کے رسیا ہیں۔ کتابخانہ ابنِ کرم، جس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جو کم و بیش ۲۰ ہزار کتب پر مشتمل ہے۔

آپ نہایت سادہ، نفیس، جاذب اور مقناطیسی شخصیت کے حامل ہیں۔ آپ اوصافِ حمیدہ اور اخلاق کریمانہ میں یکتۂ روزگار ہیں۔ آپ کی شخصیت ہمہ جہات اور متحرک ہے۔ از حد مصروفیت کے باوجود علمی و ادبی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ آپ ایک محقق، مؤرخ، سوانح نگار، مکتوب نگار، تذکرہ نگار، سفر نامہ نگار اور عمدہ شاعر بھی ہیں۔ محمد یوسف طاہر صفوری لکھتے ہیں۔

> " پیر طاہر حسین کے ہاں ایک ذہنی تحریک موجود ہے جو انہیں زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہے جو ہر لحظہ کسی نہ کسی علمی منصوبہ کی تجویز یا تکمیل میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کی دل آویز شخصیت کی جملہ خصوصیات ان کی تحریروں میں بھی منعکس ہوتی ہیں۔ میری دانست میں ان

کے انداز بیاں اور سلوب تحریر میں جامعیت، جدت، ندرت، سادگی اور پرکاری کے عناصر بہ نمایاں ہیں جس سے ان کی نثر اور نظم دونوں میں دلکشی اور شگفتگی محسوس ہوتی ہے۔ قاری ان کے سحر میں کھو جاتا ہے اور جب تک پوری کتاب نہ پڑھ لے اس کو چین نہیں آتا۔"[24]

پیر محمد طاہر حسین قادری کا نام پاکستان میں سلسلہ قادریہ کی علمی خدمات کے حوالے سے ایک سند کا درجہ رکھتا ہے۔ حال ہی میں ان کی کتاب "تاریخ ابنِ کرم" چھپ کر تحقیق و تاریخ میں اپنا مقام متعین کر چکی ہے۔ آپ کی نثری خدمات کثیر الجہات ہیں مگر سوانحی ادب پر آپ کی خدمات کی فہرست کافی طویل ہے۔ سوانح نگاری کی حیثیت سے آپ کی مطبوعہ کتب ہیں۔ لمعاتِ قطب، لمحاتِ کرم، حافظ الکرم، غوث الاعظمؒ، تذکرہ شاہ سردار اور غیر مطبوعہ کتب میں تذکار شیر یزدانی، مآثر سلطانی شامل ہیں۔ سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگاری کو جس شخصیت نے اپنی خدمات سے مالا مال کیا وہ پیر محمد طاہر حسین قادری ہیں۔ ان کی خدمات لازوال ہیں۔ وہ اپنے عہد کی ایک رجحان ساز ہستی ہیں۔

پیر محمد طاہر حسین قادری نہ صرف سلسلہ قادریہ بلکہ دورِ حاضر کے خانقاہی نظام میں ایک توانا آواز بن کر ابھرے ہیں۔ ان کی تصانیف تخلیقی و تحقیقی اسلوب کی بدولت، انفرادیت کی حامل ہیں۔ آپ کا قلم تحقیق کے راستوں پر رواں دواں ہے۔ مستقبل قریب میں امید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ نسلوں کے لیے تحقیق کے مزید نئے سانچے سامنے آئیں گے۔

۲۔ ملک رب نواز قادری:

چکوال کے ایک معزز اعوان گھرانے میں ایک بچہ ۵ جنوری ۱۹۵۵ء کو پیدا ہوا۔ جس کا نام رب نواز رکھا گیا۔ آپ کے والد گرامی کا نام ملک پائندہ خان ہے۔ ابتدائی مذہبی اور پرائمری سکول کی تعلیم چک نمبر ۱۴ لوکڑی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا سے حاصل کی۔ بعد ازاں اپنے آبائی شہر چکوال کے گورنمنٹ ہائی سکول سے ۱۹۷۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے گورنمنٹ کالج چکوال سے مکمل کیا۔ فرسٹ ائیر میں ہی مرد خلیق حضرت سائیں پیر

محمد کرم حسین قادری کے دست حق پرست پر بیعت اختیار کی اور رب نواز سے ملک ربنواز قادری بن گئے۔ ۱۹۸۰ء میں پاکستان ائیر لائنز (PIA) میں ملازمت اختیار کی۔[25]

۱۹۸۵ء میں قسمت نے یاوری کی اور اپنے شیخ طریقت کی معیت میں عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی اور اپنے علمی و ادبی سفر کا آغاز بھی ''سفر نامہ حجاز'' لکھ کر کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنے مرشد کریم حضرت پیر محمد کرم حسین قادری کے احوال و آثار کو جامع سوانحی کتاب ''تجلیاتِ کرم'' کی صورت میں تحریر کیا جو کہ ۲۰۱۸ء میں المسطر پبلشرز اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ سادگی و سلاست، روانی اور جذباتی بہاؤ ان کی نثر کے نمایاں اوصاف ہیں۔

۳۔ خواجہ محمد قمر الدین قادری:

سلسلہ قطبیہ کے نمائندہ سوانح نگاروں میں خواجہ قمر الدین قادری کا شمار ہوتا ہے۔ آپ خانقاہ سراجیہ ماہنی شریف (جھنگ) کے مؤسس اعلیٰ اور سلسلہ قادریہ کے عظیم پیشوا حضرت خواجہ محمد سراج الدین قاری کے فرزند اور جانشین اول تھے۔ آپ کی ولادت دسمبر ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔[26] خانقاہی ماحول میں پرورش اور خواجہ محمد سراج الدین قادریؒ کی توجہ خاص کی بدولت بچپن سے ہی طبیعت میں علم کی لگن اور ذوق عبادت و ریاضت موجود تھا۔ آپ کی ذات میں عجز و انکسار، تسلیم و رضا، صبر و شکر، فقر و عشق اور جود و سخا جیسے صوفیانہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ آپ کے بارے خواجہ محمد یار فریدیؒ لکھتے ہیں۔

> '' یہ درد و سوز اور عجز ان کا ہی اعجاز ہے کیوں کہ وہ خود اس زیور سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ شریعت کی پابندی، دنیاداری سے بے نیازی، شبانہ روز عبادت و ریاضت آپؒ کا طرۂ امتیاز تھا''۔[27]

سوانح نگاری میں آپ کی کتاب '' سراج منیر'' یادگار ہے۔ آپ نے اپنے والد گرامی کی سوانح اور ملفوظات کو بڑے سادہ اور عام فہم پیرائے میں تحریر کیا ہے تاکہ عام لوگ بھی آسانی سے سمجھ سکیں۔ آپ کی نثر سلیس، رواں اور پر کشش ہے۔ آپؒ رسول اللہ ﷺ سے والہانہ عشق و محبت رکھتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک نماز تہجد قضا نہ

کی۔ ۲۱ جنوری ۲۰۱۴ء مطابق ۱۹ ربیع الاول بروز منگل بوقت تہجد مدینہ شریف رسول اللہ ﷺ کے قدمین شریفین کی جانب صفہ سے چند قدم آگے حالت سجدہ میں واصل حق ہوئے۔

ب۔ فکری جائزہ

i. سلسلہ قطبیہ کی سوانح عمریوں کا متصوفانہ پہلو:

تصوف کج روی اور شریعت سے انحراف کا نام نہیں بل کہ یہ پاکیزگی اور طہارت کی وہ دنیا ہے جہاں معنی اور مفاہیم نیا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور انسانی رویے ارفیعت کو پا لیتے ہیں۔ دل کی بیماریوں کدورت ، منافقت ،خود غرضی، حسد اور نفرت کی تصوف کی دنیامیں کوئی جگہ نہیں۔ اگر صوفیانہ مسلک کو سیدھی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ حق اور سچ کی راہ پر چلنے کا ایک رویہ ہے۔ یہاں کیف و مستی ، انہماک اور محویت کا عالم رہتا ہے۔ تصوف کی دنیا میں اعمال کو درست سمت اور گفتار کو سچ کا درس ملتا ہے۔ اس لیے اس راستے کے راہ گیروں میں بڑے بڑے درویش، صادق، صابر ،قناعت پسند، متوکل، مخلص اور غیرت مند انسان دکھائی دیتے ہیں۔ صوفیا کے ہاں لفظ اپنے معنی بدل لیتے ہیں۔ یہاں توکل کاہلی کا نام نہیں، فقر گدائی نہیں، قناعت بے عملی کو نہیں کہتے، فنا یا گوشہ نشینی دنیاداری کو چھوڑنا نہیں، معرفت مادیت سے کنارہ کشی کا نام نہیں اور بوالہوسی کا نام عشق نہیں۔ یہ سب الفاظ اور جذبے تصوف میں آکر نئے اور مثبت معنی ومفہوم پالیتے ہیں۔

یہاں ہم "لمعاتِ قطب" اور "تذکرہ شاہ سردار" میں پائے جانے والے چند نمایا متصوفانہ نکات کو بیان کریں گے۔

توکل:

تصوف میں توکل کا یہ مطلب نہیں کہ خدا پر بھروسہ کرنا اور سعی کرنا چھوڑ دینا بلکہ اس شرط کے ساتھ کوشش کرنا کہ نتیجہ خدا پر چھوڑ دینا۔ یہ کوئی سلبی کیفیت نہیں بلکہ حرکی جذبہ ہے جس میں یقین کامل خدا پر ہونا شامل ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

وتوکل علی اللہ وکفی باللہ وکیلا۔

اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ بس ہے کام بنانے والا۔[28]

شیخ عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

"اگر تو سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی طرف لوٹا اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا تو اس وقت اللہ تیرے اور اپنے فضل کے درمیان حجابات اٹھالے گا۔ تیرے حسب، حال نعمت میں زیادتی فرمائے گا اور اپنی عنایت سے اس طرح ہر مشکل آسان کر دے گا۔ جیسے ایک مہربان اور دوست طبیب مریض کے لیے تدابیر کرتا ہے۔"[29]

توکل کے دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ خدا کی رضا پر راضی ہو جانا۔ سید قطب علی شاہ فرماتے ہیں۔ "متوکل درویش وہ ہیں کہ خدا سے بھی کچھ نہیں مانگتے۔"[30] یعنی آپ کے نزدیک توکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگا اور طلب بھی نہ کیا جائے کہ اس میں اپنی خواہش کو دخل ہے۔ بس خود کو اس کے ایسا سپرد کیا جائے کہ جو وہ چاہے عطا کرے اگر نہ چاہے تو نہ کرے۔ اس ضمن میں لمعات قطب میں پیر محمد طاہر حسین قادری لکھتے ہیں:

"میاں لال درویش سکنہ موضع عنایت شاہ سے روایت ہے کہ میری موجودگی میں موضع چوترہ سرگانہ سے ایک سرگانہ نے حضرت سید قطب علی شاہؒ کی خدمت میں عرض کی "حضور کا بڑا خرچ ہے" آپؒ نے فرمایا! ہمارا تو کوئی خرچ نہیں، مخلوق بھی خدا کی اور خرچ بھی خدا کا ہے۔"[31]

اسی ضمن میں حضرت سید سردار علی شاہؒ کا ارشاد نقل کرتے ہوئے پیر محمد طاہر حسین قادری تحریر کرتے ہیں:

"اگر تو خدا پر توکل کرے اور اسی سے امید رکھے۔ اسی سے ڈرے اور کشائش کا منتظر رہے۔ اس کی بلد پر صبر کرے، نعمت پر شکر، قضا پر راضی رہے تو تجھے دو جہاں میں ایسی روزی دے کہ تو شمار نہ کر سکے اور تجھ کو خوش و خرم کر دے گا اور تیرا حال ایسا کر دے گا جیسا تیرے باب حضرت آدمؑ کا جن کو چرشتوں نے سجدہ کیا۔"[32]

فقر:

مسلک تصوف میں فقر نہ تو تنگ و دستی، مفلسی یا گدائی کا نام ہے، نہ ہی ترک دنیا اور نفس کو تکلیف میں ڈالنا ہے بل کہ یہ رضائے الٰہی کے سامنے نفع یا نقصان سے غنی ہو جانا ہے یہ وہ جہد مسلسل ہے جو خدا کے رضا کے لیے بغیر کسی صلے یا انعام کے کی جاتی ہے۔ نبیؐ نے فرمایا" الفقر فخری" (مجھے اپنی فقیری پہ ناز ہے۔)صوفی بھی حضورؐ کی تقلید میں دنیاوی آرائش و آرام کو اپنے لیے نہیں بل کہ دوسروں کے لیے پسند کرتا ہے اور اس کا وجود باعث خیر بن جاتا ہے۔

اقبال نے اپنے کلام میں خودی اور فقر پر زور دیا ہے فقر اقبال کے نزدیک مادی خواہشات یا احتیاجات سے تعلق ہونا نہیں بل کہ زندگی کی تمام تر سہولتوں کے باوجود عدل و انصاف کا حامی ہونا۔ ظالم کی بجائے مظلوم کا ساتھ دینا بھی فقر ہے۔

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند

در شہنشاہی فقیری کردہ اند(پیام مشرق)

سید قطب علی شاہؒ کا وجود مسعود ہر طرح سے دوسروں کے لیے منبع ء خیر تھا۔ آپ ہمیشہ دوسروں کی ضروریات کا خیال فرماتے۔ غرباء کی تنگ دستی اور روزی روٹی کا خاص فکر ہوتا۔ پیر محمد طاہر حسین قادری آپ کی سوانح کا ایک واقعہ تحریر کرتے ہیں:

> " حضرت قطبِ عالمؒ نے دربار شریف پر جب پختہ مسجد کی تعمیر شروع کروائی تو دو مرتبہ چھت ڈالنے کے قریب پہنچ کر آپؒ مسجد شہید کروا دیتے کہ جیسے میں چاہتا ہوں ویسے تیار نہیں ہوئی۔ تیسری مرتبہ جب چھت کے قریب پہنچی تو حضور نے پسند فرماتے ہوئے چھت ڈالنے کا حکم صادر فرمایا۔ معماروں نے جسارت کر کے پوچھ لیا کہ پہلے دو مرتبہ بھی ایسی ہی تھی ضرور کوئی خاص وجہ ہے آخر ان کے اصرار پر فرمایا، ہمارے علاقے میں ان دنوں قحط پڑا ہوا تھا مسجد کی تعمیر پر غرباء

کی مزدوری کا بہانہ خدا ساز موقع تھا۔یہی وجہ تھی کہ اسے طویل عرصہ جاری رکھنے کے لیے دو مرتبہ مسجد گرادی گئی۔[22]

صبر:

صبر سے مراد کسی صدمے یا مصیبت کو شکوہ کے بغیر برداشت کرنا یا کسی بھی ایسے دکھ اور پریشانی کو برداشت کرنا جو صحیح راستے پر چلنے میں اپنے نفس یا دنیا کی طرف سے پیش آئیں اور حق کی راہ میں کوئی لالچ انسان کے ارادے کو متزلزل نہ کر سکے۔انسانی زندگی میں صبر ایک بہت بڑا وصف ہے۔نبی اکرم ﷺ نے تمام زندگی صبر و تحمل سے کام لیا اور صحابہ بھی اسی طریق پر گامزن رہے۔تمام صوفیاء خود بھی تمام زندگی صبر واستقامت اختیا کرتے ہیں اور اپنی تعلیمات میں کبھی صبر واستقامت پر زور دیتے ہیں۔حضرت سید قطب علی شاہؒ صبر کے بارے میں بیان فرماتے ہیں:

"جب بندہ محبت الٰہی میں قدم رکھتا ہے اور عمل متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کئی چیزوں سے اس کا امتحان لیتا ہے اور آزماتا ہے اس کے مال میں نقصان ہونا اور روزی کا تنگ ہونا اور خلق میں بے قدر اور طعنہ زد ہونا اور اکثر بیماریوں کے سبب اس کا حال تغیر ہونا پس جب وہ اپنی نیت اور محبت میں راست و سچا ہے تو ان باتوں میں کسی بات کو بھی اپنے دل میں راہ نہیں دیتا۔تب وہ تحمل کو کام میں لاتا اور صبر اختیار کرتا ہے۔"[34]

مزید فرماتے ہیں عارفوں کے نزدیک صبر تین قسم پر ہے۔

"اول صبر عام۔عام صبر روکنا نفس کا ہے، تمام نفسانی خواہشوں سے، دوم صبر خاص۔خاص کا صبر پینا کڑوی چیزوں کا ہے۔بدوں ترش روی کے یعنی مصیبت میں دل تنگ نہ ہونا۔تیسرا صبر خاص الخاص کا۔وہ یہ ہے کہ محبوب کی مصیبت اور بلا سے لذت اور مزا لینا ہے۔"[35]

معرفت:

معرفت کے لغوی معنی ذریعہ، وسیلہ، شناخت اور پہچان کے ہیں تصوف میں معرفت یہ ہے کہ انسان خود کو دنیاوی

عوارض سے پاک کر کے اور نفس کی کمزوریوں پر قابو پاتے ہوئے اللہ سے ایسی لو لگائے کہ اس کی ذات کا مشاہدہ کرے۔ ہر وقت پورے قلب سے خدا کے حضور حاضر رہے۔ جب کوئی صوفی اپنے باطن کا تعلق مسلسل اپنے رب سے قائم کر لیتا ہے تو اس پر اسرار کھلتے ہیں اور وہ معرفت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ معرفت حاصل کرنے کے اپنے اپنے درجات ہوتے ہیں ایک عام آدمی کی معرفت ایک اللہ کے ولی کی معرفت سے مختلف ہو گی۔ حضرت پیر محمد کرم حسین قادریؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں۔ "معرفت کے طریقے کی پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں جہانوں کو ترک کر دینا اور پشتِ پا سے ٹھکر ادینا۔"(36)

حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ نے معرفت پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ معرفت زبانی جمع خرچ سے حاصل نہیں ہوتی کیوں کہ یہ قال نہیں، حال ہے۔ تمثیل کے ساتھ سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں۔ جیسا کوئی کسی کو شہر یا مقام کا نقشہ معہ تمام گلی و کوچہ بیان کرے تو کبھی اس کے فہم میں نہ آوے گا جب تک کہ وہ اپنی آنکھ سے نہ دیکھے۔ آپ کے نزدیک شریعت سے ہی معرفت کا حصول ممکن ہے ایک حدیث کا مفہوم بیان کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

> "شریعت بمنزلہ کشتی ہے اور طریقت مثل دریا اور حقیقت بہ طور صدف و معرفت مانند دُر کے ہے۔ پس وہ کوئی جو ارادہ کرے کہ وہ دُر میرے ہاتھ آوے تو اول کشتی پر سوار ہو۔ بعد ازاں دریا میں جائے پھر طرف صدف کی تا واصل در مقصود ہو گا۔"(27)

خلوت:

تصوف میں اس سے مراد ترک دنیا اور گوشہ نشینی نہیں ہے بلکہ کچھ دیر کے لیے (ایک متعین مدت) محبت خلائق اور ہستی سے بیگانہ ہونے کو کہتے ہیں اسی سے مراد حضوری بحق بلا خطرات غیر ہے۔ اس عرصہ میں سالک اپنے مالک سے راز و نیاز حاصل کرتا ہے جس میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔ ابتداء میں سالکن خلوت کو ترجیع دیتے ہیں پھر ایک وقت آتا ہے جب ان کے لیے خلوت و جلوت یکساں ہو جاتی ہے۔ ابتدائے حال میں یکسوئی حاصل کرنے کے لیے خلوت اختیار کی جاتی ہے۔ حضرت قطبِ عالمؒ ایک عرصہ خلوت نشین رہے اور اس کے لیے باقاعدہ ایک جگہ چلہ گاہ بنائی گئی۔ حضرت

سید قطب علی شاہ فرماتے ہیں۔ "طالب کو چاہیے کہ اول خلوت اختیار کرے کیوں کہ بغیر خلوت کے مقصود تک نہیں پہنچتا۔"(38)

مزید بیان کرتے ہیں:

"خلوت کا اختیار کرنا فعل مسنون ہے کیوں کہ حضرت محمد ﷺ کو حرا میں کبھی ہفتہ، کبھی دس دن، کبھی مہینہ اور اکثر تو چالیس دن خلوت فرماتے تھے تب آپؐ کی نبوت اظہر من الشمس ہوئی اور خلوت سے مقصود تقرب حق تعالیٰ ہے۔ اس لیے طالب صادق کو چاہیے کہ جب خلوت میں داخل ہونے کا ارادہ کرے تو پہلے حظوظات دنیا سے خالی ہو اور جن چیزوں کا مالک ہے ان کو دل سے قطع کرے۔"(39)

ضبطِ نفس:

نفس کے لغوی معنی کسی چیز کا وجود اور اس کی اصل ہے ایسی صلاحیت جس سے شخصیت کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کا احاطہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ یہ لفظ ہمت، غیرت، عقل، عظمت وسعت، کشادگی، قلب، ارادہ اور عقوبت کے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ عام حالات میں نفس کا مطلب بھی روح اور کبھی جسم بھی لیا جاتا ہے لیکن صوفیاء کرام کے نزدیک نفس برائی اور شر کا سرچشمہ اور تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے کہ ان نفس لامارہ بالسوٗ۔ ترجمہ: یقیناً نفس برائی کا حکم دیتا رہتا ہے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی نے اپنے مریدوں کو ضبطِ نفس کی یوں تلقین فرمائی ہے:

"مکمل بھلائی اسی میں ہے کہ تمام حالات میں نفس سے دشمنی رکھی جائے اگر تو پرہیز گار ہے تو نفس کا اس طرح مخالفت ہو جا کہ لوگوں کے حرام اور متشبہ مال، احسان، بھروسے، اعتماد، ان سے خوف، امید اور مزید متاع دنیا میں سے جو کچھ ان کے پاس ہے اس سے پوری طرح بے نیاز ہو جا۔"(40)

حضرت سلطان باہو ضبط نفس کے متعلق یوں ارشاد فرماتے ہیں:

"نفس پرست تو سارے ہوا کرتے ہیں لیکن خدا پرست بہت کم ہوتے ہیں۔ شہوت، غصہ، طمع، حرص، ہوا اور زینت کو روند ڈال تا کہ تو یکبارگی مرد بن جائے۔"(41)

ضبطِ نفس کے بغیر کسی مرتبہ کا حصول تو درکنار کوئی صوفی صحیح معنوں میں صوفی بھی نہیں بن سکتا۔ دورِ حاضر میں انسان کا پستی میں گرنا اپنے نفس کی غلامی کی بدولت ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد جائز خواہشات اور ضروریات کا گھونٹنا نہیں بل کہ اخلاق رزیلہ اور ناجائز خواہشات سے خود کو پاک کرنا ہے۔ حضرت سید قطب علی نے انسان کو نفس سے مقابلہ کرنے کا ہنر بھی بتایا اور اس کے وار کرنے کے مقامات کی نشان دہی بھی فرمائی تا کہ انسان ضبطِ نفس سے قربِ الٰہی کو حاصل کر لے "لمعاتِ قطب" میں تحریر ہے۔

"انسان کے وجود میں نفس کے چار خانے میں اول زبان جس سے لہو و لعب پیدا ہوتا ہے۔ دوم دل جس سے خطرات و سواس ظاہر ہوتے ہیں۔ سوم ناف جس میں شہوت و ہوا پیدا ہوتی ہے۔ چہارم اطراف دل جس میں حرص و حسد، کینہ و کبر، عجب و غرور، بغض و عداوت اور ریا وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں۔ جس شخص نے ان چہار خانوں کی حفاظت و نگہبانی کی اس نے اپنے نفس سے ٹھیک مقابلہ و مجاہدہ کیا۔"(42)

توبہ:

لغوی اعتبار سے توبہ لوٹنا یا رجوع کرنا اصطلاحاً گذشتہ گناہوں یا غلطیوں پر ندامت اور آئندہ اس قسم کی برائی یا گناہ نہ کرنے کا اقرار کرنا ہے۔ توبہ حلقہ صوفیا میں داخل ہونے کا پہلا راستہ ہے توبہ سے ہی سالک راہِ طریقت پر سفر کا آغاز کرتا ہے۔ توبہ اس راہ کی ابتداء ہے۔ توبہ کا معنی غیر سے ترک کرنا اور خدا کی طرف راغب ہونا ہے۔ توبہ کے بغیر نفس گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے سالک کو ہمیشہ توبہ کرتے رہنا چاہیے۔ حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ نے توبہ کو بڑے وسیع اور وقیع انداز میں بیان فرمایا ہے اور اسی میں تصوف کے کئی مقامات کو بیان فرما دیا ہے۔ اپنی ایک مجلس میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"پس سالک کو دس کام سے توبہ مدام چاہیے۔ اول جہل اور نادانی سے نکلنا۔ دوم ان کا دل سے ڈرنا جن پر اللہ کا غصہ ہو۔ سوم دور ہونا ہر صغیرہ اور کبیرہ گناہ سے۔ چہارم چھوڑنا شہوات و لذت کا۔ پنجم نفس امارہ کے مکر سے بچنا اور اس کے برعکس چلنا۔ ششم ظلم سے آپ کو بچانا۔ ہفتم غفلت کو ترک یعنی خدا عزوجل کے احکام سے غافل نہ ہونا اور خدا تعالیٰ کو خود سے غافل نہ سمجھنا۔ ہشتم پرہیز کرنا اور دور ہونا صحبت بد سے۔ نہم کم کھانا مگر وہ بھی وجہ حلال سے ہو۔ دہم، تمام ماسوا اللہ حرام کر کے وصل الٰہی کا طالب ہونا۔"(43)

حضرت سائیں پیر محمد کرم حسین قادریؒ نے توبہ کے معنی میں وسعت پیدا کی ہے اور تصوف میں توبہ کے مقامات کو واضح کیا ہے۔ وہ سالک کو خبر دار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اے درویش! تم سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو تو ایک بار توبہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی رحیم و کریم ہے کہ تمہیں معاف فرمادے گی لیکن اگر کوئی نیکی کرو تو اس مرتبہ توبہ کرو تا کہ تمہارے دل میں کہیں تکبر پیدا نہ ہو جائے۔"(44)

فنا:

لفظی معنی تو موت، نیستی اور معدوم ہونے کے ہیں لیکن تصوف میں فنا اپنے وجود کو وجود حق میں ضم کرنا ہے بعین قطرے کا دریا میں مراجعت کرنا۔

ع۔ دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر (غالب)

اپنے وجود کو خدا کے سپرد کر کے بے نیاز ہو جانا حضرت جنید بغدادی نے فنا کے تین درجے بیان کئے ہیں۔

"۱۔ پہلی قسم کی فنا یہ ہے کہ تم اپنی صفات، اخلاق اور مزاج کی قید سے آزاد ہو جاؤ۔

۲۔ دوسری قسم کی فنا یہ ہے کہ تم اپنے حظ نفس سے بالکل ستبردار ہو جاؤ۔

۳۔ تیسری قسم کی فنا یہ ہے کہ تجلیات ربانی کا تم پر اتنا غلبہ ہو جائے کہ تمہارے اس وجود موجود کی حقیقت تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔"[45]

تصوف میں فنا کی تین منازل ہیں۔ فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، فنا فی اللہ۔ مگر مشکل ترین اور پہلی اور آخری یہی فنا فی الشیخ ہے اگر فنا فی الشیخ ہو جائے تو اگلی منازل آسان ہو جائیں۔ حضرت سائیں پیر محمد کرم حسین قادری اپنی وصایا میں فرماتے ہیں۔ "جب تک مرید فنا فی الشیخ کی منزل کو حال، قول اور فعل سے حاصل نہیں کر لیتا اسے کرئی کرامت حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی فنا فی الرسول ہو سکتا ہے۔"[46]

حضرت سید سردار علی شاہ نے اپنے قول و فعل سے فنا اور بقاء کے مسئلہ کو سلجھایا۔ ان کی کتاب تحفۂ عرفانی سے پیر محمد طاہر حسین قادری ایک اقتباس بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یا اللہ! یہ بات میں ظاہر کرنے میں بے وس (بے اختیار) ہوں۔ مجھے آزمائیں۔ یا اللہ! بیان کرنے و توحید لکھنے ولوگوں کو فیض دینے میں تو ہے میری ہستی کچھ نہیں۔"

میں ہاں ابرو شیر ماہیؒ دے بینی نین پیشانی قسم ربانی

گردن، گوش تے زلفاں، بازو، مژگاں مثل کمانی قسم ربانی

میں ہاں ماہی، ماہی میں ہاں، نہیں ایہہ بات حیرانی قسم ربانی

سردار علی بَن شیر بیٹھا کر برقعہ یکسانی قسم ربانی ۔"[47]

ii. سلسلہ قطبیہ کی سوانح عمریوں کا سماجی پہلو:

دنیا کے تمام معاشروں میں مذہب کو کلیدی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔ مذہب اسلام میں تصوف یا خانقاہ کا سماج سے گہرا تعلق ہے۔ قدیم زمانہ سے خانقاہیں سماج میں بہ طور ادارہ خدمت خلق خدمات انجام دیتی آرہی ہیں۔ جدید مغربی دنیا نے جسے آج چیریٹی / فلاح و بہبود کا نام دیا ہے تصوف اسے بہت پہلے سے انجام دے رہا ہے۔ یہ صوفیانہ ادارے

معاشرے کی روحانی (فکر سطح پر) اور جسمانی ضروریات کا بلا معاوضہ بندوبست کرتے ہیں۔ یہاں جہل کی جہالت کو فکر کے نور سے منور کیا جاتا ہے اور آنے والے سے مذہب و مسلک کی بجائے کھانا پوچھا جاتا ہے اس کے دکھ اور پریشانیاں سن کر ان کا مداوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تصوف میں پہلے سالک خود دنیاوی آسائشوں اور لذتوں سے خود کو روک کر یعنی تزکیہ نفس کر کے قربِ الٰہی حاصل کرتا ہے پھر نہ صرف فکری اور اخلاقی سطح پر معاشرے کی فلاح و بہبود کا کام کرتا ہے بل کہ جب وہ دنیا کے لذائذ سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو اپنی نہیں دوسروں کی فلاح کا خیال رکھتا ہے۔ ایک بہتر سماج کے لیے انسان کا کردار اور فکری سطح کا بلند ہونا ضروری ہے۔ معاشروں کی ترقی کے لیے افراد کی سوچ کا بہتر ہونا لازم ہے معاشرے کی بنیادی اکائی فرد ہے اگر انسان اپنے آپ کو پہچان لے گا تو انسانیت کا اظہار کرے گا۔

حضرت سید قطب علی شاہؒ نے انسان کے درجات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "انسان کے پانچ درجے ہیں۔ اول: وہ طبع خام جس میں یہی تین کام ہوں، کھانا، سونا، جماع کرنا وہ مطلق حیوان ہے۔ دوم: اس میں دو اور بھی نقص ہوں یعنی فساد کنندہ و آزار دہندہ۔ وہ بے فرمان درندہ حیوان ہے۔ سوم: جس میں تین اور بھی نقص ہوں یعنی مکر و حیلہ، ہر کسی کو نقصان پہنچانا، وہ درجہ شیطان میں ہے۔ چہارم: جس میں چھ اوصاف ہوں نرم دل، بے حسد، بے کینہ صادق، زبان، نیک خو، راحت رساں۔ وہ ملائکہ کے درجہ میں ہے۔ پنجم: ان کے ساتھ دو اور بھی باتیں ہوں یعنی کمال محبتِ الٰہی و علم و معرفت سے دل کی صفائی۔ پس تب وہ جو ان کامل انسان ہے۔"[48]

اخلاق:

کسی بھی سماج کے لیے اخلاق ایک بنیادی اصول ہے۔ معاشرے کے تمام پہلو تعلقات عامہ، معاشیات، کاروبار اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے استحکام و ارتقاء کے لیے اخلاق نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ مجھے تعجب اس شخص پر جو اپنے مال سے غلاموں کو تو خریدتا ہے پھر ان کو آزاد کرتا ہے وہ بھلائی کا معاملہ کر کے

آزاد آدمیوں کو کیوں نہیں خرید تا جب کہ اس کا ثواب بہت زیادہ ہے ؟یعنی جب وہ لوگوں سے حسنِ سلوک کرے گا تو لوگ اس کے غلام بن جائیں گے۔ صوفیا اسی حسن سلوک اور اخلاق و محبت سے مخلوق کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ وہ حقیقت میں ان کے دلوں کے سلطان ہوتے ہیں۔ وہ خود جتنی بھی تکلیف میں ہوں مگر اپنے پاس آنے والوں کو آزردہ خاطر نہیں رہنے دیتے۔ ملک رہنواز "تجلیاتِ کرم" میں رقم طراز ہیں:

> "حضور قبلہ عالم منگانویؒ" نے ساری زندگی ایک تکلیف دہ اور لاعلاج قسم کے مرض کو گلے لگائے رکھا۔ دن کراہتے ہوئے گزرتا تو رات کھانستے ہوئے لیکن آپؒ کے پاس مخلوقِ خدا ہزارہا تکالیف و مصائب کی فریاد لے کر آتی۔ ہر کسی کو دعائیں، حوصلہ اور تسلی دیتے کسی ایک لمحہ بھی اکتاہٹ کا مظاہرہ نہ کرتے۔"(49)

حسنِ اخلاق اور حسنِ سلوک ایسی با اثر اور طاقت ور خوبیاں ہیں جو بغیر تلوار کے آپ کو فتح سے ہمکنار کرتی ہیں۔ اس سے دشمن دوست بن جاتے ہیں۔ صوفیا نے انہیں اوصاف کی بدولت بے شمار علاقے اور ان گنت کفار کے دلوں کو فتح کیا۔ اس سے معاشرے میں باہمی محبت اور خلوص کی جو فضا قائم ہوتی ہے۔ اس سے آنے والی نسلوں کے بھی چہرے روشن ہو جاتے ہیں۔ "لمحاتِ کرم" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ایک آدمی (جس کا نام ظاہر نہیں کر رہا) جب بھی حضور قبلہ عالم منگانویؒ کی خدمت میں آتا آپ اس کے ساتھ بے حد محبت و شفقت سے پیش آتے۔ اس کی عزت کرتے اور بہت خاطر تواضع کرتے۔ ایک دن اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا گاؤں میں یہ آدمی مجھ سے زیادہ بغض اور دشمنی رکھتا تھا لیکن میرے حسنِ سلوک کے باعث اب یہ میرا سب بڑا محب ہے۔"(50)

رواداری:

دور حاضر میں ایک بڑی برائی تحمل کا نہ ہونا یعنی عدم برداشت کا ماحول ہے۔ معاشرہ مختلف قسم کے نسلی، لسانی اور مذہبی تعصبات کا شکار نظر آتا ہے۔ یہ صوفیا کی تعلیمات ہیں۔ جن میں ہر کسی کے لیے جگہ موجود ہے وہ ہر آنے والے سے بلا مذہب و ملت حسن سلوک سے پیش آتے ہیں ایک بہتر سماج کی نمو کے لیے تحمل اور رواداری کا ہونا بہت ضروری

ہے۔ اولیاء اللہ اپنے رب کی تمام مخلوق کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جس سے معاشرے میں محبت اور ہم آہنگی پروان چڑھتی ہے۔ "حافظ الکرم" میں پیر محمد طاہر حسین تحریر کرتے ہیں:

> "میاں رشید سکنہ بلوچنی چک نے مجھے بتایا خلیفہ میاں اللہ آباد کے گھر اور میرے گھر کے درمیان ایک سکھوں کا گھر تھا۔ ایک مرتبہ حضور ہمارے گاؤں میں تشریف لائے۔ جب ان سکھوں کے گھر کے سامنے سے گزرنے لگے تو سکھ خاتون دوڑ کر آپ کے سامنے آگئی اور اصرار کرنے لگی کہ پہلے میرے گھر قدم رنجہ فرمائیں۔ حضور اس کے گھر تشریف لے گئے تو وہ دودھ کا ایک گلاس لائی تاکہ آپ نوش فرمائیں اگرچہ حضور نے روزہ رکھا ہوا تھا لیکن اس کی دلجوئی کے پیشِ نظر حضور نے دودھ پی لیا تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ آپ غیر مسلموں کے گھر سے کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔۔"[51]

اگر ہمیں ایک بہتر معاشرہ اور سماج قائم کرنا ہے تو ہمیں تعصبات سے نکل کر اپنے اندر برداشت پیدا کرنا ہوگی اور وہ صوفیا کے طرز زندگی کے مطالعہ اور ان کے فیض صحبت سے ہی ممکن ہے۔

انسان دوستی:

صوفیاء نے مذہب اسلام کو عملی طور پر معاشرے میں انسان دوستی اور اپنے پر خلوص کردار سے ہمہ گیریت عطا کی اور اسلام ہر علاقے میں ہر مذہب کے بسنے والے لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا چلا گیا۔ حضرت عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔ "تصوف خدا اور مخلوق کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے کا نام ہے"۔ صوفیاء کا طرزِ زندگی محبت، انسان دوستی اور اعلیٰ اخلاقی کردار سے غیروں کو بھی اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھتے ہوئے ان سے ہمیشہ حسن اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ وہ امیر ہو یا غریب، سید ہو یا نائی سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ اپنی انا کو ختم کرتے ہوئے مخلوق خدا کو احترامِ انسانیت سکھاتے ہیں۔ سید عبد القادر پیر سید محمد نواز شاہ کی سوانح لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> "ایک مرتبہ سادات کرام آپ کے پاس تشریف لائے اور خواہش ظاہر کی کہ آپ ان درویشوں کو اٹھادیں ہم نے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ آپ نے فرمایا آپ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں۔ ان

کی موجودگی میں فرمائیں یہ درویش میری برادری ہیں میں خود بھی درویش ہوں ان کو نہیں اٹھا سکتا۔"[52]

صوفیاء معاشرے اور سماج کی برائیوں کے نباض ہوتے ہیں۔ سماجی برائیوں میں سے ایک بڑی خطرناک بیماری خود پسندی اور انا ہے یہ ہی معاشرے میں تعصب اور انتشار پھیلاتی ہے۔ انسان دوستی کی بجائے نفرت اور کدورت جیسے جذبات کو پالنے لگ جاتا ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیر محمد طاہر حسین قادری قبلہ عالم منگانویؒ کا ایک قول نقل کرتے ہیں: "اتنا اور کوئی گناہ نہیں جتنا انسان کی انا میں ہے۔"[53]

انسانوں کے درمیان بلا تفریق رنگ و نسل یگانگت، وسیع المشربی، بدی سے اجتناب، نیکی کا سلوق اور مفید معاشرت صوفیا کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔

خدمتِ خلق:

خدمتِ خلق کا عام مفہوم تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کی خدمت کرنا۔ خدمتِ خلق حقیقت میں قرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا۔ "بہترین انسان وہ ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے نفع بخش ہو۔"[54] (حدیث) افراد سے سماج بنتے ہیں اس لیے فرد کی تمام ضرورتیں اور مشکلات سماج سے جڑی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد سے باہمی محبت اور اخوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جس سے ایک ہمدرد اور دردمند معاشرہ فروغ پاتا ہے۔ صوفیہ اکرام کی تعلیمات اور اعمال میں سب سے زیادہ اہمیت خدمتِ خلق پر دی جاتی ہے۔ خدمتِ خلق کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور اللہ تعالیٰ کو حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد پسندیدہ ہیں۔ صوفی خانقاہیں خدمت خلق کا مرکز ہیں جہاں سے اک جہان نہ صرف علمی بل کہ تمام تر مادی ضروریات روزانہ کی بنیاد پر پوری کرتا ہے اور یہ سلسلہ رکتا نہیں چلتا ہی رہتا ہے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری حضرت خواجہ حافظ گل محمد قادریؒ کے احوال بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"دربار شریف پر راہِ خدا کے متلاشیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ غربت کا زمانہ تھا ان دنوں دو وقت کی روٹی گھر میں بھی مشکل سے ملتی تھی۔ نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ گندم کی سخت قلت تھی۔ کہا جاتا ہے اس

زمانے میں لوگ بھنے ہوئے چنے اور باجرہ، جوار کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ لنگر شریف میں بھی اس قحط کا اثر تھا۔ مائی صاباں (لنگر کی ایک بزرگ خادمہ) بتایا کرتیں اگر دن کو دو بوری آٹا بھی لنگر میں تو شام کو رکھنے کی ہمیں اجازت نہ تھی ایک وقت لنگر میں پکایا جاتا اور بقیہ بلو آنہ شریف کے غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔"(55)

خدمتِ خلق نہ صرف قربِ الٰہی کا زریعہ ہے بل کہ اس سے معاشرہ ہمدردی، محبت اور امن و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ لوگوں کو خانقاہوں سے نہ صرف روحانی سکون حاصل ہوتا ہے بل کہ ان کی کئی طرح کی ضروریات زندگی کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ آستانے محض پیسے بٹورنے کا ذریعہ ہیں لیکن انہوں نے کبھی اس نظام کو قریب سے نہیں دیکھا ہوتا زیادہ تر خانقاہوں پر لنگر خانے کے ساتھ ساتھ مفت نظامِ تعلیم اور رفاہی کاموں کے لیے باقاعدہ ادارہ جات موجود ہیں۔ خانقاہ منگانی شریف پر ریاض الکرم اکیڈمی اور کتابخانہ ابنِ کرم کے نام سے ایک جامع لائبریری موجود ہے جہاں سے ظاہری و باطنی تعلیم کی ترویج و اشاعت کا کام ہمہ وقت جاری ہے۔ ریاض الکرم کے نام سے چیئرٹی کا کام جاری ہے جو علاقہ کے غریب خاندانوں کو مفت راشن، ہینڈ پمپ اور مفت علاج کی سہولیات فراہم کر رہی ہے۔ غریب اور یتیم بچیوں کی شادی اور جہیز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سید عبد القادر شاہ نے سوانح حیات سید نواز شاہ میں ایسے خیر کے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

"آپ کی طرف سے مستحق لوگ اپنی بچیوں کی خاطر جہیز کے لیے امداد لے جایا کرتے اور بعض اوقات تو آپ سے مہمانوں کی روٹی کا خرچہ بھی لے جاتے کہ ہمارے پاس مہمان داری کے لیے گوشت نہیں ہے۔"(56)

خانقاہیں بنیادی طور پر خدمت خلق کے ایسے ادارے ہیں جن کو ہم دورِ حاضر میں چیئرٹی کا نام دیتے ہیں۔ خانقاہ صرف لوگوں کو کھانا، رہائش اور دوستانہ ماحول ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ حسنِ سلوک کے وہ معیار دیکھنے کو ملتے ہیں جو ہمیں مہذب معاشرے میں بھی دیکھنے کو نہ ملیں۔ وہاں ان لوگوں سے بھی خوش اسلوبی اور محبت سے سلوق کیا جاتا ہے جنہیں

لوگ گھروں میں برداشت نہیں کرتے، جن کو لوگ دیوانہ، پاگل اور بے وقوف تصور کرتے ہیں خانقاہی ماحول ان کو بھی اپنے دامن میں پناہ دیتا ہے۔

اخوت، بھائی چارہ:

کسی بھی سماج کے مضبوط اور روشن مستقبل کے لیے اخوت ایک اہم اور لازم ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال مدینہ منورہ میں پیش ہوئی جب مسلم معاشرہ کی بنیاد رکھی گئی۔ چند مہاجر ہجرت کر کے آئے اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے مدینہ کے رہائشی انصار کا انہیں بھائی بنا دیا۔ اسی بھائی چارے کی بنیاد پر دس سال کے قلیل عرصہ میں ایک مسلم ریاست قائم ہو گئی۔ تقسیم کے بعد بھی جو ہجرت مہاجر سے نئے رشتے قائم ہوئے۔ وہاں بھی اسی جذبہ کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجر بھائیوں کی پاکستانی انصار نے دل کھول کر مدد کی۔ اس دوران خانقاہوں پر باقاعدہ بیت المال قائم کیے گئے۔ خانقاہوں نے اس ضمن میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ایسی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئیں کہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں دھڑ شریف جو کہ حضرت حافظ گل محمدؒ کا پیر خانہ تھا ایسی امداد باہمی سرگرمیوں کا مرکز نظر آتا ہے۔ کتاب حافظ الکرم سے ایک اقتباس دیکھیے:

> "جب مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے پاکستان پہنچنا شروع ہوئے تو ان کی حالت زار دیکھ کر حضرت اقدس دھڑویؒ نے سب درویشوں کو حکم فرمایا کہ اپنے مال میں سے اپنے مہاجر بھائیوں کو بھی حصہ دو۔ دھڑ شریف میں باقاعدہ گھر میں ایک کمرہ بیت المال کے لیے مختص فرمایا جہاں درویشوں کا لایا ہوا مال رکھا جاتا اور حضور اپنی موجودگی میں اسے مہاجرین میں تقسیم فرماتے۔ حضور کا والہانہ جذبہ دیکھتے ہوئے درویشوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی اوقات سے بڑھ کر مہاجر بھائیوں کی خدمت کے لیے ایک مرتبہ پھر مدنی ایثار کی یاد تازہ کر دی۔"[57]

یہ گروہ صوفیہ ہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے راستے میں اس طرح چلتے ہیں کہ دنیا کی کسی بھی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔ اپنا تن، من، دھن اور اولاد تک سب اس کے نام پر قربان کر دیتے ہیں اور اسی میں راحتِ قلبی پاتے ہیں۔ "تاریخ ابنِ کرم" میں سید غلام رسول شاہؒ کا قیام پاکستان کا واقعہ درج ہے۔ اس وقت ان کا گاؤں فتح پور شریف

ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی گزر گاہ تھا۔ آپ ان کے لیے کھانے کا انتظام فرماتے، روزانہ آٹھ، نو ہزار آدمیوں کو کھانا کھلایا جاتا۔ آپ نے گھر کی ہر ایک چیز زیورات، کپڑے اور برتن سب کچھ مہاجرین کو پیش کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک مہاجر عورت کا بچہ کہیں راستے میں گم ہو گیا اس نے جب آہ وزاری سے سوال کیا تو اپنے اکلوتے بیٹے کا بازو بھی اس عورت کو تھما دیا اور وہ لے کر چل پڑی۔ اقتباس کچھ یوں ہے:

"جب کوئی اور چیز نہ رہی تو اپنے فرزندِ ارجمند پیر سید محمد عارف شاہؒ کو بھی انہیں ہدیہ کر دیا اور فرمایا خداوند کریم کا ارشاد ہے۔ لن تنالوا البر حتی تنفِقوا مما تحبون۔ تم درجہ کمال کی نیکی ہر گز نہ پا سکو گے حتی کہ (راہِ خدا میں) ان چیزوں سے خرچ کرو جن کو تم پسند کرتے ہو۔ بعد ازاں عقیدت مندوں نے زر کثیر ادا کر کے صاحبزادہ صاحب کو ان مہاجرین سے واپس حاصل کیا۔"۔"[58]

امانت و دیانت:

حضور نبی کریم ﷺ کو لوگ اعلان نبوت سے پہلے بھی صادق اور امین مانتے تھے۔ ہجرت کی رات بھی آپؐ کے پاس کفار مکہ کی امانتیں تھیں جن کو لوٹانے کی ذمہ داری حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی لگائی گئی۔ ایک بہتر معاشرے کی بقا اور نمو کے لیے امانت داری ایک اہم وصف ہے۔ یہ بھی مسلم معاشرہ کی ایک نمائندہ خوبی ہے۔ کسی بھی معاشرہ اور سماج کے لیے امن، خوشحالی اور سکون اسی صورت میں ممکن ہے کہ اگر لوگوں کے درمیان تعلق امانت کی بنیاد پر قائم ہوں ۔ جدید سماجی علوم کے مطابق اسے سوشل ٹرسٹ کہا جاتا ہے۔ ماہر سماجیات جارج زمل کا کہنا ہے کہ کسی بھی سماجی بندھن کے لیے ٹرسٹ ایک اہم ترین عمل ہے۔ جدید تحقیقات میں یہ بھی سامنے آیا ہے کہ جو حکومت اپنے عوام میں امانت داری کا جتنا اعتماد حاصل کر لیتی ہے اتنا ہی وہ اگلے میقات کے لیے اپنا راستہ صاف کر لیتی ہے۔

صوفیہ کرام کی زندگیاں امانت داری کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ وہ اسلامی اصولوں کی تربیت عملی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا کردار ہی وہ اصل شے ہیں جو لوگوں کو ان سے جوڑے رکھتا ہے۔ وہ تمام زندگی صداقت اور امانت کے علم بردار رہتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر مریدین میں یہ صفات خود بخود سرایت کر جاتی ہیں۔ سید عبد القادر لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ ایک غریب آدمی (جس کا نام غالباً نظام تھا) نے آپ کے پاس دو سو روپے امانت رکھے پانچ سال تک وہ شخص دربار شریف پر لنگر میں مقیم رہا کسی وجہ سے اس نے واپس چلے جانے کی اجازت طلب کی آپ نے اسے جانے کی اجازت فرمادی وہ اٹھ کر محفل سے چلا گیا۔ آپ نے انتظار کیا کہ یاد آنے پر اپنی امانت طلب کرے گا مگر اس نے ایسا نہیں کیا جب وہ کچھ فاصلے پر پہنچا تو آپ نے خود اسے آوازیں دے کر بلایا جب وہ واپس لوٹا تو آپ نے فرمایا تم نے پانچ سال پہلے جو رقم مجھے دی تھی۔ وہ واپس کر دوں یا میرے پاس امانت رہے گی۔ غالباً اسے یہ رقم بھول چکی تھی۔ اس نے کہا جناب مجھے واپس کر دیں۔ چنانچہ آپ نے اسی وقت واپس کر دی۔"[59]

سادگی اور کفایت شعاری:

معاشرے یا سماج کے لیے معاشی طور پر مستحکم ہونا بے حد ضروری ہے اور معاشیات پر کفایت شعاری اور سادگی براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ کفایت شعاری کے لغوی معنی کے مطابق انسان خریداری اور اخراجات میں میانہ روی اور اعتدال اختیار کرے اور زائد اخراجات سے اجتناب کرے۔ جب بھی حکومتی، گھریلو یا انفرادی سطح پر ہم خسارے کی بات کرتے ہیں تو اس کو توازن میں لانے کے لیے ہمیں اخراجات اور ضروریات کو مناسب آمدن کے لحاظ سے دیکھنا پڑتا ہے۔ جس کے لیے ہمیں سادگی اور کفایت شعاری کے اصولوں کو اپنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ فضول خرچی اور ضرورت سے زاید اخراجات ہمارے معاشرتی اور سماجی بگاڑ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اور اس سے نہ صرف اجتماعی ملکی خسارہ ہو رہا ہے بل کہ انفرادی زندگی بھی پریشانیوں سے دوچار ہے۔ ہر انسان اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے صبح سے شام تک سر توڑ کوشش کر رہا ہے مگر پھر بھی وہ ناکام نظر آتا ہے۔ اتنا کام کرنے کے باوجود اسے سکھ اور سکون میسر نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی ضروریات میں سادگی کفایت شعاری کو اپنائیں کیوں کہ یہ ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم بھی ہے۔ صوفیانہ طرز زندگی میں سادگی اور کفایت شعاری کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ صوفیہ کرام نہ صرف خود بل کہ وابستگان کو بھی کفایت شعاری اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ ملک ربنواز قادری "تجلیاتِ کرم" میں تحریر کرتے ہیں:

"بابا جی نے فرمایا اپنے رشتہ داروں، مخلوق اور اپنی اولاد پر جائز خرچ کرو ناجائز خرچ نہ کرو۔ فضولیات سے بچو۔ اپنی کمائی سے کچھ بچالیا کرو تاکہ تمہیں مشکل وقت میں کام آئے۔ سارے پیسے خرچ نہ کیا کرو۔"(60)

سادگی سے اخراجات خود بخود کرم ہو جاتے ہیں اور معیشت خود بخود بہتر ہو جاتی ہے۔ ہمیں مذہبی طور پر بھی سادگی اپنانے کا حکم دیا گیا ہے اور بحیثیت فرد معاشرہ اور سماج کے بہتری کے لیے بھی ہمیں لباس، خوراک اور رہائش میں سادگی کو ترجیحی بنیادوں پر اپنانا چاہیے تاکہ ایک بہتر معاشرہ نمو پاسکے۔ صوفیہ عظام نے سنت نبویؐ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور تمام زندگی خود بھی سادگی کو اختیار کیا اور لوگوں کی تقلید کے لیے بھی بہتر نمونہ پیش کیا۔ پیر محمد طاہر حسین قادری لکھتے ہیں:

"سرکار دو جہاں ﷺ کی سنت مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ سفید لباس ہی پسند فرماتے۔ جس کی نفاست اور لطافت قابل دید ہوتی۔ لٹھے کی بڑی چادر باندھتے، موسم کے لحاظ سے لٹھا یا ململ کا شاہپوری قمیض اور سفید ململ کی مائع لگی ہوئی دستار باندھتے تھے۔"(61)

سید عبد القادر سوانح حیات سید محمد نواز شاہ میں آپ کے عادات وخصائل کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" آپ کا مزاج بھی سادہ تھا۔ بناوٹ کو آپ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا غذا تو بے حد سادہ استعمال کرتے۔"(62)

iii. سلسلہ قطبیہ کی سوانح عمریوں کا تربیتی پہلو:

اگر ہم معاشرے کی تربیت کی بات کرتے ہیں تو پہلے ہمیں فرد کی تربیت کو دیکھنا ہو گا۔ معاشرہ افراد سے بنتا ہے۔ اگر فرد واحد تربیت یافتہ ہو جاتا ہے تو اپنے قریب موجود افراد کو نئے راستوں پر گامزن کر سکتا ہے۔ فرد کی تربیت کے لیے پہلے اس کے دل کو حسد، کینہ اور انا جیسی بیماریوں سے پاک کیا جاتا ہے۔ صوفیہ کا طرز یہ ہی رہا ہے کہ انہوں نے افراد کی تربیت کے لیے پہلے دل کی صفائی اور پاکیزگی پر توجہ دی ہے۔ دل کی پاکیزگی سے ایک فرد میں ایسا انقلاب پیدا ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف خود معاشرے کا ایک اہم فرد بن جاتا ہے بل کہ کئی دوسروں کو بھی راہِ راست پر لانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

حضرت خواجہ پیر محمد کرم حسین قادریؒ جرائم پیشہ افراد پر زیادہ توجہ اور مہربانی فرماتے تھے۔ آپ فرماتے کہ مرد ہمیشہ مرد ہوتا ہے وہ جتنا بڑا ڈاکو یہ پیشہ ور مجرم کیوں نہ ہو جب سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو مردوں کی طرح اس پر قائم رہتا ہے۔ حضرت کی نگاہ کرم سے سینکڑوں افراد جرم کی دنیا چھوڑ کر راہِ راست پر آئے اور باقی ماندہ کی زندگی معاشرے کا ایک کار آمد فرد بن کر گزاری نہ صرف اپنی اصلاح کی بل کہ کئی دوسرے لوگوں کو بھی حق کی راہ دکھلائی۔ "لمحاتِ کرم" میں پیر محمد طاہر حسین قادری رقم طراز ہیں:

"میاں راجہ نول بیان کرتا ہے، میں اپنے دور میں کبڈی کا نامور کھلاڑی اور پیشہ ور ڈاکو تھا۔ صرف جھنگ میں سات پرچوں میں مطلوب تھا۔ پولیس میرے پیچھے تھی۔ ایک دن میں نے جھنگ میں چوری کا مویشی فروخت کیا تقریباً ساڑھے چار ہزار روپے ملے۔ جیب میں ڈالے اور سوچا کہ ایک اور مویشی چوری کر لیتا ہوں اور تھانے والوں کو پیسے دے کر راضی کر لوں گا اور پرچے خارج کرا دوں گا۔ اسی جستجو میں تھانہ موچی والا کے علاقہ میں گشت پر چل نکلا۔ راستہ میں مال مویشی دیکھتا آیا لیکن کوئی خاص پسند نہ آیا۔ حضور کو دربار شریف پر آئے ہوئے صرف تین سال کا عرصہ گزرا ہو گا۔ لنگر شریف والے پختہ مکانوں کی بنیادیں رکھی جارہی تھیں۔ یہاں آیا تو لنگر شریف کے بیلوں کی ایک جوڑی کھڑی تھی۔ جو مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ چوری کر لوں تو میرا کام بن سکتا ہے۔ پیری فقیری کا مجھے پتہ نہیں تھا میں نے سمجھا یہ مہاجروں کا ڈیرہ ہے اور انہیں کے یہ بیل ہونگے۔ حضور نے دیکھا تو شیر خان بلوچ سے فرمایا، حقہ تیار کرو ہمارا مہمان آرہا ہے۔ میں نے سوچا بہت اچھا ہوا۔ حقہ بھی پیوں گا اور چوری کے لیے موقع بھی دیکھوں گا۔ جوانی کا زور تھا ایک آدھ آدمی کو تو میں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ دل ہی دل میں سوچا، دیکھنا چاہیے کہ یہ مریض رات کیسے بسر کرتا ہے۔ جاگتا رہتا ہے یا سو جاتا ہے۔ رسماً حضور کو سلام کیا اور آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبایا کہ اس میں کوئی جان بھی ہے کہ نہیں لیکن حضور کو تو محسوس تک نہ ہوا۔ میں نے سمجھا، مریض ابھی زیادہ کمزور نہیں ہوا۔ حضور نے فرمایا جاؤ سامنے چارپائی پر بیٹھو اور حقہ پیو، ایک درویش سے فرمایا، مہمان کے لیے کھانا لاؤ۔ جب کھانا کھا چکا تو دل میں سوچا۔ انہیں اپنی ذات نہیں بتاؤں گا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ حضور نے فرمایا مہر صاحب کس قوم سے تعلق

ہے؟میرا سر گھوم گیا کہ انہیں کس نے بتایا کہ نول قوم مہر کہلواتے ہیں،نہ چاہتے ہوئے بھی سچ بتانا پڑا پھر پوچھا کسی کے مرید ہو؟میں نے نفی میں جواب دیا،فرمایا کہیں مرید ہو جاؤ۔۔"[63]

مزید بیان کرتے ہیں:

"میں نے عرض کی،آپ بتائیں کہاں مرید ہو جاؤں؟فرمایا سیال شریف یا گولڑہ شریف چلے جاؤ۔ شیر خان نے اشارے سے کہا کہ حضور ہی کا مرید ہو جاؤ۔میں نے عرض کی جناب ہی مرید کر لیں۔میں چوری چھوڑ دوں گا۔آپ نے فرمایا تیرے پاس اس وقت بھی چوری کے پیسے ہیں چونکہ میرا زندگی میں کسی فقیر کی بارگاہ میں حاضری کا پہلا موقع تھا۔اس لیے حیران رہ گیا کہ انہیں میرے متعلق کون بتا گیا ہے؟ایک درویش سے فرمایا،اس کی تلاشی لو،میں خود ہی بول پڑا کہ جناب ٹھیک کہتے ہیں میری جیب میں اس وقت بھی ساڑھے چار ہزار روپے ہیں اور فرمایا کہ تو اب بھی چوری کرنے کے لیے نکلا ہے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ایک ولی کامل کی بارگاہ میں میرے تمام منصوبے بے نقاب ہو چکے تھے۔میری پشیمانی دیکھ کر حضور جلال میں آگئے اور فرمایالا اپنا ہاتھ مجھے پکڑا پھر دیکھیں گے تو کیسے چوری کرتا ہے۔میں حضور کی بیعت سے مشرف ہوا پھر کیا تھا۔سب غلط کام چھوٹ گئے۔ایک وہ وقت تھا کہ میرے خلاف کوئی پرچہ تو نہیں۔تمام جرائم سے آزاد ہو گیا تھا گویا میری تمام فائلیں صاف ہو چکی تھیں۔حضور نے فرمایا راجہ اب کسی کے بچوں کو نہ رُلانا۔تجھے جس چیز کی ضرورت پڑے میری طرف منہ کر کے مجھے پکار لینا۔تیری ضرورت پوری ہوتی رہے گی۔بس آپ کی نگاہ کرم کی برکت تھی کہ میری زمین اتنی اچھی ہو گئی کہ اناج کے ڈھیر لگ جاتے اور کبھی بھی مال میں کمی نہ ہوئی۔وہ جو کبھی چور مشہور تھا۔آج میاں راجہ نول کے نام سے مشہور ہے۔نہایت صالح،متقی اور درویش منش آدمی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے۔

؎جانتا تھا کون سب بیداریاں

دور کر دیں تو نے سب بیماریاں[64]

اخلاقی تربیت:

اسلامی تصوف کی ابتداء تابعین اور تبع تابعین سے ہوتی ہے۔ انہوں نے مساجد کے ساتھ خانقاہیں تعمیر کیں۔ جہاں پر لوگوں کی تزکیۂ نفس، مجالس ذکر کے ذریعے اصلاح کی جاتی اور اخلاق و کردار کے عملی نمونوں کے ذریعے ان کی تربیت کی جاتی۔ اس ضمن میں عبدالمجید سندھی لکھتے ہیں:

> ''صوفیوں کے اخلاق میں حلم، تواضع، نصیحت، شفقت، برداشت اور موافقت، احسان، مدارات، ایثار، خدمت، الفت، بشاشت، فتوت (مردانگی)، کرم، بذل جاہ، مروت، تلطف، طلامت (کشادہ دلی سے ملنا)، سکون و قار مسلمانوں کے لیے اور زیادتی کرنے والوں کے لیے دعا کرنا، ان، کی تعریف کرنا اور ان سے حسنِ ظن رکھنا اور اپنے نفس کو چھوٹا سمجھنا، بھائیوں کی توقیر کرنا اور مشائخ کی تعظیم اور چھوٹوں بڑوں پر ترحم، جو کچھ کسی کو دے اگرچہ بہت ہو اس کو کم سمجھنا اور جو کچھ کسی سے لے اگرچہ وہ کم ہو اس کو زیادہ جاننا۔''(65)

اللہ کے بندے اپنے پاس بیٹھنے والوں کی ظاہری باطنی اصلاح کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ نہ صرف ان کے جسم کی ضروریات کا خیال کرتے ہیں بلکہ ان کی باطنی ضروریات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں بیٹھنے والوں کے دل میں اسوہ رسول ﷺ کو اپنانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی محبت کی بدولت وہ ان کے احوال و کردار کے پیروکار بنتے ہیں ۔ لوگ اپنی ظاہری حاجات کی خاطر حاضر ہوتے ہیں مگر اللہ کے ولی ان کی باطنی ضروریات کا اہتمام بھی فرمادیتے ہیں اوران کے مجلس کے بندے وہ اپنے خیالات اور کردار میں واضح تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔ اہل اللہ اپنے ہم نشینوں کو کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے سے لے کر باطنی خواہشات اور حتیٰ کہ دوست دشمن رکھنے کی بھی رہنمائی فرماتے ہیں لمحاتِ کرم سے ایک اقتباس دیکھیے:

> '' میں تم سب کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ ظاہر و باطن میں خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تھوڑا کھاؤ، کم سویا کرو اور تھوڑی باتیں کرو۔ گناہوں اور معاصی کو ترک کر دو۔ ہمیشہ روزے رکھا کرو، قیامِ شب کیا کرو۔ ہمیشہ کے لیے خواہشات کو ترک کر دو، لوگوں کا ظلم برداشت کرتے رہے، کمینے اور عام

لوگوں کی ہم نشینی ترک کر دو، صالحین اور بزرگوں سے صحبت رکھو اور لوگوں میں بہتر وہ شخص ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔"[66]

ان باتوں پر عمل پیرا ہونے والا فرد معاشرے کا ایک کار آمد اور مثبت کردار ثابت ہو گا۔ جس سے معاشرے اور سماج میں بھلائی اور محبت پروان چڑھے گی۔

روحانی تربیت:

روحانی تربیت کے لیے پہلے طبعی اور اخلاقی پہلوؤں کی اصلاح ضروری ہے اور اخلاقی تربیت اخلاق اللہ کو اپنانے سے حاصل ہوتی ہے۔ علم باطن کے متعلق حضرت سہیل بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ علم تین ہیں:

"ایک وہ علم ہے جو اللہ کی جانب سے ہو وہ علم ظاہر ہے۔ جیسا کہ امر و نہی اور احکام و حدود، دوسرا علم اللہ کے ساتھ ہے اور وہ خوف و رضا اور محبت و شوق اور تیسرا علم اللہ سے متعلق ہے اور وہ اس کے صفات اور اوصاف کا علم ہے۔"[67]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی انسانی صفات سے گزر کر خدا کی صفات میں داخل ہو جائے وہ اخلاق رزیلہ کو ترک کرتے ہوئے اخلاق حمیدہ کا پیکر بن جائے۔ یہ ارتقائے انسانی ہے جس کا اظہار اقبال بھی کرتے ہیں ان کے نزدیک انسان اپنے وجود کو فنا نہیں کرتا اور نہ اسے کرنا چاہیے بل کہ اسی خدائی صفات حاصل کر کے وہ مقام حاصل کرنا چاہیے کہ جہاں

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفرین، کار کشا، کارساز (اقبال)

روحانی بالیدگی کے لیے دنیاوی عوارض سے نکل کر خود کو اللہ کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ انہیں جسم کی بجائے روح پر توجہ دینا ہوتی ہے جیسا کہ قبلۂ عالم منگانویؒ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے دنیا سے محبت نہیں کرتے اللہ کی مخلوق سے شفقت سے پیش آتے ہیں وہ کم سوتے، کم کھاتے اور کم بولتے ہیں۔"[68]

ایک دوسرے مقام قبلۂ عالمؒ نے لفظ دنیا کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "مال، اولاد اور رشتہ دار دنیا نہیں ہیں بل کہ جو چیز تجھے اپنے رب سے غافل کر دے وہ دنیا ہے۔"(69)

ج۔ فنی و اسلوبی جائزہ

i. فنی پہلو:

فن سوانح نگاری ایک کٹھن اور نازک فن ہے۔ عمدہ سوانح نگاری کے لیے جہاں مصنف کا با اوصاف ہونا ضروری ہے وہاں سوانح نگار کا صاحبِ سوانح کے انتخاب میں بھی زیرک اور محتاط ہونا ضروری ہے۔ سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ ایسی شخصیات کا انتخاب کرے کے جن کی زندگی کے مطالعہ سے عملی تحریک پیدا ہو جیسا کہ ڈاکٹر محمد افتخار شفیع "اصناف نثر" میں تحریر کرتے ہیں:

> "سوانح عمری سمندری سفر میں رہ نمائی کرنے والے لائٹ ہاؤس کی طرح انسان کو اعلیٰ اور ارفع زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے ۔ایک عظیم شخصیت ایک ایسا مثالی کردار ہوتی ہے جس سے نسلوں کی اخلاقی تربیت کے سانچے ڈھلتے ہیں۔"(70)

شخصیت کا انتخاب:

شخصیت کے انتخاب میں یہ ضروری ہے کہ وہ شخصیت ایسی ہو کہ اس کی سوانح لکھی جا سکے ۔ایک طرف تو وہ نمایاں مقام کی حامل ہو تو دوسری طرف اس نے زندگی کے نشیب و فراز بھی دیکھے ہوں۔ فن کے لحاظ سے "سوانح عمری" لکھنا داستان اور ناول لکھنے سے کہیں زیادہ مشقت طلب کام ہے۔ کیوں کہ سوانح کے لیے منتخب شخصیت کے ساتھ انصاف کرنا ایک بار گراں ہے سوانح نگار کے لیے موضوع بنائی جانے والی شخصیت سے مکمل واقفیت اور دلچسپی رکھنا ضروری ہے ۔ہماری زیر تجزیہ کتاب "لمعاتِ قطب" ایک برگزیدہ اور پاک باز ہستی کی سوانح ہے جن کے کردار سے متاثر ہو کر لاکھوں انسانوں نے راہِ ہدایت پائی۔ "لمعاتِ قطب" حضرت سید قطب علی شاہ بخاری قادریؒ کی سوانح حیات ہے۔ جن کی

علمی عظمت کا اعتراف بڑے بڑے اہل علم کرتے ہیں مولانا حاجی ادریس بھوجیانی "ارباب طریقت اور علامہ عالم فقری" اولیاء اللہ میں لکھتے ہیں:

"آپ نے اکابر علماء سے تعلیم حاصل کر کے سَند پائی آپ ایک ہی وقت میں علامۃ الدہر، روحانیت میں بلند مقام، اعلیٰ مبلغ وخطیب، بلند پایہ مصنف بل کہ ہمہ صفت موصوف تھے۔"(71)

مزید علامہ عبدالحکیم شرف قادریؒ تذکرۃ اکابر اہلسنت میں لکھتے ہیں:

"قدوۃ السالکین حضرت مولانا سید قطب علی شاہ قدس سرہٗ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم و عارف تھے۔ آپ سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے۔ ظاہری علوم میں بھی باکمال تھے۔ آپ کے فضل وکمال پر آپ کی تصانیف شاہد عدل ہیں۔"(72)

عمدہ سوانح نگاری کی یہ خوبی ہے کہ وہ مداح نہیں ہوتی بل کہ منتخب شخصیت کے تمام اوصاف جن میں اس کی ذات کے نقائص بھی شامل ہوتے ہیں۔ اچھا سوانح نگار اپنے ہیرو کو کوئی غیر مرئی مخلوق بنا کر پیش نہیں کرتا بل کہ اس کے ہیرو کا کردار ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آتا ہے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری، حضرت قطب علی شاہ قادریؒ کی شخصیت کو اسی طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ ہمیں حقیقی کردار اور قابلِ تقلید شخصیت کے روپ دکھائی دیتے ہیں۔ "لمعاتِ قطب" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"آپؒ کی رعایا یا خدام و نوکروں سے کوئی ایسا فعل ناشائستہ یا قصور سادر ہوتا تو بجائے خشمگین و غضبناک ہونے کے رِفت و نرمی کے ساتھ اس طرح سمجھاتے کہ آپ کے سلوک بزرگانہ کو دیکھ دیکھ کر حلقہ بگوش قربان رہ جاتے۔"(73)

حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ ایک طرف صوفی بزرگ ہیں تو دوسری طرف علاقہ کے رئیس و جاگیر دار ہیں۔ سوانح نگار نے بڑی دیانت سے آپ کی شخصیت پیش کی۔ آپؒ کے حیات کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ آپ ایک عام بشر تھے مگر اپنی ریاضت اور محبت الٰہی سے سرشاری میں اعلیٰ مرتبہ پر فائز رہے اور زمانے کے لیے کردار کے ایسے نمونے

پیش کئے جن کو ایک عام آدمی بھی اپنی زندگی کا حصہ بنا کر اعلیٰ کردار اور منصب پا سکتا ہے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری لکھتے ہیں:

"ایک شخص مراد جلاہا" جو سندھیلانوالی میں رہتا تھا۔ ایک روز حضور قطبِ عالمؒ نے کسی آدمی کو بلانے کے لیے اسے بھیجا مگر وہ گھر آکر اپنے کام میں لگ گیا آپ نے کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اُس کا پتہ کروایا تو معلوم ہوا وہ گیا ہی نہیں، حضور نے اُسے طلب فرمایا اور ناراضگی میں ایک تھپڑ مار کر کہا اگر نہیں جانا تھا تو مجھے کہہ دیتا میں کوئی اور آدمی بھیج دیتا۔ وہ ندامت سے خاموش ہو کر واپس چلا گیا، حضور کو بعد میں افسوس ہوا کہ اسے تھپڑ نہیں مارنا چاہیے تھا لہذا حاضرینِ مجلس سے فرمایا "ہم سے غلطی سرزد ہوئی ہے آؤ مراد اسے معافی مانگ آئیں" اور اپنے رفقاء کے ساتھ اس کے گھر تشریف لے گئے۔ اُسے آپ کی آمد کا علم ہوا تو ڈر کے مارے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی لگالی کیونکہ حضور اپنے علاقہ کے بہت بڑے رئیس بھی تھے اور سندھیلیانوالی شریف میں اکثر لوگ آپ کی رعایا تھے۔ لوگوں نے اسے بہت کہا کہ باہر نکلو آپ کچھ نہیں کہیں گے مگر اُس نے دروازہ نہ کھولا۔ آخر بڑے اصرار سے باہر نکلا تو حضور کی ہیبت سے کانپ رہا تھا۔ آپ نے اُس سے معافی مانگی تب اسے تسلی ہوئی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پانچ روپے عطا فرمائے اور واپس تشریف لائے۔[74]

شخصیت کا ارتقاء:

سوانح نگاری میں جہاں اچھی سوانح عمری کے لیے شخصیت کا انتخاب اہم ہے۔ اسی طرح شخصیت کا ارتقاء میں بھی سوانح عمری میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک کامیاب سوانح عمری کے لیے ضروری ہے کہ صاحب سوانح کی زندگی وقت کے ساتھ ساتھ ارتقائی مراحل سے گزرتی ہوئی دکھائی دے۔ "لمحاتِ کرم" میں صاحب سوانح کی شخصیت بتدریج ابھرتی جاتی ہے جس سے قاری کے ذہن میں تقلید اور ان جیسا بننے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ لمحاتِ کرم سے ایک اقتباس دیکھیے:

"بڑے بڑے لڑکوں نے جو کھلاڑی بھی تھے میلہ پر جانے کا متفقہ فیصلہ کیا۔ دلمیر آرائیں، امیر نول عرف گڑانگ، احمد خان روہڑا اور حضورا بلوچ نے آپس میں دعائے خیر کر کے سب سے عہد لیا کہ ساری جماعت میلہ پر جائے گی۔ اپنی جماعت میں سب سے چھوٹے، جسمانی لحاظ سے کمزور اور اُستاد مکرم سے سب سے زیادہ ڈرنے والے بندہ اور حضرت قبلہ عالم منگانویؒ ہی تھے"۔(۷۵)

ایک طرف طالب علمی کا زمانہ ہے۔ بزم ادب میں پیش پیش ہیں۔ کھیلنے کودنے کی عمر ہے اور ساتھ ہی خدا کی طرف ایک بہت بڑے بوجھ کے لیے آپ کا انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ ویسے بھی تاریخ انسانی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جتنے بھی عظیم لوگ گزرے ہیں۔ بچپن سے ہی ان کو مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کندن بننے کے لیے آغاز عمر سے ہی وقت کی بھٹی میں جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پیر محمد طاہر حسین قادری لکھتے ہیں:

"دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے یوں کروٹ بدلی کہ وہ شہباز فقر و عشق جو چودہ آدمیوں کے کندھوں پر اپنا بوجھ ڈال کر فضاء میں اقبال علیہ الرحمت کے اشعار پڑھتا تھا۔ چند ہی روز بعد والد بزرگوار کے داغِ مفارقت دینے پر پورے آستانہ عالیہ اور اُس سے وابستہ عقیدت مندوں کا بوجھ اپنے نو عمر نازک کندھوں پر اُٹھانے کے لیے کمربستہ نظر آنے لگا"۔(۷۶)

حضرت پیر محمد کرم حسین قادریؒ کو اللہ تعالیٰ نے بھرپور جوانی میں اپنی معرفت اور محبت کا وہ اعلیٰ مقام عطا فرمایا کہ آپؒ نے چودہ سو سال بعد اس مادی دور میں حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کی یاد کو تازہ کر دیا۔ ان حیات مبارکہ کے واقعات پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ کردار کی پختگی دکھائی دیتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"چودہ سو سال بعد حضور قبلہ عالمؒ نے سنت صدیقی کا یوں احیاء کیا جب آپ کی شادی ہوئی تو سسرال کی طرف سے بہت کچھ سامان ملا حضور گھر میں تشریف لائے تو ہر طرف سامان بکھرا پڑا تھا فرمایا فقیر کا گھر اور اس قدر مال و دولت، لہذا جو کچھ مجھے سسرال کی طرف سے ملا ہے وہ اپنے پیر کے لنگر میں نذر کرتا ہوں پھر اپنی والدہ صاحبہ سے فرمایا میں نے تو اپنا سارا سامان لنگر کی نذر کر دیا ہے اب جو کچھ اپ کے پاس ہے وہ بھی کمروں سے باہر نکال دیں۔"(۷۷)

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ ہجرت سے نئے رشتے وجود میں آتے ہیں۔ نئے معانی اجاگر ہوتے ہیں اور صدیوں کا زنگ اتر جاتا ہے۔ حضرت قبلہ عالم منگانویؒ نے ہجرت کی سنت بھی ادا کی اور بلو آنہ تمام زمین جائیداد بھائیوں کے حوالے کر کے خود بے سر و ساماں منگانی شریف آ گئے۔ ایک شیشم کے درخت کے نیچے ڈیرہ لگایا اور جمعہ بھی درخت کے نیچے پڑھانا شروع کیا لیکن کسی کو کیا خبر تھی کہ ان کے قدموں کی برکت سے یہ جگہ علم و عرفان کا ایک مرکز بن جائے گی۔ ہجرت پر اللہ تعالیٰ نے بے شمار انعامات رکھے ہیں۔ آپ کی ہجرت سے بھی یہاں ایک نئی دنیا آباد ہو گئی۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

> "ہزار ہا روپے کی تعمیرات کیں سب کچھ بنایا لیکن ہجرت کے وقت سب کچھ بنایا لیکن ہجرت کے وقت سب کچھ چھوڑ کر فقط اپنے مولا کے آسرے پر نکل کھڑے ہوئے فوری ہجرت اس قدر ضروری اور مجبوری کے عالم میں ہوئی کہ پیر سخی حسین سکول گئے ہوئے تھے۔ ان کا بھی انتظار نہ کیا گھر آ کر میں میری والدہ صاحبہ کو فرمایا کہ میں جا رہا ہوں اب میرا یہاں رہنا محال ہے جلد ہی تمہارا بھی کوئی بندوبست کر کے تمہیں لے جاؤں گا۔"(۷۸)

تمام عمر ٹی بی کی بیماری کے ساتھ نبھا کیا لیکن طبعیت میں ذرا بھی تنگی اور تلخی نہ تھی۔ سب کی پریشانیاں اور تکالیف سنتے اور دعائیں دیتے ساری رات ذکر و فکر اور نوافل ادا کرتے گزارتے۔ آپؒ نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ آپؒ کی شخصیت انقلاب کا ایک استعارہ ہے۔ آپ کی سوانح کے مطالعہ سے نہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی محبت دل میں موجزن ہوتی ہے بلکہ انسان کاہلی اور سستی کو چھوڑ کر متحرک اور عملی زندگی گزارنے کی تحریک حاصل کرتا ہے۔ اپنے آخری وقت میں بھی انہوں نے جو اپنی اولاد کو وصیت فرمائی وہ قابل تقلید و تعریف ہے۔ جو ایک تصوف کی حقیقی تصویر پیش کرتی ہے اور نام نہاد صوفیوں اور مریدوں کی جیبوں پر نظر رکھنے والوں کے لیے سبق آموز بھی ہے۔

پیر محمد طاہر حسین قادری تحریر کرتے ہیں:

> "میرا دنیا سے رخصت ہونے کا وقت اب قریب ہے۔ کوئی امیر آدمی جب مرنے لگتا ہے تو وہ اپنے بیٹوں کو بلا کر انہیں بتاتا ہے کہ میں اپنے پیچھے اتنا کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی کمایا ہے تمہارے لیے کمایا ہے۔ یہ سب کچھ تمہارا ہے لیکن بیٹا میری پراپرٹی کیا ہے؟ سامنے حضور کا

مصلے اور لوٹا پڑا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ہماری یہی جائیداد ہے۔ ہم نے اسی سے کمایا ہے۔ میرے والد، میرے دادا، میرے پر دادا بلکہ ہماری نسل نے انہی چیزوں سے واسطہ رکھا ہے۔ اگر ان سے تعلق رکھو گے تو انہیں نہ چھوڑو گے تو پھر تم کامیاب ہو۔ کسی قسم کی پریشانی یا تکلیف نہ ہو گی۔ بھائی جان مزید فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ میں اور اخی قبلہ پیر محمد مظہر حسین صاحب دونوں حاضرِ خدمت تھے۔ ارشاد ہوا، کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا یا مانگنا بہت بری چیز ہے جو پیر کسی سے مانگتا ہے وہ کسی کو دے نہیں سکتا بلکہ وہ پیر ہی نہیں۔ اسکی پیری ختم ہے جو خود مانگتا ہے وہ بھلا کسی کو کیا دے گا۔"(۷۹)

واقعات کا انتخاب:

فن سوانح نگاری میں واقعات کے انتخاب سے مراد یہ ہے کہ ایسے واقعات کا چناؤ کیا جائے جو صاحب سوانح کی شخصیت پر روشنی ڈالیں اور اس کے کردار کو اجاگر کریں اگرچہ وہ واقعات عام ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک سوانح نگار کے لیے یہ کام ایک گھنے جنگل سے ایک پھولوں کا گلدستہ منتخب کرنے جیسا ہے۔ اسے ایسے پھولوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جس سے فرد کی شخصیت اور کردار کی خوشبو ہر طرف بکھرتی محسوس ہو۔ اس کو شخصیت کے بارے واقعات کی تلاش کے لیے ان تمام ذرائع تک رسائی حاصل کرنا پڑتی ہے جہاں سے اس کے بارے مواد اور معلومات فراہم ہو سکیں۔

ملک ربنواز تجلیاتِ کرم میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ جو دو حصوں میں بیان ہو گا۔ اس میں پہلے حصہ میں صاحب سوانح کی شخصیت کے دو پہلو ہمارے سامنے پیش کئے گئے ہیں ایک اللہ اپنے بندوں پر اپنے راز افشاں کرتا ہے اور یہ ان کے قرب کی علامت ہوتی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ معمولات میں علمی مجالس کا کس قدر باقاعدگی سے اہتمام کرتے۔ ایک وقت مقررہ پر لوگوں کی تربیت کے لیے علمی مجلس کا انتظام ہوتا۔

واقعہ کچھ یوں ہے:'

"ایک دفعہ دربار شریف پر حاضری کا پروگرام بنا تو ہماری جامع مسجد کے پیش امام حاجی فیض علی صاحب بھی تیار ہو گئے۔ ہم براستہ سرگودھا و ساہیوال جھنگ بوقت عرص پہنچے۔ نمازِ عصر بلو آنہ

شریف میں باجماعت ادا کی پھر مسجد کے اندر ہی حضور قبلۂ عالمؒ نے کتاب فیض سبحانی (تصنیف حضور غوث الوریٰ محبوبِ سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی) سے وعظ و نصیحت فرمائی جس سے بڑا ہی قلبی سکون میسر آیا۔ جب مجلس برخواست ہوئی تو حضور قبلۂ عالمؒ نے اٹھتے اٹھتے فرمایا بھئی مسجد کے صحن سے صفیں لپیٹ کر اندر رکھ دو بارش سے خراب نہ ہو جائیں جلدی کرو۔ ہم سب کے دماغ میں گیا کہ موسم تو بالکل صاف ہے بارش کا تو دور دور تک نام و نشان یا آثار تک نہیں لگتے مگر حضور قبلۂ عالمؒ فرمارہے ہیں جلدی جلدی صفیں لپیٹ کر اندر رکھ دو بارش آنے والی ہے۔ پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ حاجی فیض علی صاحب نے خصوصاً آسمانی کی طرف دیکھ کر کہا کہ آسمان تو بالکل صاف ہے۔ ابھی تقریباً پندرہ، بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دم آسمان پر بادل چھا گئے اور مغرب کی اذان سے پہلے بارش ہونے لگی۔ اس وقت حاجی صاحب نے کہا کہ فقیر کی نگاہ سے کچھ چھپا نہیں ہوتا کیونکہ وہ اللہ کے عطا کردہ نور سے دیکھتا ہے۔ بارش دیکھ کر سب خوش ہوئے کیونکہ گرمی کا موسم تھا اور حیرت کا اظہار کیا۔"[۸۰]

واقعہ کے دوسرے حصے میں بتایا گیا کہ اولیاء اللہ کس طرح دوسرے علماء، اولیاء کا اکرام کرتے ہیں۔ ان کے دل کس طرح کبر و کینہ اور حسد سے پاک و صاف ہوتے ہیں۔ بندہ ان کے سامنے گولڑہ شریف کا نام لیتا ہے تو وہ تمام شیوخ کا محبت سے تذکرہ اور تعریف کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

"رات وہاں ہی قیام نصیب ہوا۔ حاجی صاحب نے بیعت ہونے کے لیے درخواست کی اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ میرے پیارے مرشد کریم نے پوچھا آپ پہلے کہاں مرید ہیں۔ عرض کرنے لگے گولڑہ شریف مرید ہوں۔ حضور سائیں خوش ہوئے۔ پیرانِ گولڑہ (حضرت پیر مہر علی شاہ اور حضور بابو جیؒ) کی بہت تعریف فرمائی۔ میرے شیخ ہمیشہ دوسرے شیوخ اور بزرگان کی تعریف و توصیف فرماتے تھے۔ آپ کی نگاہِ محبت و مؤدت آسمان سے بلند اور ظرف و حوصلہ پہاڑ سے بڑا تھا۔ ولی دوسرے ولی کا دوست ہوتا ہے کیونکہ دونوں اللہ کے دوست ہوتے ہیں"۔[۸۱]

نیکی کی طرف دل کا جھکاؤ اور مائل ہونا ظاہر کرتا ہے کہ انسانی فطرت اور طبیعت کا رجحان کس طرف ہے۔ بظاہر وہ اس چیز کے پیچھے نہیں ہوتے مگر جب وہ اسے دیکھتے ہیں تو پا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے ہر دل نہیں بنا وہ جسے چاہے اپنا قرب اور شناسائی عطا فرمادے لیکن انسان کا رویہ اور چلن اس کے طبعی رجحان کا عکاس ہوتا ہے۔ میاں اللہ یار جاتے کسی اور کام سے ہیں مگر جب اللہ تعالیٰ کا حق راستہ نظر آتا ہے تو اس بلا تردد چل پڑتے ہیں۔ میاں فیاض النصیر لکھتے ہیں:

"واقعہ کچھ یوں ہے۔ حضرت پیر سید چراغ علی شاہؒ (پیر و مرشد محلوی سرکارؒ) کا سالانہ عرس مبارک موضع میرک شریف تحصیل شور کوٹ ضلع جھنگ بڑی دھوم دھام سے شروع تھا۔ آپ کے مرید خاص حضرت سید قطب علی شاہؒ ساکن سندیلیانوالی شریف اپنے مرشد پاک کے عرس مبارک کی حاضری کے لیے تشریف فرماتھے دیگر مریدین اور علاقہ کے لوگ بھی حاضر تھے۔"(۸۲)

مزید لکھتے ہیں:

عرس مبارک کی رونق سے لطف اندوز ہونے کے لیے میاں اللہ یار بھی تشریف فرما تھے۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک ۲۲ سال تھی۔ عین عالم شباب تھا میاں صاحب کا ایک خاص غلام جس کا نام میاں حاجی قوم جھتہ جو کہ آپ کے ہمراہ تھا اس نے عرض کی کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنے مرشد پاک محلوی سرکارؒ کی حاضری دے آؤں جو کہ یہاں تشریف فرما ہیں۔ اس کی بات سن کر آپ نے فرمایا! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ میاں حاجی کے ہمراہ قبلہ پیر صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے مودبانہ سلام عرض کیا اور زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپؒ پر قبلہ پیر صاحب کے علم و عرفان کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ ان کے مرید ہو گئے۔"(۸۳)

حسنِ ترتیب:

سوانح کسی بھی شخص یا فرد کی مکمل داستان حیات ہے اس لیے صاحب سوانح کے مکمل حالات اور اس سے متعلقہ تمام تحقیقی مواد جمع کرنے کے بعد اسے ترتیب دینا چاہیے تاکہ پیدائش سے وفات تک کے تمام حالات واقعات اور

کارنامے قاری پر کھل کر سامنے آجائیں۔ ایک سوانح کے حسن ترتیب میں حسن کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تاریخ، فرد واحد اور ادبی چاشنی ترتیب کے ساتھ موجود ہو۔ ایک اچھے سوانح نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ ہیرو کے ذہن تک رسائی حاصل کر کے اس کی ذہنی الجھنوں کو ٹٹولنے کے بعد اسے دیانت داری اور بے باکی سے پیش کرے۔ ایک اچھی سوانح کی بنیاد فنی ترتیب و تنظیم ہے۔

"حافظ الکرم" کی ترتیب اس حسن سے دی گئی ہے کہ پہلے تاریخی پس، منظر میں صاحب سوانح کے آباؤ اجداد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آپ کی ولادت، تعلیم و تربیت اور جوانی کے دور میں آپ کے اشغال کا تذکرہ ملتا ہے۔ کس طرح آپ کبڈی کے کھلاڑی سے راہِ طریقت کے پہلوان اور راہِ معرفت کے شہباز بن کر پرواز کرتے ہیں۔ اس راہ میں کیسے کیسے مصائب اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ راہِ فقر میں قرب الٰہی کی خاطر کیے جانے والے مجاہدات کا بیان ملتا ہے۔ بیعت و خلافت کے بعد راہِ وفا میں کیسے کیسے مسائل اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یارانِ طریقت کی طرف سے کیا کیا رقابتیں اور رکاوٹیں پیش کی جاتی ہیں لیکن آپ کس طرح صبر و استقامت اور عزم و ہمت کے ساتھ اس راہ پر قائم رہتے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> "ایک طویل عرصہ تک آزمائش کا یہ سلسلہ جو در حقیقت آپ کی روحانی تربیت کے لیے ضروری تھا چلتا رہا لیکن حضرت خواجہ کے اخلاص میں کبھی فرق نہ آیا۔ آپ پر جس قدر آزمائش کے دَر کھلے اسی قدر ثابت قدمی آپ کا شعار اور شیوہ رہا۔ سو میل پیدل سفر طے کر کے دہڑ شریف پہنچتے تو بطور آزمائش حضرت دہڑویؒ کا دُرویشوں کو حکم ہوتا۔ حافظ صاحب کو دربار کے اندر نہیں آنے دینا باہر سے نکال دینا۔ وہی ہوتا ہے کہ ہفتہ، عشرہ بھوکے، پیاسے دربار شیخ کے باہر بیٹھے رہتے۔ اندر آنا منع تھا۔ دہڑ شریف گاؤں کے رہنے والے لوگ اظہارِ ہمدردی کے لیے آتے کچھ دلجوئی کرتے کچھ طعنہ زنی کرتے کہ اتنا سفر طے کر کے آتے ہو اور آگے دربار شریف میں تمہیں جانے کوئی نہیں دیتا۔ خوبصورت ہو، نوجوان ہو، حافظ ہو، عالم ہو تمہیں اتنے طویل راستہ میں کوئی اور پیر نظر نہیں آتا صرف یہی پیر ملا ہے جو تم سے اس طرح پیش آتا ہے؟ طرح طرح کی باتیں کرتے۔ حضرت خواجہ فرماتے پیر تو راستے میں بہت ملتے ہیں مگر اس جیسا کوئی نہیں۔"(۸۴)

بارگاہِ شیخ سے حکم ملتا ہے کہ اپنے آبائی شہر میانوالی کو چھوڑ کر جھنگ ہجرت کر آؤ۔ آپ بے سروسامانی میں اللہ تعالیٰ کے دین کی ترویج واشاعت کے لیے جھنگ میں ڈیرہ لگا لیتے ہیں۔ بلوآنہ کی سرزمین پر آس پاس کے ساتھ بلوچوں کے بے راہ اور چور ڈاکو سے بھرے ہوئے دیہاتوں کو اللہ کے ذکر سے آپ نے راہِ ہدایت پر چلانے کے لیے سر توڑ محنت کی۔ آپ کی کوششوں سے بڑے بڑے راہ زن دوسروں کو راہِ ہدایت بتانے والے بن گئے۔ اس کے بعد مصنف نے آپ کے زندگی کے آخری دس سالوں کا احاطہ کیا ہے۔ اگلے باب میں آپ کے اشغال واعمال اور شمائل وفضائل کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ بعد ازاں حالات وصال بیان کئے جاتے ہیں۔ ان لمحات میں بھی ہیرو کی زندگی سے ایک تحریک ملتی ہے۔ عشق و محبت کی، دائم عمل کی اور راسخ عقیدہ کی۔ آپ کے وصال کا تذکرہ کرتے ہوئے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری تحریر کرتے ہیں:

> "آپ نے فرمایا مجھے چارپائی سے نیچے مصلی پر بٹھاؤ۔ جب بٹھایا گیا تو آپ نے بارہ رکعت نمازِ تہجد اشاروں سے ادا فرمایا۔ یہ سارا منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا پھر فرمایا مجھے اُٹھا کر باہر لے جاؤ۔ میاں اللہ جوایا نے آپ کو اٹھالیا اور بھی چار دُرویش موجود تھے رات کا پچھلا پہر اور دسمبر کی سخت سردی تھی۔ اذان کا وقت قریب تھا جونہی دروازے سے باہر تشریف لائے اشارہ فرمایا میری ٹانگیں پیچھے کرو اور چہرہ اس طرف کرو (حضور کا اشارہ دہڑ شریف کی طرف تھا) اُسی طرح اُٹھائے ہوئے رُخِ مبارک دہڑ شریف کی طرف کیا گیا تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ماتھے پر رکھا اور اپنے سَر کو جھکا لیا یعنی اپنے شیخ کامل کی طرف منہ کر کے عشق وشوق بھرا آخری سلام پیش کیا پھر ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی۔ ہم نے بھی ساتھ دُعا مانگی واللہ اعلم۔ آپ کا۔ آپ کیا پڑھتے رہے، خاموش رہے۔ اس کے بعد آپ بولے نہیں پھر اشارہ فرمایا مجھے بستر پر لٹادو۔ جب پلنگ مبارک پر لٹایا گیا تو شیخ احمد لانگری نے پکار کر کہا حضور کے سرِ انور سے سرہانہ نکال لو۔"(۸۵)

آگے چل کر مصنف آپ کے علمی وادبی کارہائے نمایاں بیان کرتا ہے۔ جن میں آپ کے منظومات، مکتوبات اور ملفوظات شامل کئے گئے ہیں۔ آئندہ ابواب میں پہلے آپ کی سجادہ نشینان اور اقرباء واولاد کا ذکر خیر کیا گیا ہے۔ ایک باب آپ کے معاصرین پر قائم کیا گیا ہے جو اس کتاب کی اہمیت اور وقعت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ معاصرین کرام کے ذکر سے اس

دور کے تفصیلی حالات اور تاریخ کا زیادہ ادراک حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد خلفاء و متوسلین کے عنوان سے باب باندھا گیا ہے اور آخر میں کرامات حافظیہؒ کے نام سے باب شامل کتاب ہے۔ جس ترتیب کے لحاظ سے کتاب "حافظ الکرم" ایک عمدہ سوانح میں شامل کی جاسکتی ہے کیوں کہ واقعات کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ صاحب سوانح کی ظاہری اور باطنی زندگی اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کی جدوجہد دیکھ کر ان کے کردار اور اوصاف کی ایک واضح تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

ii. اسلوبی پہلو:

اسلوب نگارش:

اسلوب کے لغوی معنی انداز، طرز، ترتیب، سلیقہ، اور انداز نگارش کے ہیں۔ انگریزی میں اس کے متبادل لفظ اسٹائل مستعمل ہے۔ ہر لکھاری کا طرز تحریر، الفاظ و ترکیب کا استعمال اور زبان و بیان کے اظہار کا طریقہ الگ اور منفرد ہوتا ہے۔ ادبی اصطلاح میں یہ ہی طریقہ یا طرز "اسلوب" کہلاتا ہے۔ ابولاعجاز حفیظ صدیقی اسلوب کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> "اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت (انفرادی خصوصیات) کے شمول سے وجود میں آتا ہے اور چونکہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتاد طبع، فلسفہ حیات اور طرز فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔"(۸۶)

اسلوب مصنف کی شخصیت اور خصائص کا اظہار کرتا ہے۔ اسلوب سے نہ صرف قاری لکھنے والے سے شناسا ہوتا ہے بلکہ وہ اس کے شعور اور تحت شعور میں کارفرما جذبات سے بھی آشنائی حاصل کرتا ہے کیوں کہ لکھنے والا اپنے طرز تحریر سے اپنے خیالات و نظریات کو پیش کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

"یہ خیالات و نظریات در حقیقت لکھنے والے کے جذباتی اور ذہنی تجربات کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ان تجربات کو مناسب اور متناسب الفاظ کے استعمال کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کرتا ہے کہ اس میں اظہار و ابلاغ کے ساتھ حسن و جمال کی اقدار نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ جب اسلوب کی تخلیق کا عمل اس کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔تب اس میں وہ صورت پیدا ہوتی ہے ۔جس کو بعض نقادوں نے chrystallisation کے عمل کا نام دیا ہے۔"(۸۷)

ایک عمدہ سوانح نگار کے لیے زبان و بیان اور اسلوب کا خیال رکھنا ضروری ہے کیوں کہ زبان و بیان اور اس کا اسلوب اپنی تمام تر خصوصیات سے ہی ایک سوانح کو ادب کا درجہ بخشتا ہے۔ اب ہم سلسلہ قطبیہ کی سوانح عمریوں کا اسلوبیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔

لمعاتِ قطب کا اسلوبی مطالعہ: سوانح نگار اور سوانح کی موضوع شخصیت کا تعلق گروہ صوفیہ سے ہے۔ اس لیے تحمل و بردباری، سادگی و نفاست، اخلاق و مروت اور انسان دوستی جیسی خصوصیات شخصیت کا خاصا ہیں لہذا اسلوب نگارش میں بھی سادگی، سلاست، روانی، ٹھہراؤ اور ادبی رنگوں کی آمیزش نظر آتی ہے کیوں کہ سوانح کا تعلق سائنس، منطق، ریاضی اور طب سے نہیں بل کہ ادب سے ہے اور دوسری طرف تاریخی عمل کی وجہ سے سوانح میں بوریت کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے لہذا سوانح نگار کو ادبی لطافت اور چاشنی تحریر میں شامل کرنا پڑتی ہے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری سوانح نگاری کے اصولوں سے کماحقہ واقف نظر آتے ہیں کیوں کہ ان کی تحریر کردہ سوانح کا مطالعہ کرنے سے الفاظ کی شیرینی اور اسلوب کی چاشنی قلب و نظر میں رس گھولتی جاتی ہے اور کتاب بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے کسی لمحہ بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ واقعات کا ربط ان میں اور حسن پیدا کرتا ہے۔ قاری کو کتاب کے مطالعہ کے دوران روانی میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ جس سے دلچسپی قائم رہتی ہے۔اس کتاب کے طرزِ تحریر پر اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر معین نظامی لکھتے ہیں:

"کبھی کبھی مدت کے بعد کچھ پرانے الفاظ سامنے آجاتے ہیں تو وہی حال ہوتا ہے جو بچپن کے کسی گم شدہ بے تکلف دوست سے اچانک مل کر ہوتا ہے ان دنوں اپنے ایک عزیز دوست پیر محمد طاہر حسین قادری صاحب کی تالیف لطیف "لمعاتِ قطب" پڑھتا رہا جو پنجاب کی ایک عظیم قاری خانقاہ اور اس کے ذیلی مشائخ اور روحانی مراکز کی عمدہ محققانہ تاریخ ہے۔ قاری خانوادے سے خصوصی ارادت اس خانقاہ اور اس کے بعض فیض یافتہ بزرگوں سے پرانی عقیدت اور مصنف سے گہرے تعلق خاطر کے علاوہ جن خصوصیات نے تقریباً پانچ سو صفحات کی اس ضخیم علمی، ادبی اور روحانی دستاویز کے مسلسل مطالعہ میں کشش قائم کئے رکھی وہ اس کے عرفانی مطالب، ادبی، لسانی چاشنی، سادگی، مختلف زبانوں کے اشعار کے عمدہ استعمال اور کئی بزرگوں کے نایاب پنجابی کلام سے عبارت ہیں۔"(۸۸)

ا. سوانح حیات حضرت سید محمد نواز شاہ قادری اسلوبیاتی مطالعہ:

مصنف کتاب سید عبد القادر نے اپنے اسلوب کو مختصر، سادہ اور آسان عبارت سے مزین کرکے جاذب بنایا ہے۔ سہل املاہونے کی وجہ سے عام قاری کے لیے قرآت بہت آسان ہے اور اس کے فہم کے لیے بھی آسان ہے ۔ چھوٹے چھوٹے جملے ان کے اسلوب کی خوبی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اسلوب سے ابلاغ کی بھرپور کوشش کی ہے۔ زندگی کے عام واقعات سے صاحب سوانح کی خاص صفات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ مصنف کی منتخب کردہ شخصیت کی سادگی ان کی تحریر میں اتر آئی ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں ان کے اوصاف کو سادہ پیرائے میں بیان کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ انہوں نے بوجھل الفاظ، تشبیہ و استعارہ اور ثقیل مرکبات کے استعمال سے گریز کرکے اپنی عبارت کو لطیف بنایا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"کبھی نماز کی امامت آپ خود کرتے اور کبھی آپ کے چھوٹے بھائی سید محمد ظفر قادری کیا کرتے تھے۔ یوں گھر کے اندر نماز و نیکی کی ایک تربیت جاری رہتی تھی۔ یہ اسی تربیتِ شیخ کی برکت کا نتیجہ ہے کہ حرم شریف کے اندر آج بھی نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے اور باقاعدگی سے قرآن پاک کی تلاوت ہوتی ہے۔"(۸۹)

۲. لمحاتِ کرم کا اسلوبیاتی مطالعہ:

یہ کتاب حضرت خواجہ پیر محمد کرم حسین قادریؒ کی داستانِ حیات ہے۔ اس کتاب کو کل اکیس (۲۱) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی زبان سادہ، عام فہم، روانی و سلاست کے ساتھ ساتھ برجستگی کی حامل ہے۔ سادہ بیانی کے ساتھ قرآن و حدیث کے حوالہ جات اسے اور قابلِ فہم بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ اس کی دلچسپی کا ایک غالب عنصر اشعار کا بر محل استعمال ہے۔ اشعار کی تضمین سے اس سوانح کی دلچسپی اور جاذبیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ مصنف کے اسلوب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ واقعات میں تکرار نہیں پائی جاتی۔ ہر واقعہ اپنی منطقی ترتیب پر موجود ہے۔ صوفیہ کی مجالس میں بیٹھنے والے کیوں کہ سادہ لوح انسان ہوتے ہیں لہذا ان کے سمجھانے کے لیے تمثیل ضروری ہوتی ہے۔

صاحب سوانح اور سوانح نگار دونوں کا تعلق گروہ صوفیہ سے ہے اس لیے اس کتاب کی نمایاں خوبی تمثیل نگاری ہے۔ ہمیشہ سامعین کو مثال سے بات کی گہری الجھن کو بھی آسان بنا دیتے ہیں۔ لمحاتِ کرم سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ایک دفعہ راقم السطور حاضر ہوا تو حضور قبلہ عالمؒ اپنے حجرہ میں اکیلے ہی تکیہ پر سرِ انور جھکائے جلوہ افروز تھے۔ کچھ دیر بعد سرِ انور اٹھا کر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا بیٹا! میری ایک بات یاد رکھنا پھر اپنی زبان مبارک کو دہن سے باہر نکالا اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اور انگوٹھے سے پکڑ لیا بعد ازاں چھوڑ کر فرمایا بہشت میں بھی یہی زبان لے جاتی ہے ارو دوزخ میں بھی۔ زندگی بھر اپنی زبان کی حفاظت کرنا یہ ایک ہی لفظ سے محرم کو مجرم بنا دیتی ہے۔"(۹۰)

اکثر مقامات پر مرکبات کا استعمال کرتے ہیں جس سے عبارت میں دوچند حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں تاکیدی جملوں کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔

۳. سراجِ منیر کا اسلوبیاتی مطالعہ:

"سراج منیر" کتاب کے مصنف خواجہ محمد قمر الدین قادری ہیں انہوں نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول حصہ میں مطالب توحید و رسالت اور متصوفانہ نکات بیان کئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں خواجہ محمد سراج الدین

قادری کی سوانح تالیف کی ہے آپ کی تحریر میں عالمانہ رنگ غالب ہے۔عبارات میں قرآن وحدیث کے حوالہ کی بھرمار ہے۔کتاب کا مجموعی طرز ادبی سے سے زیادہ مذہبی ہے۔ تاہم مصنف نے مشکل پسندی سے کام نہیں لیا۔ جس کی وجہ سے قاری بوجھل پن کا شکار نہیں ہوتا بل کہ دلچسپی کا عنصر پیدا کرنے کے لیے مصنف نے اشعار اور حکایات کا بر موقع خوبصورت استعمال کیا ہے۔جملوں کی بناوٹ اور ساخت سادہ ہے۔ تحریر میں روانی کا عنصر موجود ہے۔ محمد انوار حسین قادری لکھتے ہیں:

> "آپ نے مدلل بالا آیات و لاحادیث اور ملفوظات طیباتِ بزرگان دین اور بالمثال حکایات کو موقع و محل کے مطابق اپنے موضوع کے حوالہ سے احاطۂ تحریر میں لانے کا حق ادا کیا ہے اور پھر طرہ یہ کہ اشعار کی بر محل موزونیت، خواجہ صاحب کے حسن ذوق اور بلندئ خیال اور سخن دلنواز کی غمازی کرتی ہے۔"(۹۱)

۴. تجلیاتِ کرم کا اسلوبیاتی مطالعہ:

"تجلیاتِ کرم" آسان اور عام فہم پیرائے میں تحریر کی گئی سوانح ہے۔ مصنف کا اسلوب سلیس، رواں ہے۔ عام پیرائے میں بڑے بڑے دقیق مسائل کو پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ کہیں کہیں واقعات کی تکرار موجود ہے مگر موقع کی مناسبت سے بوریت کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ بہ قول ڈاکٹر حافظ محمد سہل شفیق موقع و محل کی مناسبت سے کئی مقامات پر علمی مسائل پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بہت جامع اور مدلل گفتگو ہے اس پر مستزاد فاضل تذکرہ نگار کا دل کش اسلوب اور خوبصورت انداز بیان ہے۔ مصنف کے اسلوب کے بارے جبار مرزایوں رقم طراز ہیں:

> "ملک محمد ربنواز قادری کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔انہوں نے زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس مہارت سے مبلغانہ انداز میں تحریر کیا ہے کہ بڑے بڑے مسئلوں کا حل تلاش کرنا چنداں ناممکن نہیں رہا۔"(۹۲)

۵. حافظ الکرم کا اسلوبیاتی مطالعہ:

"حافظ الکرم" کے مصنف نے طویل، ثقیل اور بوجھل الفاظ اور جملوں کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے سادہ اور مختصر جملے برتے ہیں۔اس اختصار و ایجاز کی وجہ سے تحریر میں جامعیت پیدا ہوئی ہے۔ تشبیہات اور تمثیل آپ کی تحریر کو اور بھی پر کشش بناتی ہے۔ بعض جگہ پر ندائیہ طرز تحریر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہیں کہیں تلمیحات کا استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس سے عبارت میں اثر انگیزی اور فکر انگیزی بڑھ جاتی ہے۔ آپ کے اسلوب میں دیگر خوبیوں کے علاوہ واقعہ نگاری اور حقیقت نگاری بھی نمایاں طور پر موجود ہیں۔ مرکبات اور ہم آواز الفاظ کے استعمال سے تحریر میں دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "آپ وعظ و تقریر میں روایتی انداز کے برعکس اپنے اندر جذب و مستی اور رموزِ عشق کا ایسا منفرد انداز رکھتے جس کی نظیر دور دور تک نہیں ملتی تھی۔ جب وعظ فرماتے تو کسی کو اپنے تن، من، دھن کی خبر نہ رہتی۔ محفل میں ٹھہر ٹھہر کر اور پست آواز میں کلام کرتے مگر وعظ و تقریر پر جوش اور بلند آواز میں کرتے۔"(۹۳)

آپ کی تحریر ایسا جادوئی اثر رکھتی ہے کہ قاری کو اپنی گرویدہ بنا لیتی ہے۔ دلچسپی کا عنصر ان کا شیریں اور میٹھا لہجہ ہے جو الفاظ کی صورت میں رگ و جاں میں رس گھولتا ہے۔ڈاکٹر محسن مگھیانہ اپنے ایک مضمون میں کچھ ان الفاظ میں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> "یہی تاثیر ان کی تحریر کردہ کتاب "حافظ الکرم" میں پائی جاتی ہے کہ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دریں اثناء اُن کی تحریر میں روانی اور سلاست ہے۔ جس سے عام قاری بھی آسانی سے تحریر کو اپنے دل و دماغ میں جذب کر لیتا ہے۔ یہ کتاب "حافظ الکرم" حضرت خواجہ حافظ گل محمد قطبی قادریؒ (۱۹۱۴ء، ۱۹۵۴ء) کی سوانح حیات ہے۔ جسے آپ نے تحریر کیا ہے لگتا ہے کہ موتی پرو دیئے ہیں اور ان موتیوں کی چمک قاری کی نظروں کو خیرہ کرتی ہے۔ اور ہر لفظ شہد کی سی مٹھاس لیے ہوئے ہے۔"(۹۴)

شعری تمثیل بحوالہ لمحاتِ کرم:

سوانح کا تعلق تاریخ سے ہے اس لیے بعض سوانح بوریت اور بوجھل پن کا شکار ہو جاتی ہیں۔ لمحاتِ کرم کا یہ وصف ہے کہ اس میں خوبصورت شعری تمثیل سے ہر واقعہ کا حسن اور معنوی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضور قبلہ عالم منگانویؒ جب ذرا چلنے پھرنے لگے تو گھر میں جو کپڑا ملتا کندھوں پہ رکھ لیتے اور کبھی کبھی اس میں روٹی بھی باندھ لیتے اور گھر سے باہر چل پڑتے۔ جب دادی اماں اور والدہ ماجدہ پیار بھرے انداز میں پوچھتیں "کرم الٰہی" کہاں جا رہے ہو؟ تو اپنی من موہنی آواز سے قلی محبت میں جواب دیتے "دہڑ شریف جا رہا ہوں" دادی اماں اور والدہ ماجدہ مسکرا دیتیں لیکن والد ماجد یہ الفاظ سنتے تو خوشی و انبساط سے آنکھیں نم ہو جاتیں۔ شعری حوالہ دیتے ہیں:

چمن میں پھول کا کھلنا تو کوئی بات نہیں

زہے وہ پھول جو گلشن بنائے صحرا کو[۹۵]

ایک دفعہ حضرت سید سردار علی شاہؒ کو عرض کیا کہ حضور میرا تصور شیخ نہیں پکتا میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ آپؒ نے فرمایا تیرا وضو ہے؟ میرے منہ سے نکل گیا جی ہے تو آپؒ نے فرمایا میری طرف دیکھو۔ جب میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپؒ نے ایسی توجہ فرمائی کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آیا تو میں حضور کی گود میں تھا وہ پیار فرماتے اور کہتے تمہارا تو وضو بھی نہ تھا میں نے عرض کی حضور یاد نہیں رہا تھا۔ حضور قبلہ عالمؒ منگانویؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے تصور شیخ پکانے کی ضرورت نہ رہی۔ ادھر آنکھ بند کی ادھر جمال یار سامنے ہے۔

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی[۹۶]

لمحاتِ کرم کے صفحات کو اگر اس میں موجود اشعار پر تقسیم کریں تو اشعار کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ ایک موقعہ پر جب حضرت اقدس دہڑویؒ کی محفل میں حضرت حافظ پاکؒ کا ذکر ہوتا تو حضور کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے اور فرماتے "وہ میرا یار تھا"

مجھے دعویٰ نہیں تنہا نبھائی دوستی ہم نے

محبت کو سنبھالا ہے کبھی ہم نے کبھی تم نے[۹۷]

اپنی تمام تر رفعتوں کے باوجود سنت و شریعت و مطہرہ کے مطابق اس ظاہری عمرہ و زیارت والے عمل کو بھی پورا فرمانا چاہتے تھے تاکہ ظاہری اور باطنی طور پر اپنے آقا ﷺ کی سنت پوری ہو جائے۔ جو کہ حضور نے اپنی ناساز طبیعت کے باوجود بڑے ذوق و شوق سے جرات و ہمت سے ادا فرمائی اور غلاموں کو یہ سبق دے گئے۔ بقول اقبال

تیرا نقش پائے اقدس جو ملے تو سر پہ رکھ لوں

کہ میرے لیے تو آقا یہ ہی تاج خسروی ہے

تیرا عشق جان ایمان، تیری یادوں کی تسکین

تیرا غم رہے سلامت، یہی اصل زندگی ہے[۹۸]

پیر محمد طاہر حسین بیان کرتے ہیں کہ:

بابا میاں غلام رسول مستری کا انتقال ہوا تو میں، پیر شفیع اور قبلہ بھائی پیر محمد مظہر حسین قادری پاس تھے۔ حضور قبلہ عالم منگانویؒ نے فرمایا انہیں ایسے ایسے غسل دو۔ خیال رہے کہ میت کو تکلیف نہ ہو۔ قمیض پھاڑ کر اتارنے کا حکم فرمایا کہ اتارنے میں آسانی ہوتی ہے۔ جب انہیں غسل دے چکے تو فرمایا میں نے اپنی موجودگی میں اس لیے غسل دلوایا اور تمہیں سمجھاتا رہا کہ میرے انتقال کے بعد تم لوگ مجھے بھی اسی طرح غسل دینا۔

مجھے سب قبول فلک مگر غم یار مجھ سے طلب نہ کر

اسے کیسے دل سے جدا کروں میری عمر بھر کی تلاش ہے[۹۹]

معتدل اظہار:

سوانح نگاری کے اصولوں کو اگر دیکھا جائے تو ان کا معتدل اظہار ایک اہم وصف ہے۔ جس کی اصل ایمان داری اور غیر جانب داری ہیں کیوں کہ سوانح نگاری کے جو معیار مقرر کئے گئے ہیں ان کے مطابق سوانح نگار کا فکری زاویہ اور سوانح متوازن ہونے چاہیے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سوانح نگار کو صاحب سوانح کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو سامنے لانا چاہیے لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جو واقعات قابل اعتنا ہوں ان سے ہر طور اعراض کرنا چاہیے۔ مختصر اور جامع تحریر نہ صرف متوازن ہو گی بل کہ غیر ضروری طوالت سے بچنے میں بھی اہم کردار ادا کرے گی۔ کتاب کو مناسب ابواب میں تقسیم کرنا اور واقعات کی ترتیب کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔

"حافظ الکرم" کو بہ طور سوانح دیکھیں تو اس کی ترتیب اور ابواب بندی میں ایک تناسب موجود ہے۔ اگر سوانح نگاری کے مقرر معیارات کے مطابق دیکھنے کی کوشش کی جائے تو مصنف نے اعتدال سے کام لیتے ہوئے نہ تو حالات و واقعات کے بیان میں کسی قسم کی پردہ پوشی کی ہے نہ ہی کسی کو بے جا تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ پیر محمد طاہر حسین حنفی القادری نے سوانح نگاری کے اصولوں کو اس کتاب میں کماحقہ پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حافظ الکرم سے ایک اقتباس دیکھیے:

> "سلطان محمود گاڈی نے عرض کی حضور! ہمارے پاس تو مال مویشی اور زمینیں وغیرہ ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ اس کا درجہ بلند ہے۔"(۱۰۰)

کتاب "سراج منیر" کے مصنف نے اس کتاب کی ترتیب ابواب بندی سے کام نہیں لیا بل کہ انہوں نے واقعات کی ترتیب سے کتاب کو مرتب کیا ہے۔ جس صاحبِ سوانح کی شخصیت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعات کو سوانح کے اصولوں کے مطابق غیر جانبداری اور دیانت سے پیش کیا گیا ہے۔ جھوٹ اور مبالغہ آرائی سے تحریر کو آلودہ نہیں ہونے دیا گیا۔ جو جیسا ہے ویسا ہی بیان کیا گیا ہے۔ سوانح نگار نے کتاب کو غیر ضروری طوالت سے اجتناب کرنے کے لیے واقعات کو مختصر اور متناسب رکھا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "مَہر صاحب کی برادری میں چند ایک نزاعی واقعات پیش آئے جن کو انہوں نے ایسی خوش اسلوبی سے نمٹایا کہ پوری برادری عش عش کر اٹھی۔ یہ بات بلا مبالغہ بر نوک قلم لائی جا رہی ہے کہ آپ

کی برادری میں شومئ قسمت سے چند قتل کے واقعات بھی رونما ہوئے۔ مہر صاحب نے مداخلت کر کے ژرف نگاہی سے کام لیتے ہوئے ان معاملات اور سانحات کو ایسے نمٹایا کہ کسی فریق کو فوجداری پرچہ کٹوانے کی ضرورت پیش آئی نہ ہی عدالت میں مقدمہ کرنے کی نوعیت۔"[۱۰۱]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگاروں نے سوانح نگاری کے اصولوں کے مطابق اپنی سوانح عمریوں کو اپنے وسائل کے مطابق ترتیب دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ واقعات کی اسناد اور ترتیب کو دیکھا جائے تو ہم ان سوانح عمریوں کو معیاری سوانح نگاری کی فہرست میں شامل کر سکتے ہیں گو کہ کہیں کہیں کچھ تکنیکی خامیاں ضرور موجود ہیں تاہم مجموعی طور پر یہ ایک اچھی کاوش قرار دی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔عبدالقیوم،ڈاکٹر،"سوانح نگاری کیاہے؟"مشمولہ اردو ادب کی فنی تاریخ،الو قار پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳،ص:۳۱۷

۲۔متاز فاخرہ،ڈاکٹر،"اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا"رونق پبلشنگ ہاءوس،دہلی،۱۹۴۸،ص:۲۳

۳۔ Encyclopedia Birtannica. Com 23.5 .2018 . page no.

۴۔ ہر الڈ نکلسن،ڈیویلپمنٹ آف بایو گرافی،باگر تھ پریس اوزون،۱۹۴۷،ص:۱۲۷

۵۔ محمد عمر رضا،ڈاکٹر،اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت، فکشن ہاوس،لاہور ۲۰۱۲،ص:۳۰۶

۶۔ آنسہ الطاف فاطمہ،اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،دہلی،۱۹۴۷،ص:۴۳،۴۲

۷۔ محمد عمر رضا،ڈاکٹر،اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت،ص:۳۲۵

۸۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر،سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء،ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ،۱۹۸۸،ص:۹۳

۹۔عبدالقیوم،ڈاکٹر،حالی کی اردو نثر نگاری،ریڈنگ پرنٹنگ پریس،لاہور،۱۹۶۴،ص:۹۹

۱۰۔ محمد عمر رضا،ڈاکٹر،اردو میں سوانحی ادب: فن اور اولیت،ص:۳۲۹

۱۱۔احتشام حسین،تنقیدی جائزے، لکھنو،۱۹۵۶ء،ص:۴۰-۱۳

۱۲۔ ممتاز فاخرہ،ڈاکٹر،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص:۵۶

۱۳۔ حسن و قار گل،ڈاکٹر،اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، جامعہ کراچی،۱۹۹۷ء،ص:۶۵۸

۱۴۔قطب علی شاہ ،سید،دیوان قطبیہ،مرتبہ ،محمد طاہر حسین قادری ،قادریہ آرگنائزیشن منگانی شریف ،جھنگ ،۲۰۰۴ ء،ص:۳۱

۱۵۔قطب علی شاہ،مرآۃ الفقرا،دین محمدی پریس بل روڈ،لاہور،۱۹۴۷ء،ص:۵

۱۶۔ شیر محمد گیلانیؒ، مکتوباتِ عشق، نثار آرٹ پریس گلبرگ، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص:۶۴

۱۷۔ محمد طاہر حسین قادری، تاریخ ابنِ کرم، جلد دوم، کتاب خانہ ابنِ کرم، منگانی شریف، ۲۰۲۰ء، ص:۱۰۲۴

۱۸۔ ایضاً، ص:1081

19۔ غلام اصغر شاہ، سید "گوہر قادری" رینالہ خورد تحصیل اوکاڑہ ضلع ساہیوال، ۳ ذیقعد ۱۳۸۹ء ص:۸،۹

20۔ محمد کرم حسین قادری، پیر، تنویر الابرار مع اورادِ قادریہ، منگانی شریف، جھنگ، ۱۹۹۴ء، ص:۱۲۰

21۔ محمد کرم حسین قادری، پیر، حلیہ مبارک، کتاب خانہ ابنِ کرم، منگانی شریف، جھنگ، 2021ء، ص:21

22۔ محمد طاہر حسین قادری، لمعاتِ قطب، ص:۸۶

23۔ محمد طاہر حسین قادری، لمحاتِ کرم، جمال کرم لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:283

24۔ محمد یوسف طاہر صفوری، صاحبزادہ، مشمولہ، آئینہ کرم، شمارہ نمبر ۳۶، جھنگ، ۲۰۱۳ء، ص:۲۹

25۔ ساجد امتیاز، "انٹرویو ملک رب نواز قادری"، ۱۰ ستمبر ۲۰۲۱ء

26۔ محمد سلیمان قمر قادری، مضمون مشمولہ روزنامہ نئی بات، ۷ مارچ ۲۰۱۴ء، ص:16

27۔ محمد یار فریدی، خواجہ، دیباچہ، سراج منیر

28۔ سورۃ النساء، آیت نمبر:۸۱

29۔ عبد القادر جیلانی، فتوح الغیب "مترجم سید محمد فارق قادری" المعارف گنج بخش روڈ، لاہور، ص:۴۴

30۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمعاتِ قطب، ص:۳۰۰

31۔ ایضاً، ص:۱۴۱

32۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، تذکرہ شاہ سردار، زیر طبع، ص:۱۵۷

33۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمعاتِ قطب، ص:۹۰

34۔ ایضاً، ص:۲۸۴

35۔ ایضاً، ص:۲۸۴

36۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمحاتِ کرم، ص:۴۵۳

37۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمعاتِ قطب، ص:۲۵۲

38۔ ایضاً، ص:۸۲

39۔ ایضاً، ص:۸۲

40۔ فتوح الغیب، ص:۳۳

41۔ حافظ حمید اختر، سوانح حیات، "حضرت شیخ سلطان باہو"، ص:۹۳

42۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمعاتِ قطب، ص:۲۹۲

43۔ ایضاً، ص:۲۸۶

44۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمحاتِ کرم، ص:۴۵۰

45۔ علی حسن عبد القادر، ڈاکٹر، "جنید بغداد" مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۶۷ء، ص:۱۸۵-۱۸۴

46۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمحاتِ کرم، مکتبہ جمال کرم، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۴۵۱

47۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، تذکرہ شاہ سردار، ص:۱۱۵

48 ۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمعاتِ قطب، ص:۳۰۳

49۔ ربنواز قادری، ملک، تجلیاتِ کرم، کتابخانہ ابنِ کرم خانقاہ منگانی شریف جھنگ، طبع اول، ۲۰۱۸ء، ص:۸-۷۷

50۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمحاتِ کرم، ص:۲۱۸

51۔ حمد طاہر حسین قادری، پیر، حاظ الکرم، ص:115

52۔ عبد القادر شاہ، سوانح حیات سید محمد نواز شاہ، ص:۹۹

53۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمحاتِ کرم، ص:۴۴۵

54۔ ایضاً، ص:445

55۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، حافظ الکرم، ص:۱۴۵

56۔ عبد القادر شاہ، سوانح سید محمد نواز شاہ، ص:۹۱

57۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، حافظ الکرم، ص:۹۵

58۔ محمد طاہر حسین قادری، تاریخ ابنِ کرم، المسطر پبلشرز اسلام آباد، طبع اول جلد دوم، جنوری ۲۰۲۰ء، ص:۵۹-۱۰۵۸

59۔ عبد القادر شاہ، سوانح حیات سید محمد نواز شاہ، ص:۸۵-۸۴

60۔ ربنواز قادری، ملک، تجلیاتِ کرم، ص:۴۷۹

61۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، حافظ الکرم، ص:۱۴۳

62۔ عبد القادر شاہ، سوانح سید محمد نواز شاہ، ص:۷۸

63۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمحاتِ کرم، ص:307

64۔ ایضاً، ص:307

65۔ میمن عبد المجید سندھی، ڈاکٹر، پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص:۳۴۰

66۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمحاتِ کرم، ص:۴۱۸

67۔ پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں، ص:۳۴۲

68۔ ربنواز قادری، ملک، تجلیاتِ کرم، ص:۸۷

69۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمحاتِ کرم، ۴۴۶

70۔ محمد افتخار شفیع، ڈاکٹر، اصناف نثر، ص:۶۲

71۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، تاریخ ابنِ کرم، ص:۹۶۲

72۔ ایضاً، ص:۹۶۲

73۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمعاتِ قطب، ص:۱۴۴

74۔ ایضاً، ص:۱۴۳

75۔ لمحاتِ کرم، ص:۴۷

76۔ ایضاً، ص:۵۰

77۔ ایضاً، ص:۶۶

78۔ ایضاً، ص:۹۲

79۔ ایضاً، ص:۱۶۲

80۔ ربنواز قادری، ملک، تجلیاتِ کرم، ص:۲ ۳۱-۳۱۱

81۔ ایضاً، ص:۳۱۲

82۔ فیاض النصیر طاہر، میاں، فیوض یار، چاولہ پرنٹنگ پریس وہاڑی، ۲۰۰۶ء، ص:۹۰-۸۹

83۔ ایضاً، ص:90

84۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، حافظ الکرم، ص:۱۰۱

85۔ ایضاً، ص:۱۷۲-۱۷۱

86۔ حفیظ صدیقی، ابو الاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص:۱۳

87۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اقبال کی اردو نثر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص:۲۱۷

88۔ معین نظامی، ڈاکٹر، برقی مراسلہ،

89۔ سوانح حیات سید محمد نواز شاہ، ص:۲۷

90۔ لمحاتِ کرم، ص:۴۱۴

91۔ محمد انوار حسین قادری، دیباچہ "سراج منیر" از حضر محمد قمر الدین قادری، دارالشعور پرنٹنگ پریس لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۵

92۔ جبار مرزا، مضمون مشمولہ تجلیاتِ کرم، ص:۳۳

93۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، حافظ الکرم، ص:۱۴۰

94۔ آئینہ کرم، شمارہ نمبر

95۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمحاتِ کرم، ص:۴۱

96۔ ایضاً،، ص:۵۱

97۔ ایضاً،، ص:۶۰

98۔ ایضاً،، ص:۱۲۷

99۔ ایضاً،، ص:۱۶۳

100۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، حافظ الکرم، ص:۱۵۰-۱۴۹

101۔ محمد قمر الدین قادری، پیر، سراجِ منیر، ص:۱۹۸

باب سوم

سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی مکتوب نگاری کا جائزہ

الف۔ روایت اور تعارف

i. فن مکتوب نگاری:

مکتوب عربی زبان کا لفظ ہے جو مذکر اور معفول ہے۔[۱] یہ 'کتب' سے ماخوذ ہے[۲] اور لغوی معنی 'لکھا ہوا' یا 'تحریر' ہے۔[۳] مجازاً اس سے مراد چھٹی یا خط ہے۔[۴] عربی میں مکتوب کے لیے رسالہ، خطاب اور کتاب کے الفاظ بھی مستعمل ہیں۔[۵] فارسی زبان میں بھی یہ لفظ انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فرہنگ فارسی دانش میں مکتوب کا مفہوم ان الفاظ میں درج ہے۔

نوشتہ شدہ، ناصہ، رسالہ'[۶]

انگریزی میں مکتوب کا ہم معنی لفظ لیٹر اور مطلب wrote ہے۔[۷]

آکسفورڈ ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری کے مولف نے مکتوب کے اصطلاحی مطلب اور اقسام کو یوں تحریر کیا ہے۔

> "A message that is written down or printed on paper and usually put in envelope and send to be sb: a business / thank-you leter, a letter of complaint/sympathy, (BrE) to post a letter, (AmE) to mail a letter, There's a letter for you from your mother, you will be notified by letter". (8)

مکتوب کے مترادف 'خط' لفظ کے بارے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ عربوں کے ہاں جب رسم تحریر کا چلن ہوا تو انھوں نے اس میں لکھی ہوئی عبارت کے لیے خط کا لفظ استعمال کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبد اللہ کہتے ہیں۔

> " عربوں کے تصور میں ایجاد تحریر کا بنیادی مقصد (علم و معلومات سے پہلے) محض پیغام رسانی اور جذبات یا معاملات ضروری کا ابلاغ تھا یہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی میں رسم تحریر ہی کو 'خط' کہتے ہیں۔[9]

موضوعاتی اور اسلوبیاکی اعتبار سے مکتوبات کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی ذاتی و نجی خطوط، رسمی خطوط، عمومی خطوط، کاروباری، سرکاری اور دفتری خطوط۔

ذاتی و نجی خطوط سے مراد ایسے خطوط ہیں جن میں دوست احباب اور عزیز و اقارب کو ذاتی زندگی سے متعلق اپنے جذبات و احساسات، مصروفیات اور رازدرانہ باتیں بتائی جائیں۔ ادیب اپنے افکار و نظریات کا اظہار ایسے ہی خطوں میں کرتے ہیں۔

رسمی خطوط شادی بیاہ، تعزیتی، میلے ٹھیلے، علمی و ادبی، مذہبی یا سیاسی تقریبات میں شمولیت کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ عمومی خطوط میں مخاطب ایک فرد ہوتا ہے مگر اس کا موضوع مجموعی نوعیت کا ہوتا ہے۔ کسی معاشرتی اور سماجی مسئلے پر لکھے جانے والے خطوط اس ذیل میں آتے ہیں۔

کاروباری خطوط تجارتی ارادے اور کاروباری لوگ تجارتی مقاصد کے لیے نہایت سادہ زبان میں تحریر کرتے ہیں۔

سرکاری / دفتری خطوط کا تعلق ایسے خطوط سے ہوتا ہے جو مختلف دفاتر حکومت یا محکمے ایک دوسرے یا عوام کو لکھتے ہیں۔ ملازمت، بجلی، گیس اور فون کنیکشن کے لیے لکھی جانے والی درخواستیں بھی اس زمرے میں آتی ہیں۔

خط یا مکتوب میں مکتوب نگار چوں کہ اشیاء باتوں ----- امور کو اس نظر سے نہیں دیکھتا جیسی کہ وہ ہوں بلکہ وہ انھیں اپنے جذبات و احساسات کے تناظر میں پیش کرتا ہے اسی وجہ سے اسے تخلیقی عمل شمار کیا جاتا ہے جس کا دوسرا نام "انشا" ہے۔ انشا کا جوہر ذاتی یا نجی خطوط جن میں ہی نظر آتا ہے عربی میں مکتوب کی ایسی قسم کو "افوائیات" کہتے ہیں۔[10]

فن مکتوب نگاری کا بنیادی عنوان ابلاغ ہے۔ اس لیے خط کا حقیقی حصہ مکتوب الیہ تک جذبات کا پہنچانا ہے اگر اس اہم پہلو سے چشم پوشی کی جائے تو فنی اعتبار سے اس کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن حد سے بڑھی ہوئی جذبائیت بھی اس کی فنی حیثیت کو مجروح کرتی ہے۔ اس ضمن میں توازن کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ جذبات و خیالات کا بناوٹ اور ------- کو بغیر مکتوب کی زینت بننا اس کی قدر میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کو ساتھ مدعا کو اختصار سے پیش کرنا نمایاں فنی وصف ہے۔

مکتوب (خط) کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی تاریخ انسانی میں تحریر قدیم ہے بعض مؤرخین کے نزدیک چین میں پہلا خط چار ہزار سال قبل لکھا گیا لیکن یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ البتہ ۱۸۸۷ء میں ملک عراق میں Tel Aslmarna کے مقام پر محکمہ آثار قدیمہ کو کھدائی کے دوران ۳۰۰ کے قریب تختیاں دریافت ہوئیں۔ تحقیق کے بعد ماہرین نے ان تحریروں کو خطوط قرار دیا جو فراعنہ مصر کو لکھے گئے تھے۔ یہ سریانی زبان میں تحریر کئے گئے تھے اور قدامت تین ہزار سال قبل کی ہے۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک خط کا ذکر ملتا ہے۔ جو انہوں نے یمن کی ملکہ سباء کے نام لکھا۔ "ہومر" کے مطابق یونان میں قبل مسیح دور خط لکھنے کا رواج تھا۔ افلاطون اور ارسطو کے خطوط کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یونانیوں کے بعد رومن تہذیب کے نمائندہ شاعر سیسرو (Sissroo) کے خطوط لاطینی زبان میں موجود ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کو حواریوں کے خطوط بھی یونانی زبان میں ملتے ہیں۔

عربوں میں قبل اسلام میں بھی خطوط نویسی کا رواج تھا لیکن روایت مضبوط نہ تھی۔ ظہورِ اسلام سے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے باقاعدہ خطوط لکھے جو آج بھی محفوظ ہیں۔ ۶ ہجری میں حضور سرورِ کائنات ﷺ نے بادشاہان عالم کے نام اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مکتوب تحریر فرمائے۔ آپ ﷺ نے اپنے ہم عصر بادشاہوں، امراء اور سلاطین کے نام جو مکتوب مع معاہدات ارسال فرمائے ان کی تعداد تین سو کے قریب ہے۔

نبی کریم ﷺ کے بعد خلفائے راشدین میں حضرت عمرؓ کے خطوط جو گورنروں کو ہدایات اور اطلاعات کی صورت میں بھیجے جاتے۔ ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ حضرت علیؓ کے خطبات "نہج البلاغہ" میں ان کے خطوط بھی موجود ہیں۔ کوفیوں کے خطوط کے جواب میں حضرت امام حسینؓ کے مکتوبات قابل دید ہیں۔ دوسری طرف سامانی بادشاہ

"نوشیروان" کے مکتوبات "توفیقات نوشیرواں" کے نام سے محفوظ ہیں۔ ایران کے بادشاہوں نے ہر زمانے میں خطوط تحریر کئے ہیں۔ فارسی کے مشہور شاعر مولانا عبد الرحمن جامی کے خطوط "رقعات جامی" کے نام سے ذخیرہ شدہ ہیں۔ صوفیہ کرام کا پہلا مجموعۂ مکتوب شیخ احمد بن محمد غزالی کے خطوط کا ہے۔ علم و حکمت کے بیان میں شیخ شیوخ العالم حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ ۵۶۱ھ کے مکتوبات اہمیت کے حامل ہیں تصوف کی تاریخ میں دوسرا مجموعہ خطوط حضرت مولانا روم ۶۷۲ھ کا ہے۔ جن کی تعداد ہے ۱۳۵ اور کتابی صورت میں موجود ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں صوفیہ نے اپنی خانقاہوں سے فارسی زبان میں بے شمار خطوط لکھے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر ۶۳۳ھ کے مکاتیب ہیں جو اسرار حقیقی کے نام سے مشہور ہیں ان کی تعداد آٹھ ہے۔ دو حضرات کے مکتوبات کے مجموعوں کو ہندوستان میں پذیرائی ملی ایک مکتوبات حضرت شرف الدین یحییٰ متوفی ۷۸۲ھ جو کہ دو جلدوں پر مشتمل ہیں دوسرا مجموعہ حضرت مجدد الف ثانی م: ۱۰۳۴ھ جو کہ مکتوبات ربانی کے نام سے مشہور ہیں اور تین جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان کی مقبولیت میں آج تک کمی نہیں ہوئی بعد ازاں صوفیہ میں خطوط نویسی کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ان میں سے چند ایک نام کچھ اس طرح ہیں۔ مکتوبات شیخ صدر الدین دہلوی، مکتوبات شیخ نور الحق، المعروف قطب عالم، مکتوباتِ میر سید اشرف جہانگیر سمنانی، مکتوبات شیخ عبد القدوس گنگوہی، مکتوباتِ شاہ عبد الحق محدث دہلوی اور مکتوبات شاہ خوب الٰہی قابلِ ذکر ہیں۔ اکبر کے نورتنوں میں ابو الفضل کے خطوط اتنے اہم تھے کہ نصاب میں شامل رہے ہیں۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں فن خطوط نویسی پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں منیر لاہوری کی "انشائے منیری" چندر بھان برہمن کی "چہار چمن" اور منشات برہمن اور مادھو کی کتاب انشاء مادھو راؤ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تینوں کو مجموعی طور پر "انشات و منشات" کہتے ہیں۔ مشائخ پنجاب میں اس دور کے مشہور مکتوبات کے مجموعوں میں مکتوباتِ عشق (منظوم) از حضرت شیر محمد گیلانیؒ (م: ۱۹۳۲ء)، فتح پوری، مہر چشتیہ از حضرت پیر مہر علی گیلانی گولڑوی (م: ۱۹۴۱ء)، الہامات الہیہ از خواجہ اللہ یار قادری (م: ۱۹۴۱ء)، پیامِ جلو آنوی اور یسقون من رَحیق مختوم از خواجہ غلام محمد جلو آنوی (م: ۱۹۵۲ء)،

مسافر چند روزہ از بابو سرکارؒ (م: ۱۹۷۴ء)، ابرِ کرم از خواجہ سائیں پیر محمد کرم حسین قادری (م: ۱۹۹۱ء) اور مکاتیب ضیاء الامت از حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری شامل ہیں۔

ii. اردو میں مکتوب نگاری کی روایت:

اردو میں خطوط نویسی کا رواج فورٹ ولیم کالج قائم ہونے سے کافی پہلے تھا۔ عموماً غلام غوث بے خبر اور رجب علی بیگ سرور کو اردو کا پہلا مکتوب نگار سمجھا جاتا ہے لیکن مقالہ "اردو مکتوب نگاری" میں لطیف اعظمی نے تحقیقی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ کرناٹک کے نواب والا جاہ کے برادر اصغر حسام الملک بہادر نے اپنی بھابھی نواب بیگم کے نام دسمبر ۱۸۲۲ء کو خط لکھا تھا۔ ڈاکٹر لطیف اعظمی نے اپنی تحقیق کے مطابق اسے اردو کا پہلا مکتوب کہا ہے۔ عنوان چشتی اور گیان چند جین نے لطیف اعظمی کی تحقیق کو درست کہا ہے۔ خلیق انجم مضمون "غالب اور رشاہانِ تیموریہ" میں جان طپش (م: ۱۸۱۴ء) اور راسخ عظیم آبادی (م: ۱۸۲۲ء) کے مابین مراسلت کا ذکر کرتے ہیں اور دونوں کے مکتوب دریافت بھی ہو چکے ہیں۔ یقینی طور پر یہ خطوط ۱۸۱۴ء سے پہلے کے ہیں جس سے ان کی قدامت مسلم ہے۔

پروفیسر ثریا حسین نے "گارساں دتاسی اردو خدمات اور علمی کارنامے" میں گارساں دتاسی کی کتاب ضمیمہ ءِہندوستانی کی مبادیات کا تعارف کروایا ہے جس میں دتاسی نے اردو کے ۱۸ مکتوب شاملِ کتاب کیے ہیں۔ اس میں سب سے قدیم خط جنوری ۱۸۱۰ء کا ہے۔ خط نویس افتخار الدین علی خان شہرت (فورٹ ولیم کالج کا ملازم تھا) ہے جب کہ کوئی منشی مکتوب الیہ ہے۔ بعد ازاں شاعر شیر محمد خان ایمان حیدر آبادی کا کلیات ۱۸۰۶ء میں شائع ہوا جس میں کسی نثری خط کا منظوم جواب دیا گیا ہے۔ شاعر ایمان سے پہلے ۱۷۶۱ء میں دو شعراء مرزا ایاز علی بیگ اور میر ابراہیم جوان کے مابین منظوم خط کتابت دریافت ہوئی ہے۔ یہ خطوط ادارہ ادبیات حیدر آباد میں محفوظ ہیں۔ المختصر اردو خطوط نویسی کی قدامت ابھی تحقیق طلب کام ہے اور تاحال یہ حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو کا پہلا مکتوب اور مکتوب نگار کون ہے؟

اردو مکتوب نگاری کو اہمیت خطوط غالب سے ملی اگرچہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے غالب سے پہلے ۱۸۸۶ء میں خطوط کا مجموعہ "انشائے سرور" کے نام سے شائع کیا لیکن ان خطوط کی زبان بھی فسانہ عجائب جیسی ہے۔ علاوہ ازیں غلام

غوث بے خبر نے دو مجموعے بنام "فغان بے خبر" اور "انشائے بے خبر" شائع کروائے۔ بے خبر کے کچھ خطوط غالب کی طرح سادہ اور بعض خطوط سرور کی طرح مسجع اور مقفّٰی تھے۔ یہ ہم عصر تھے۔ بعض محققین بے خبر کو غالب کی بجائے سادہ اور مکتوب نگاری میں اولیت دیتے ہیں لیکن غالب نے خط کو نصف ملاقات قرار دیا اور اپنے اندازِ بیاں کی بدولت اردو کے بڑے مکتوب نگار کہلائے۔

ان کے مشہور خطوط کے مجموعے "عود ہندی"، "اردوئے معلیٰ"، "مکاتیب غالب" مہر غالب وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ غالب کے بعد خطوط نگاری کو وہ اہمیت حاصل ہوئی کہ اسے باقاعدہ ایک صنف ادب سمجھا جانے لگا۔ ان کے بعد سر سید احمد خان کا مجموعہ "مکاتیبِ سر سید" شائع ہوا۔ اسی طرح "مکاتیبِ حالی" اور "مکاتیبِ شبلی" بھی یادگار ہیں۔ خطوط کے مجموعوں میں مولانا آزاد کے مجموعے "غبار خاطر" کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ محمد علی جوہر کے خطوط اس کار نہما نقش پیش کرتے ہیں۔ معنوی رعایتیں نکھارنے میں خواجہ حسن نظامی کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے خطوط ایک صاحب ایمان اور درویش حق پرست کے خطوط ہیں۔ جدید دور کے مکتوب نگاروں میں محمد علی رودوی ایک اہم نام ہے۔ میراجی کے خطوط "نئی تحریریں" اور "نقوش" میں شائع ہو چکے ہیں۔ "آدھی ملاقات" میں حسن نثار کاروئے سخن اپنی شاعرہ بیوی کی طرف ہے لیکن یہ خطوط "زیرِلب" (صفیہ اختر) جیسی تاثیر پیدا نہیں کر سکے۔ اب تک خطوط کے ان گنت مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اب ان کے نام لکھنے میں بھی طوالت کا اندیشہ ہے۔ دورِ حاضر میں خطوط نویسی نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

غالب کے بعد سے خطوط زبان و ادب کا حصہ بن گئے اب ادبی خط لکھنا فن ہی نہیں بلکہ فن لطیف ہے۔ ادباء کے خطوط کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان سے ادباء کی تخلیقی شخصیت کو بھی جانچا جا سکتا ہے۔ ان کی تخلیقات کا پس منظر نظریات کا سراغ اور مختلف مراحل پر روبہ عمل آنے والی رکاوٹوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ خطوط کے مطالب میں تصانیف کی متانت کے بجائے تنوع اور بوقلمونی کی گل فشانیاں ہوتی ہیں۔ مکاتیب علم و ادب کے چھوٹے چھوٹے جواہر پارے ہوتے ہیں۔ جنہیں پڑھتے وقت دماغ پر بوجھ نہیں پڑتا۔ استفادہ بہتر ہوتا ہے اور زحمت کم ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ مکتوب نگاری اردو ادب اور نثر میں ایک مقام بنا چکی ہے اور ایک فن کا درجہ حاصل کر چکی ہے تاہم اس کی قدامت ابھی تک زیر تحقیق و زیر بحث ہے۔

iii. سلسلہ قطبیہ میں مکتوب نگاری کی روایت:

مکتوب محض خبر یا پیغام کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ انسانی قربت کا ذریعہ مجلس ہیں۔ صوفیہ کا کام دلوں کو جوڑنا اور محبت کو عام کرنا ہے۔ صوفیۂ عظام نے محبت، تربیت اور اصلاح کی خاطر مکتوب نگاری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ تمام سلاسل طریقت میں یہ روایت موجود ہے۔ سلسلہ قطبیہ کے مشائخ نے بھی خطوط نویسی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

سلسلہ قطبیہ میں خطوط نویسی کا آغاز بانیٔ سلسلہ حضرت سید قطب علی شاہ بخاری قادریؒ (۱۸۴۹-۱۹۲۷) سے ہوتا ہے۔ آپ اپنے زمانہ کی ایک نابغۂ روزگار ہستی تھے۔ آپؒ ایک عالم، صوفی بزرگ، علاقہ کے رئیس اور نمبر دار تھے۔ اس لیے آپ کے مریدین، دوست احباب اور عوام الناس بذریعہ خط آپ سے مشاورت اور اپنے مسائل کا حل دریافت کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ خطوط مذہبی مسائل اور متصوفانہ پہلوؤں پر بھی مبنی ہوتے علاوہ مختلف علاقوں میں کئی ایک جلسوں میں دعوتی خطوط کے بھی اشارے ملتے ہیں لیکن شومئ قسمت جو خطوط آپ جواباً تحریر فرماتے رہے کوئی ان کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ تاحال ان کا ایک خط دستیاب ہو سکا ہے جو کہ حضور نے نواب آف بہاولپور نواب سعادت علی خان کو اپنے دست مبارک سے لکھا ہے اور یہ "کتاب خانہ ابنِ کرم" میں محفوظ ہے۔ نواب صاحب اہل تشیع کی طرف سے آپ کو مناظرہ کا پیغام بھیجتے ہیں تو آپ جواباً تحریر کرتے ہیں۔ آپؒ کا معمول تھا کہ خط کا جواب بروقت ارسال فرماتے۔ زیادہ تر خود تحریر فرماتے مگر بعض اوقات پاس بیٹھے پڑھے لکھے درویش کو مضمون تحریر کروا دیتے۔ خط کا آغاز کچھ انداز سے ہوتا ہے۔

"مکتوب حضرت قطب عالمؒ بنام نواب سعادت علی خان صاحب

بخدمت جناب نواب صاحب نواب سعادت علی خان صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ"(۱۲)

خط اور خط کا طرزِ تحریر پرانا ہے اور اس پر تاریخ پڑھی نہیں جا سکتی۔

حضرت سید شیر محمد گیلانی قادری(۱۸۶۲-۱۹۳۲ء) خلیفہ حضرت سید قطب علی شاہؒ اپنے وقت کے نامور شاعر ،عارفانہ علوم کے ماہر اور ولیٔ کامل تھے۔ان کے منظوم خطوط "مکتوباتِ عشق" کے نام سے کئی مرتبہ اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ان کا اپنے پیر سے عشق و محبت تمام زمانہ سے نرالا اور انوکھا تھا۔جس کی مثال ناپید ہے۔ان کی نثری تحریر بھی بڑی جاندار ہے۔اک اک حرف سے محبت، عجز اور ادب چھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ایک خط میں اپنے مرشد کی بارگاہ میں یوں عرض کرتے ہیں:

> "پس قبلہ من! جو جو فرمان عالی شان آنجناب فیض مآب سے اس حقیر پر تقصیر کے حق میں وارد ہوا ہے واقعی یہ سب صحیح ہے لیکن اے عالی سرکار! اس گنہگار نے اپنے اس بدکردار سے کب انکار کیا تھا۔"(۱۳)

آپ کے ایک خط پر ماہ رمضان ۱۳۲۰ھ کی تاریخ درج ہے جو مطابق دسمبر ۱۹۰۲ء سن عیسوی ہے۔آپ کے دستیاب خطوط میں دو جامع خطوط اور تین رقعات ہیں۔

حضرت پیر سید فضل حسین شاہ بخاری(۱۸۷۵-۱۹۳۹)حضرت سید قطب علی شاہ کے بیٹے اور سید شیر محمد گیلانیؒ کی دستِ بیعت تھے۔آپ نے اپنے بزرگان کی طرح مکتوب نگاری کی روایت کو پروان چڑھایا۔آپؒ کے خطوط بھی محفوظ نہ رہ سکے البتہ آپ کو دو خطوط مآثر شیریزدانی میں طبع ہو چکے ہیں۔یہ دو خطوط ہی محفوظ رہ سکے۔آپ کی عبارت کی روانی اور طرزِ تحریر دیکھ کر آپ کی علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کے بعد پیر سید غلام رسول شاہ(۱۸۸۷-۱۹۶۶) نے مکتوب نگاری کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے۔اپنے مریدین، خلفاء اور احباب کو خطوط لکھے۔آپؒ کے جو خط دستیاب ہو سکے ان کی تعداد سات ہے جو کتابخانہ ابنِ کرم میں محفوظ ہیں۔آپؒ کی شخصیت محبت و الفت کا سراپا تھی۔ایک عارف باللہ سید خادم حسین شاہ سے کافی رغبت و محبت رکھتے تھے۔ان کے خط میں کوئی ایسا ذوق شوق بھرا جملہ تھا جس کو پڑھ کر آپ پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔آپ ان کو جواب میں لکھتے ہیں:

"آپ کا راحت نامہ موصول ہوا جسے پڑھ کر نہایت مسرور ہوا ہوں اور آنکھوں و دل پر لگا لگا کر لطف اٹھایا۔ آج تیسرا دن گزرا جارہا ہے کہ بار بار دہرا دہرا کر لطف اندوز ہوں۔ آپ نے لکھا ہے کہ تحریر طوالت اختیار کر گئی ہے۔ بار خاطر نہ ہوں لیکن یہ محض آپ کا خیال آپ تک ہے۔ بخدا میں تو اس سے متاثر و مسرور ہوں۔"(۱۴)

اس خط کے اقتباس سے خط بخوبی پتا چلتا ہے کہ آپؒ کے خطوط کافی طویل، لطیف اور پر کشش تحریر کے حامل ہوا کرتے تھے اور آپ کی تحریر ہلکی، پھلکی رواں جو پڑھتے ہوئے اکتاہٹ پیدا نہیں کرتی۔ تحریر میں ادبی چاشنی بھی موجود ہے۔ تحریر پر شخصیت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ آپ کی شخصیت پر بھی عشق و مستی کا رنگ نمایاں تھا۔

بعد ازاں حضرت سید سردار علی شاہ قادریؒ (۱۹۸۶-۱۹۶۸) سلسلہ قطبیہ میں خطوط نگاری کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ آپ کاغذ اور قلم ہمیشہ اپنے پاس رکھتے۔ جب بھی کسی کا خط آتا فوراً جواب تحریر کروا دیتے۔ آپ کے دستیاب خطوط کی تعداد سات ہے۔ جن میں پانچ مکتوب نثر میں ہیں اور دو خط پنجابی زبان میں منظوم ہیں۔ آپ کے خطوط کا مزاج سادہ اور مکالمانہ ہے۔ صاف اور سیدھے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ ان خطوط میں زمانی لحاظ سے پہلا خط ۱۹۲۲ء کا ہے اور آخری خط جو دستیاب ہوا اس پر ۱۹۶۴ء کی تاریخ درج ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ آپ عمر کے آخری حصہ تک خط کتابت فرماتے رہے ہیں۔

حضرت مولانا پیر غلام محمد جلو آنویؒ(۱۹۸۳-۱۸۹۳) ایسے مکتوب نگار ہیں جنہوں نے سلسلہ قطبیہ میں کتابی صورت میں خطوط نویسی کی بنیاد رکھی۔ آپ کے دو مجموعہ مکتوبات زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ جن کے نام "یسقون من رحیق مختوم" اور "پیامِ جلوی" ہیں۔ آپ کے خطوط میں زبان و بیان کا عمدہ ظہور ملتا ہے۔ علاوہ معرفت اور سلوک کے نکات کو آساں پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ صوفیانہ خطوط نویسی میں ایک اہم مآخذ ہیں۔

حضرت میاں اللہ یار کملانہ (۱۹۴۱-۱۹۱۳) نے مکتوب نگاری میں اپنے مشائخ کی روایت کو جاری رکھا۔ آپ نے خطوط کا مختصر مجموعہ جو کہ نو خطوط پر مشتمل ہے اشاعت شدہ ہے۔ آپ نے یہ خطوط اپنے مرشد کریم ان کے صاحبزادگان اور پیر بھائیوں کے نام لکھے۔ زیادہ تر خطوط کا موضوع نجی معاملات ہیں۔

روایت مکتوب نگاری کو آگے بڑھاتے ہوئے حضرت خواجہ حافظ گل محمد قادریؒ(۱۹۱۴-۱۹۵۴)نے اپنے احباب اور عقیدت مندوں کو وقتاً فوقتاً خط تحریر فرمائے۔ ان میں سے زیادہ تر خطوط محفوظ نہ ہو سکے۔ ان کے کل چار خطوط دستیاب ہوئے ہیں جو ان کی سوانح "حافظ الکرم" میں شائع ہو چکے ہیں۔ خط کبھی خود لکھتے اور کبھی اپنے صاحبزادے پیر محمد کرم حسین قادریؒ سے املا بھی کروالیتے تھے۔

سلسلہ قطبیہ کی خطوط نویسی کی روایت کو حضرت خواجہ پیر محمد کرم حسین قادریؒ(۱۹۴۰-۱۹۹۱)نے مستحکم اور توانا بنایا۔ آپ کے خطوط کا مجموعہ "ابرِ کرم" کے نام سے چھپ چکا ہے جس میں ۷۰ خطوط موجود ہیں۔ یہ خطوط قرآن و سنت کی تعلیمات، متصوفانہ افکار، اخلاق و اعمال اور محبت و الفت سے معمور ہیں۔ آپ کے مکتوبات کی نثر سادہ، رواں اور معنی آفریں ہے۔ یہ خطوط پند و نصائح اور تربیت کا عمدہ اور قیمتی خزانہ ہیں۔

دورِ حاضر میں سلسلہ قطبیہ کی مکتوب نگاری کو آگے بڑھاتے ہوئے حضرت پیر محمد مظہر حسین قادری اور پیر محمد اختر حسین قادری نے احباب اور عقیدت مندوں کو خطوط تحریر فرمائے۔ ان کے خطوط کے مجموعہ کا نام "ریاض الکرم" ہے جو کہ زیرِ طبع ہے۔ سلسلہ کی خطوط نویسی کو جس ہستی نے بام عروج تک پہنچایا ہے ان کا نام حضرت پیر محمد طاہر حسین قادری ہے جنہوں نے علمی و ادبی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ شعر اور نثر دونوں حوالوں سے ان کا نام اہم ہے۔ انہوں نے نہ صرف مشائخ عظام، علمائے دین اور مریدین کے ساتھ خط کتابت رکھی ہوئی ہے بلکہ موجودہ دور کی تمام علمی و ادبی شخصیات سے ان کی باقاعدہ رسم خطوط نویسی جاری ہے۔ ان کے خطوط کو دیکھ کر ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ ان پر علیحدہ سے جامعاتی سطح پر کام ہونا چاہیے۔

iv. سلسلہ قطبیہ کے مکتوب نگار: تعارف:

ا. حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ:

حضرت سید قطب علی شاہؒ کی ولات ۲۱ شوال ۱۲۶۵ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۸۴۹ءبروز اتوار بوقت نصف شب ہوئی۔ آپؒ کے والد ماجد کا نام حضرت پیر امام شاہ تھا۔ حضرت سید قطب علی شاہ قادریؒ اپنے وقت کے عالم با عمل، صوفی با صفا، عارف باللہ اور صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ صاحبزادہ یوسف طاہر صفوری "کلیات صالح محمد صفوری" میں لکھتے ہیں:

> "قطب دوراں سید قطب علی شاہ قدس سرہٗ بہت بلند مرتبہ عالم، فاضل، عارف کامل اور نامور مصنف گزرے ہیں۔ آپ کی علمی و ادبی اور اپنی خدمات بے شمار اور لازوال ہیں۔ شاعری میں آپ کا دیوان "دیوانِ قطبیہ" اور نثری خدمات میں "اسرار المعرفت"، "مناظرہ ہیر و قاضی"، "مرآۃ الفقراء" (ملفوظات)، "حیات النبیؐ" اہلِ تشیع کے رد میں "شوائظ البرقات فی رمی الجمرات رد شیعہ بقول امامیہ انوار قدسیہ فی رد رموز بدیعہ" امدادِ الٰہیہ، اور فہرست نہج البلاغت یادگار ہیں۔[۱۵]

آپ کے اخلاق نہایت بلند تھے۔ اوصافِ حمیدہ میں صبر و تحمل، سخاوت انسان دوستی، غریب پروری، عجز و انکسار، خوش طبعی، شجاعت اور اخلاص ووفا، حاضر جوابی جیسی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپؒ کے اپنے ہم عصر بزرگان حضرت خواجہ اللہ بخش تونسویؒ، حضرت امام احمد رضا خان بریلویؒ، حضرت سید پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ، حضرت میاں شیر محمد شرقپوری اور حضرت مخدوم صدر الدین شاہ گیلانیؒ سے دوستانہ مراسم تھے۔ آپؒ کا وصال ۲۲ دسمبر ۱۹۲۷ء کو ہوا۔ آپؒ نے علم و معرفت کے جو چراغ روشن کیے وہ آج بھی اپنی کرنوں سے ایک جہان کو منور کر رہا ہے۔

۲. حضرت سید شیر محمد گیلانی قادری:

آپؒ حضرت سید قطب علی شاہؒ کے مرید و خلیفہ اکبر ہیں۔ حضرت سائیں شیر محمد گیلانیؒ کی ولادت ۱۸۶۲ء میں "چاہ پیر والہ" موجود نام کھوہ پاک ضلع اوکاڑہ میں ہوئی۔ آپؒ کے والد ماجد کا نام حضرت سید موج دریاؒ ہے۔ آپؒ نے مسجد مکتب میں مروّج نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن و تفسیر کی تعلیم بھی حاصل کی۔ آپ پنجابی کے نامور شاعر تھے۔ آپؒ کا کلام "مکتوباتِ عشق" کے نام سے کئی مرتبہ اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ آپؒ علم و حکمت میں بلند مقام رکھتے تھے۔ آپؒ کے ملفوظات کا مجموعہ "مرآت العاشقین" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جس کے مطالعہ سے آپ کا علمی مقام و مرتبہ واضح

ہو جاتا ہے۔ آپ کے مکتوب خطوط کا مجموعہ مآثر شیر یزدانی کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ آپ ایک شریف النفس منکسر المزاج، خدا ترس، حلیم الطبع اور اپنے مرشد کے دیوانہ اور عاشق کے طور پر نمایاں شناخت رکھتے تھے۔ آپؒ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو اس جہان فانی سے کوچ فرما گئے لیکن آپؒ کی صحبت سے فیض پانے والوں نے دنیا کو اپنے علم و عرفان سے خوب روشن کیا۔ ان میں سے نمایاں شہرت پانے والوں میں حضرت غلام محمد جلو آنویؒ، حضرت سید سردار علی شاہؒ اور مولانا محمد عظیمؒ قادری ہیں۔

۳. حضرت میاں اللہ یار کملانہؒ:

آپؒ حضرت سید قطب علی شاہؒ کے مرید و خلیفہ ہیں۔ جب آپؒ ۱۹۱۳ء میں بیعت ہوئے تو عمر ۱۹ سال تھی۔ اس لحاظ سے آپ کی ولادت کا سال ۱۸۹۴ء بنتا ہے۔ آپؒ کے والد کا نام مہر احمد خان ہے۔ مقام ولادت جلال پور کملانہ تحصیل شور کوٹ ضلع جھنگ ہے۔ ابتدائی تعلیم پرائمری سکول جلال پور کملانہ سے حاصل کی۔ آپؒ اردو اور فارسی پر خاصی دسترس رکھتے تھے۔ آپؒ کے نمایاں اوصاف میں مہمان نوازی، جرآت، حمیت، اخلاص اور غریب پروری شامل تھے۔ آپ کا تعلق ایک زمین دار اور نمبر دار گھرانے سے تھا لیکن جب دستِ بیعت ہوئے تو دنیاداری کو راہِ خدا میں وقف کر دیا اور ہمہ وقت لوگوں کی ظاہری و باطنی مشکلات میں ان کے مددگار بن گئے۔ آپ کی علمی خدمات میں آپ کا خطوط کا مجموعہ "الہامات الہیہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپؒ کی تاریخ وفات ۲۴ ستمبر ۱۹۴۱ء بروز بدھ ہے۔

۴. حضرت سائیں غلام محمد جلو آنویؒ:

آپؒ کا شمار حضرت سائیں شیر محمد گیلانیؒ کے اکابر خلفاء میں ہوتا ہے۔ آپؒ کی ولادت ۱۸۹۳ء کو بمقام مخدومہ شریف ضلع کمالیہ میں ہوئی۔ آپؒ کے والد میاں محمد فاضل عرصہ پچاس سال حضرت سید قطب علی شاہؒ کے مختار عام رہے۔ آپؒ وسیع المطالعہ تھے۔ بالخصوص شیخ محی الدین ابنِ عربی کی تالیفات کے رسیا تھے۔ آپؒ کا ایک بڑا کتب خانہ تھا تمام عمر تالیف و تصنیف میں گزاری۔ آپؒ کے دو خطوط کے مجموعے یسقون من رحیق مختوم اور پیام جلو آنوی ہیں۔ علاوہ آپؒ کی تصنیفات کی فہرست درج ذیل ہے۔

"تاریخ ابنِ کرم"، ص:۱۰۶۵

آپؒ کے علمی کام اہلِ علم و معرفت کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ آپؒ ۶۳ سال کی عمر میں ۱۵ مئی ۱۹۵۶ء کو جلو آنہ میں خالقِ حقیقی سے واصل ہوئے۔

۵. حضرت سائیں پیر محمد کرم حسین قادریؒ:

آپؒ کا ابتدائی نام "کرم الٰہی" رکھا گیا جو بعد ازاں آپؒ کے مرشد حضرت سید سردار علی شاہؒ نے تبدیل فرما کر "کرم حسین" رکھ دیا۔ آپؒ کی ولادت ۲ نومبر ۱۹۴۰ء مطابق یکم شوال ۱۳۵۹ھ بروز ہفتہ بوقت اذانِ فجر ہوئی۔ عید کے روز آپ کی آمد سے گھر میں دوہری خوشی کا سماں پیدا ہو گیا۔ آپؒ کے والد ماجد حضرت خواجہ حافظ گل محمد قطبی قادری اپنے وقت کے ایک نامور بزرگ تھے۔ مذہبی و روحانی تعلیم و تربیت اپنے والدِ ماجد سے حاصل کی۔ رسمی تعلیم جماعت اول سے چہارم تک گورنمنٹ پرائمری سکول بلو آنہ (جھنگ) میں اور پانچویں سے آٹھویں تک گورنمنٹ مڈل سکول چک نمبر ۱۷۵ سے مکمل کی پھر اچانک والد ماجد کی وفات کی بدولت تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا مگر آپ بڑے عالی ہمت ثابت ہوئے نہ صرف ۱۴ (چودہ) سال کی عمر میں خانقاہی نظام اور چھوٹے بہن بھائیوں کی نگہداشت کی ذمہ داری سنبھالی بلکہ ایک نامور عالم حافظ محمد ریاض کو دربار شریف بلا کر مولوی فاضل کا کورس مکمل کیا۔ علاوہ عربی، فارسی اور معروف اسلامی کتب پر بھی دسترس حاصل کی۔

آپؒ کو فارسی ادب سے خاصا لگاؤ تھا نہ صرف بیشتر فارسی شعرا کا کلام ازبر تھا بلکہ خود بھی فارسی، پنجابی اور اردو میں شعر کہتے تھے شاعری کے ساتھ ساتھ آپؒ نے نثر میں بھی بے شمار خدمات انجام دیں۔ خطوط کا مجموعہ "ابر کرم" کے نام سے طباعت پذیر ہوا۔ اس کے علاوہ ملفوظات "فیضانِ کرم" کے نام سے دو مرتبہ اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ "تنویر الابرار" کے نام شریعت و طریقت پر آپ کی جامع کتاب ہے جو زبان و بیان کے اظہار کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔ "اورادِ قادریہ" آپ کا ذکر و وظائف پر تلقین و ارد شاد کا مجموعہ ہے۔ ایک مختصر رسالہ نبی کریم ﷺ کے شمائل و خصائل پر "حلیہ مبارک" کا نام تحریر فرمایا۔ علاوہ ازیں دینی و ملی خدمات بھی تمام عمر جاری رہیں۔ آپ نہایت حلیم و بردبار، شفیق،

ملنسار، غم گسار، کریم النفس، مہمان نواز، خوش طبع، خوش لباس اور خوش اطوار ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدرد اور مہربان انسان تھے۔ آپؒ نے اپنی اولاد و مریدین کی ایسی تربیت فرمائی کہ آج منگانی شریف، علم و عرفان اور روحانیت کی بدولت چار دانگ عالم میں معروف و مقبول ہے۔ آپؒ ۲ جون ۱۹۹۱ء کو بروز اتوار صبح تین بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

۶. حضرت پیر محمد طاہر حسین قادری:

آپ ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۹۷۶ء بروز جمعرات طاہر آباد منگانی شریف جھنگ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حضرت پیر محمد کرم حسین قادریؒ ایک برگزیدہ اور علمی شخصیت گزرے ہیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والدین سے حاصل کی۔ پرائمری کی تعلیم گورنمنٹ پرائمری سکول دربار پیر محمد کرم حسین منگانی شریف سے حاصل کی۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول چک نمبر ۱۷۰ تحصیل و ضلع جھنگ سے امتیازی حیثیت میں پاس کیا آپ کتب بینی کے رسیا ہیں۔ آپ کے اسی شوق کا نتیجہ "کتابخانہ ابنِ کرم" لائبریری ہے۔ جس میں تقریباً ۲۰ ہزار سے زائد مطبوعہ کتب اور ۵۰۰ سے زائد خطی نسخے موجود ہیں۔ آپ کی علمی و ادبی خدمات بہت وسیع ہیں آپ نے نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ایک کامیاب شاعر اور عمدہ نثر نگار ثابت ہوئے ہیں۔ آپ کا کلیات "کلیاتِ طاہر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ آپ کی نثر میں سوانح نگاری، مکتوب نگاری، سفر نامہ، تذکرہ، تاریخ اور تحقیق شامل ہیں۔ ان تمام اصناف نثر میں آپ نے ایک جاندار اضافہ کیا ہے۔ آپ کی مکتوب نگاری میں ۷ جلدوں پر مشتمل "جواہرِ کرم" ایک یادگار ہے جس میں کم و بیش چھ سو سے زائد خطوط موجود ہیں۔ یہ کتاب کمپوز صورت میں غیر مطبوعہ ہے۔

ب۔ فکری جائزہ

I. سلسلہ قطبیہ کی مکتوب نگاری کے متصوفانہ پہلو:

تصوف میں احترام انسانیت اور ادب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ صوفیہ کے نزدیک ادب کے بغیر سلوک کی کوئی منزل طے نہیں ہو سکتی جیسے اقبال نے بھی کہا ہے۔

ع۔ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

زیرِ مطالعہ خط حضرت سید شیر محمد گیلانی قادریؒ کا ہے جو انہوں نے اپنے مرشد کریم کی خدمت میں لکھا ہے۔ القاب میں جو کلمات تحریر کئے گئے ہیں وہ جہاں عشق و محبت کا گہرا اظہار ہیں ساتھ ہی بے حد ادب و احترام کا عکاس ہیں۔ خط کا آغاز ان القابات سے کرتے ہیں۔

"جناب فیض مآب، شیخ المشائخ، قطب الاقطاب، حضور فیض گنجور، پیر دستگیر، روشن ضمیر دام ظلکم بعد از ادائے آداب بصد ہزار تسلیمات و کورنشات بجا آوردہ کے اس جگہ بفضلہٖ تعالیٰ ہر طرح سے خیریت ہے۔"(۱۶)

اور مزید

"اے پیشوائے سالکاں، تکیہ گاہ بیکساں! بندہ کو تو یہ امید تھی کہ خدا نہ کرے اگر سائیں نور سلطان اس قصور مذکور کے باعث اس خاکسار پر ناراض ہو بھی گئے تو پھر بھی آنجناب فیض مآب کے وسیلہ سے حیلہ کر کے اس عالی سرکار کو جا مناؤں گا۔"(۱۷)

تصوف کا ایک بنیادی اور اہم نکتہ جذبۂ عشق ہے۔ داراشکوہ نے سلسلہ قادریہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ زلف یار کا سلسلہ ہے۔ (سلسلۂ یار زلفِ یار سلسلۂ مابود)۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ آپ کے عاشق تھے۔ آپؐ کی محبت میں اطاعت کی وہ رمز پائی کہ حرام کیا حلال بھی ضرورت پڑنے پر ترک کر دیا۔ مرید جب تک اپنے پیر کا عاشق نہ ہو بھلا وہ دین و معرفت کی منازل کیا طے کر گا۔ ہمیشہ اطاعت اور فرمانبرداری محبت اور عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ محب محبوب کے سامنے عاجز و بے بس ہوتا ہے اور اس کا سر تسلیم خم ہوتا ہے۔ اس کی ہلکی سی رنجش اس کے پنجر کی بنیاد کو ہلا کے رکھ دیتی ہے۔ حضرت سائیں شیر محمد گیلانیؒ ایسی ہی کیفیت کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"اور ایسا کیوں نہ ہو کہ جس عاشق زار، جان نثار کا یار غم خوار اس پر ناراض ہو کر از روئے عتاب کے کچھ خطاب فرمائے اور پھر وہ اس کا اس سے کچھ جواب چاہے تو پھر وہ غریب بے نصیب سوا عجز و نیاز کے اور کیا جواب دے سکتا ہے۔ عاشق معشوق کے مقابلے میں ہمیشہ عاجز ہوتا ہے۔"(۱۸)

تصوف کا ایک اہم پہلو "رضا" ہے۔ صوفیہ کے نزدیک راضی بارضا رہنا وصلِ خداوندی کے لیے ضروری ہے۔ محبت و طریقت کا قاعدہ یہ ہی ہے کہ اپنی مرضی کو محبوب کی مرضی کے سامنے ختم کر دینا۔ اپنا ارادہ، اپنی خواہش کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا پر چلنا ہی سفر سلوک کے لیے فرض اولین ہے۔ جب تک اپنے ارادے اور خواہش میں پھنسا رہے گا۔ منزل تو درکنار سفر کی لذت بھی نصیب نہ ہو گی۔ اس لیے جو اس کی رضا کے طالب ہوتے ہیں وہ کچھ بھی طلب نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ان کی جنت اور جہنم کی تعبیر بھی بدل جاتی ہے وہ رضائے یار کو جنت اور اس کے عتاب کو جہنم سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ کا واقعہ اسی رمز و کیفیت کو اپنے ایک خط میں سید سردار علی شاہ قادریؒ یوں بیان کرتے ہیں:

> "ہم کوئی مراد نہیں مانگتے ہیں۔ جو جو تمہارے نیک آدمی ہیں ان کے بہشت ہے اور جو تمہارے گناہ گار ہیں ان کے لیے دوزخ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دونوں سے، کسی سے ہوں۔ نیک ہوں، وصل چاہیے۔ اگر بدکار ہوں تو خطا چاہیے۔ درد ہجر کی۔"[۱۹]

تصوف میں ترک دنیا کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ سلسلہ قطبیہ کے بزگارن نے ترک دنیا کو مبہم نہیں رکھا بلکہ اسے کھول کر بیان کیا ہے۔ یہاں ترک دنیا سے مراد گوشہ نیشنی نہیں۔ نہ ہی دنیاوی کام کاج چھوڑ کر بیٹھ جانے کی تلقین نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ عالیہ میں ترک دنیا سے مراد اس چیز، کام اور رشتہ کا چھوڑ دینا ہے جو اللہ کی فرمانبرداری اور رضا کے حصول میں رکاوٹ کا باعث بنے کوئی تعلق، رشتہ داری اور دنیاوی کام کاج دنیا شمار نہ ہو گا جو اللہ اور اس کے محبوب ﷺ کی اطاعت گزاری میں ہو گا۔ حضرت پیر محمد کرم حسین قادریؒ کا قول ہے۔ "مال، اولاد اور رشتہ دار دنیا نہیں ہیں بلکہ جو چیز تجھے اپنے رب سے غافل کر دے وہ دنیا ہے۔"

لہذا سالک کے لیے گوشہ نشینی اور ترک معاش کا حکم نہیں بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے اپنے ہر قول اور فعل کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع بنانا ہے۔ حضرت غلام محمد جلو آنوی اپنے مرید میاں عطا محمدؒ کو ایک خط میں ان الفاظ میں کار دنیا کی حقیقت کو عیاں کرتے ہیں۔

"آپ نے لکھا ہے کہ دنیا کے کام میں مصروف ہونا میرے لیے محال ہے۔ عزیز من جس کام کا نتیجہ حصول مراتب اخروی بلکہ رضائے خداوندی ہو وہ کار دنیا نہیں بلکہ کار خدا ہے کیوں کہ جس تعلیم خاص کی بنا پر آپ کو کارِ سرکار میں لگایا گیا ہے اُس کا نام اطاعتِ الٰہی ہے نہ کہ دنیا کا کام۔"(۲۰)

سالک طریقت کا سفر حصولِ قرب الٰہی کے لیے اختیار کرتے ہے۔ اس کے لیے وہ کئی طرح سے مشقت اٹھاتا ہے۔ اسے مجاہدہ و ریاضت کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ اس تمام معرکۂ نفس کا مقصود "فنا" ہے۔ فنا ہی دراصل مقام وصل ہے۔ فنا سے ہی دائمی استقامت نصیب ہوتی ہے۔ جس طرح ذرہ ہتھیلی پہ ہے تو ذرہ ہے اور صحرا میں گم ہو جائے تو صحرا ہی کہلاتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک فنا کے لیے استعمال ہونے والا بڑا ہتھیار کلمہ نفی اثبات ہے جسے "لا" کی تیغ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک فنا محبوب کی صفات میں گم ہونا ہے یعنی اپنی صفات چھوڑ کر محبوب کی صفات اپنا لینا یعنی محبوب کے رنگ میں رنگ جانا۔ اگر وہ کریم ہے تو تو بھی کریم بن جائے اگر وہ خلیق ہے تو تو بھی پیکر اخلاق نظر آئے۔ اسے فنا فی الصفات کہتے ہیں دوسرا فنا فی الذات ہے یعنی اپنی ہستی کو ترک دینا فنا فی الذات ہے۔ جب فنا فی الذات ہو جائے گا تو پھر اپنی آنکھ سے نہ دیکھے گا نہ کان اس کے سماعت کریں گے نہ ہی پکڑنے والا ہاتھ اس کا ہو گا۔ حضرت سائیں غلام محمد اسی بارے ایک جگہ پر یوں رقم طراز ہیں:

"نیز رکوع سے فناء الصفات اور سجود سے فناء الذات مراد ہے اور مراقبہ فنا کے بعد بقا کی حالت میں وجود موہوب الٰہی کے ساتھ استقامت میں بیٹھنا ہے کیوں کہ جب تک بقیۂ نفس ہے فتح بین یعنی کشف الٰہی ناممکن ہے۔"(۲۱)

عجز و انکسار صوفیانہ اوصاف میں سے ایسا وصف ہے جس نے روز ازل سے آدمؑ کو فرشتوں سے ممتاز و ممیز کیا۔ شیطان نے فخر کیا جب کہ اس کے برعکس حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے خطا کا اقرار کیا اور خود کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے عجز و انکسار کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے خود کو خطاکار، کمزور اور کم تر سمجھنا اس کی ذلت کے کبریا و قادر ہونے کا اظہار ہے۔ اس دل میں مقام خدا ہو ہی نہیں سکتا جس میں غرور و تکبر کا بسیرا ہو۔ قرب الٰہی کی جانب وہ ہی آگے بڑھ سکتا

ہے جو عاجز ہو۔ جو خود کو اس کے سامنے حقیر اور کم تر جانے۔ رضائے الٰہی بندے کے عجز کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ جتنا عجز اختیار کرتا جائے گا۔ اتنی ہی اس کی خوشنودی حاصل کرتا جائے گا۔ اپنے ایک خط میں حضرت جلو آنویؒ لکھتے ہیں:

"حق سبحانہٗ اپنے نیک بندوں کو لغزش کے بعد راہِ راست پر اس لیے لاتا ہے کہ وہ پارسائی کے غرور اور بے خطائی و پرہیز گاری کے فخر سے محفوظ ہو کر اپنے عجز و انکسار کے باعث اُس کی ربوبیت کا اقرار کریں۔"(۲۲)

صوفیہ کی تعلیمات میں دل کی صفائی پر خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے اور دل کو دھندلا کرنے والے امراض کی نشاندہی کر کے انہیں دور کرنے کی تاکید کی جاتی ہے کیوں کہ رضا کے منصب کو پانے کے لیے لالچ، بغض اور کینہ جیسی بیماریوں کا تدارک ضروری ہوتا ہے۔ حرص ان میں سے خاص طور پر اہم ہے۔ کہتے ہیں کہ لالچ انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ انسان اطمینانِ قلب کو کھو بیٹھتا ہے۔

عبادات ظاہری میں لذت اور روحانی تسکین کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنے باطن کو ان امراض سے محفوظ بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ حرص انسان کو مطمئن نہیں ہونے دیتی اور انسان دوسروں کو دیکھ کر یہ خیال کرتا ہے کہ فلاں کے پاس تو کوٹھی، گاڑی یا بنگلہ ہے۔ ایسے میں وہ کئی طرح کے وسواس اور غلط اطوار کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں اپنے ایک خط میں حضرت پیر محمد طاہر حسین قادری تحریر کرتے ہیں:

"اللہ کریم ہمیں راضی رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھنا چاہیے اور اوپر والے کو نہیں دیکھنا چاہیے اگر صحت مند ہے تو بیمار کو دیکھ، اگر سواری پہ ہے تو پیدل چلنے والے کو دیکھ، گھر کا دال دلیہ چلتا رہے یہ بھی ایک نعمت ہے حرص ایک ایسی بیماری ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔"(۲۳)

تعلیمات تصوف میں فقر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تمام اکابر صوفیہ کی زندگیوں میں فقر ایک نمایاں شان کی حیثیت سے دکھائی دیتا ہے۔ فقر میں انسان صبر اور شکر کا بندہ بن جاتا ہے۔ کچھ مل جائے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اگر نہ ملے تو صبر

اختیار کر لیا اور چھن جانے پر بھی زبان سے شکوہ نہ کیا۔ فقیر دنیاوی احتیاجات سے بے نیاز ہو کر دل کو یادِ الٰہی میں مگن رکھتا ہے اور یہ صرف ظاہری اور دنیاوی اسباب کے مل جانے یا چھن جانے تک محدود نہیں بل کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قرب کی طرف جاتے ہوئے اگر کچھ مل جائے تو بھی شکر ادا کرنا اور نہ ملے یار کا وٹ حائل ہو تو صبر کرنا روا ہے۔ اگر شکر کرے گا تو اور عطا ہو گا۔ اسی موضوع کے متعلق پیر غلام محمد جلو آنوی اپنے ایک مرید کو خط میں تحریر کرتے ہیں۔ جب اس پر اللہ کی طرف سے راہ سلوک میں انعامات ہوتے ہیں تو اسے شکر کی تلقین کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "احوال ظاہری و قلبی پڑھ کر شکر خداوندی ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ روز افزوں ترقی بخشے۔ آمین، نماز میں حضور قلب اور تصور شیخ کے قائم ہونے کی آپ کو مبارک ہو۔ اس نعمت الٰہی کا شکریہ ادا کریں۔ تا کہ نعمت زیادہ حاصل ہو۔"(۴۴)

II. سلسلہ قطبیہ کی خطوط نویسی کے اخلاقی و معاشرتی پہلو:

"ابرِ کرم" پیر محمد کرم حسین قادریؒ کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جس میں (۷۰) مکتوبات شامل ہیں۔ اس کتاب کو پیر محمد طاہر حسین قادری نے مرتب کیا ہے۔ ۲۳۴ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ دیدہ زیب اور جاذب نظر جل میں ۲۰۰۵ء میں مکتبہ جمالِ کرم سے اشاعت پذیر ہوا۔ پیش لفظ پیر محمد طاہر حسین کا تحریر کردہ ہے۔ اس کے بعد مکتوب نگار کا تعارف پیش کیا گیا۔ تقریظ پروفیسر نعیم انور نعمانی نے تحریر کی ہے۔ خطوط سے قبل خطوط نویسی تاریخ کے آئینہ کے عنوان سے پیر محمد طاہر حسین قادری نے مکتوب نگاری کی روایت پیش کی ہے۔

ا. ابرِ کرم کا موضوعاتی، اخلاقی، معاشرتی مطالعہ:

ایک اچھے معاشرہ کے قیام ضابطۂ اخلاق کے بغیر ممکن نہیں۔ جس معاشرہ میں اخلاقی اقدار کا فقدان ہو گا وہ بد امنی کا گہوارہ ہو گا۔ وہاں انسانوں کا طرز زندگی مثل درندوں کے ہو گا جس میں تمیز نام کی کوئی چیز نہ ہو گی یہ اخلاقیات ہی ہیں جو انسان کو جانوروں سے الگ پہچان عطا کرتی ہیں۔ دنیا کے اندر کوئی تبدیلی یا انقلاب اخلاقیات کے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد ﷺ نے تمام زندگی اخلاقیات کا درس دیا۔ یہاں تک کہ قرآن مجید نے فرمادیا۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ (سورۃ القلم) بے شک اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ ایک جگہ پر خود بھی ان الفاظ میں اظہار فرماتے ہیں۔ بعثت لاتمم مکارم اخلاق (حاکم مستدرک)

ترجمہ: میں اعلیٰ اخلاقی شرافتوں کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ ایک جگہ پر ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اخلاق کیا ہیں؟ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق "اخلاق یہ ہیں کہ کوئی تمہیں گالی دے تو تم جواب میں اسے دعا دو یعنی گالی کا بدلہ گالی سے نہ دو بلکہ اچھے الفاظ اور دعا کی صورت میں دو جو تمہیں برا کہے تم اسے اچھا کہو، جو تمہاری بدخوئی یا برائی کرے تم اس کی اچھائی بیان کرو، جو تم پر زیادتی کرے تم اسے معاف کر دو۔

معاشرے میں رواداری اور محبت انہیں اخلاقی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر پیدا کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو اپنائے بغیر ہم ایک بہتر معاشرے کی طرف گامزن نہیں ہو سکتے۔ آپؐ کی محبت اور ادب سے ہی انسان میں اسوۂ حسنہ پر چلنے کی تمنا بیدار ہو سکتی ہے۔ حضرت سائیں پیر محمد کرم حسین قادری اپنے ایک مرید جو سعودی عرب میں مقیم ہے۔ اسے شہر سرکارؐ میں رہنے کے آداب کی تلقین کرتے ہیں۔ جس سے نہ صرف محبت رسولؐ کے چشمے پھوٹتے ہیں بلکہ اخلاق حسنہ کی تربیت کے پہلو بھی نکلتے ہیں۔ تحریر کرتے ہیں:

> "خبر دار! خبر دار! خبر دار! زیادہ نزدیک رہنے والے بے ادب ہو جاتے ہیں۔ یہ آپ کا بڑا بھاری امتحان ہے۔ جس کے لیے آپ کو بلایا گیا ہے ہر وقت ڈرتے رہنا، ادب سے رہنا، کوئی بے ادبی نہ کرنا۔ خبر دار! یہ صاحبِ لولاک خواجۂ مخلوقات کی سرزمین ہے۔ اس کی ہر چیز کا احترام کرنا، کسی کو گالی نہ دینا، کسی سے جھگڑا نہ کرنا، اگر کوئی لڑنے لگے تو اس سے دور بھاگ جانا۔ اگر کوئی عربی گالیاں دے تو اس سے پرہیز کرنا اور حضورؐ کے واسطے اس کو معاف کر دینا۔"(۲۵)

جب آپ گالی کا بدلہ گالی سے نہیں دیتے اور اچھے انداز سے پیش آتے ہیں تو دوسری طرف سے بھی بدلاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے معاشرے میں حسن معاملات کی ایک روش پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جس سے معاشرہ روز بروز سدھرتا جائے گا۔

انسانیت اور امن کو تباہ کرنے میں مادہ پرستی اور دنیا کے مال و دولت کی چاہ انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور اس میں فرعونی اوصاف پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ تکبر اور غرور اس کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں اور وہ دولت اور طاقت کے نشہ میں کمزور اور کم تر لوگوں کا استحصال شروع کر دیتا ہے۔ معاشرے کے اندر محبت اور اخوت تو فروغ دینے کے لیے صوفیہ نے ہمیشہ اپنا کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے انسان دوستی کو فروغ دیا۔ وہ حب دنیا سے بیدار ہونے والی معاشرتی برائیوں سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اسے معاشرتی برائی سمجھتے ہوئے نہ صرف اس کی حقیقت بیان کرتے ہیں بلکہ اس سے بچنے کی تلقین بھی فرماتے ہیں۔ حضرت قبلہ عالم منگانویؒ اپنے ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں:

"میرے عزیز ہمیشہ اس دنیا کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھنا کہیں یہ دنیا دل میں گھر نہ کر بیٹھے ، دنیا جیب میں رکھنا، ہاتھوں میں رکھنا، آنکھوں میں رکھنا حلال ہے باعث برکت ہے لیکن دل میں رکھنا حرام ہے اور باعث عذاب ہے۔"(۲۶)

اسی خط میں مزید کچھ ایسی بیماریوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جو کہ تجلیات ذات کے لیے رکاوٹ ہیں اور یہ ہی پانچ چیزیں ہمارے معاشرتی اور اخلاقی بگاڑ کا بڑا سبب ہیں۔ ان کے کسی شخص میں موجود ہونے سے محض فرد کی شخصیت خراب نہیں ہوتی بلکہ اس کے اثرات پورے معاشرے کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ انفرادی اور اجتماعی اخلاقی گراوٹ میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کی طرف توجہ اور تدارک نہایت ضروری ہے۔ جب ان پانچ عوارض سے دل پاک ہو تو نہ صرف انسان معاشرے کا ایک کار آمد اور مفید شہری بن جاتا ہے بلکہ قرب الٰہی میں بھی جگہ پاتا ہے۔ شیخ فرماتے ہیں:

" تکبر، دشمنی، ہوس، طمع، کھیل کود ان کی پرہیز دل کے لیے فرض ہے۔ ان پانچ اشیاء سے دل صاف ہو محبت شیخ پھر رسول ﷺ، پھر محبت الٰہی جو ایک ہی چیز کے تینوں نام ہیں گھر کر جائے گی ۔ ہر طرف ہر سو، موبہ مو یار ہی یار نظر آئے گا۔"(۲۷)

حضرت پیر محمد کرم حسین قادری کے خطوط جہاں تصوف کے ترجمان ہیں وہیں اخلاقی، سماجی اور تہذیبی اقدار کو فروغ دینے میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان دوستی، بھائی چارہ، اخوت، پیار و محبت، اخلاص و ایثار، مساوات، بردباری اور فقر و غنا جیسی صفات آپ کے مکتوبات میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ اخلاقیات، روحانیت اور انسانیت کی تبلیغ ہی اولیاء

اللہ کا وطیرہ رہا ہے۔ آپؒ کے خطوط میں یہ عناصر کی جگہ پر موجود ہیں۔ آپ صلح جوی اور صلہ رحمی کا درس دیتے ہیں۔ مرید و احباب کے لڑائی جھگڑے ختم کروا کر انہیں پیار و الفت سے رہنے کا حکم دیتے ہیں۔ معاملات کو سلجھانے کا محض مشورہ نہیں بلکہ حل بھی عطا فرماتے ہیں۔ منڈی بہاؤالدین کے گاؤں کوٹ بلوچ کے متعلقین کے نام ایک خط میں دو ارادت مندوں کے درمیان صلح کروانے کا حکم فرمایا اور نصیحت فرمائی کہ ہمیں دنیا کے کاموں میں دین کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس طرح وہ اپنے خطوط کے ذریعے معاشرے میں پیدا ہوتی خرابیوں کو نہ صرف دور کرتے ہیں بلکہ ان سے اپنے دامن کو بچانے کی تلقین بھی فرماتے ہیں۔ آپ اپنے مکتوبات کے ذریعے معاشرے کی تعمیر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "میاں جان محمد و محمد شفیق چکوڑی والے محمد منظور کے رشتے میں کچھ ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے ہیں۔ آپ کو ضرور بر صرور ایک دوسرے کے ساتھ، ایک دوسرے کے پیچھے لگائیں یہ دونوں مل کر رشتہ کریں دونوں میرے مرید ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے ناراض نہ ہوں اول تو شفیق احمد اپنے ماموں کے پیچھے ہو جائے اگر وہ ضد کرے تو میاں جان محمد کو اس کے پیچھے لگا دیں۔"(۲۸)

بعض معاشرتی مسائل کا حل کسی سوال کے جواب میں تحریر کیا جاتا ہے۔ ایسے خطوط کا مکتوب الیہ تو ایک شخص ہی ہوتا ہے مگر خط موضوعاتی اعتبار سے شخصی یا ذاتی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ یہ خطوط بنام فرد واحد ہوتے ہیں مگر موضوع بحث کوئی اجتماعی، سماجی، معاشرتی یا ملکی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ ابر کرم میں ہمیں ایسے خطوط کی مثالیں ملتی ہیں۔

> "۱۔ ہمارے پاکستان میں بلا سود بنکاری یہاں شرعی لحاظ سے مشارکت و مضاربت کا پورا پورا انسان کو منافع ملتا ہے۔ جو جائز ہے۔
>
> ۲۔ کرنٹ کھاتہ امانت، یہاں پیسہ رکھ دیا جائے تو سود نہیں لگتا۔"(۲۹)

۲. جواہرِ کرم (جلد دوم) موضوعاتی مطالعہ:

یہ پیر محمد طاہر حسین کے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں ۴۹ خطوط شامل ہیں یہ کمپوز اور مجلد مگر غیر مطبوعہ ہیں۔ ان خطوط میں جہاں تصوف کے رموز و کنوز بیان کئے گئے ہیں۔ وہیں شریعت و طریقت کے اشغال و افعال کی تلقین بھی ملتی ہیں۔ یہ معاشرتی اور اخلاقی عناصر کے حوالہ سے بھی کئی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

دور حاضر میں انسان جس اخلاقی پستی کی کھائی میں جا گرا ہے۔ بنی نوع انسانیت جس زبوں حالی کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کی بڑی وجہ مادہ پرستی ہے۔ دنیا میں دولت کی جو دوڑ شروع ہو چکی ہے جس میں ہر شخص دوسرے کو پاؤں تلے روندتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ مغربی تہذیب اور افکار کا نتیجہ ہے۔ اس مادہ پرستانہ تہذیب کی بد اخلاقیاں، معاشرتی فحاشیاں، اور بے حیائیاں انسانی حیات اور اقدار کو تباہی کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ اس بے راہ روی اور مادی فکر کے پنپنے کی ایک بڑی وجہ فکرِ آخرت سے آزاد ہو جانا ہے۔ صوفیہ اکرام نے ہمیشہ معاشروں کو مثبت سمت میں عازم سفر رکھنے کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کیا ہے۔ خواہ ان کے خطبات ہوں، ملفوظات و مجالس ہوں یا نجی سطح کے خطوط وہ اپنے حلقہ میں شامل افراد کو فکرِ آخرت سے جوڑ کر ان میں اخلاقی اقدار کو بیدار رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ انہیں حرص و ہوس سے بچنے اور اپنی زندگی کے لمحات کو مثبت سمت میں خرچ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اگر انسان ہر لمحے اپنے آپ کو خدا کے حضور اور اس کی نگاہ کے سامنے سمجھے تو پھر وہ کسی بھی معاشرتی بگاڑ کی وجہ نہ بنے۔ اسے اگر خبر ہو کہ زندگی چند روزہ ہے اور اس سے اس کا حساب لیا جائے گا تو وہ اپنے شب و روز کے اعمال و افعال کو درست سمت میں متعین کرے گا۔ پیر محمد طاہر حسین اپنے ایک مرید کو زندگی اور آخرت کے معاملات میں فکر انگیز تلقین فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> "زندگی کا بھروسہ نہیں ہر سانس کو غنیمت تصور کریں ہر دن اپنا آخری دن اور ہر شب اپنی آخری شب سمجھیں۔ عارف رومی سے کسی نے دریافت کیا حضور شب قدر کون سی رات ہے؟ فرمایا اگر تو صاحبِ بصیرت ہے تو ہر شب تیرے لیے شب قدر ہے"۔[۳۰]

اسی موضوع پر ایک خط میں دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اس دنیا میں اک مسافر کی طرح آئے ہو۔ یہ چند روزہ ہے لہذا غفلت میں پھنس کر اپنے آپ کو خراب نہ کرو بلکہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اللہ تعالیٰ کی یاد پر قول، فعل اور عمل

میں اپنا رفیق بنالو اور خود کو کبھی بھی تنہا نہ سمجھو۔ جب انسان خود کو خدا کی نگرانی میں سمجھے گا تو وہ معاشرہ میں اچھا کردار اور عمل پیش کرے گا لکھتے ہیں:

"یہ دنیا فانی، گذشتی و گذاشتی ہے اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے انسان چند گھڑیوں کے لیے اس جہان کے بازار میں حصول حسنات طیبات کے لیے بمنزلہ مسافر آج آیا ہے اور کل عالم آخرت کو چلا جائے گا۔"(۳۱)

عجز و انکسار ایک ایسا اخلاقی وصف ہے جس کو شخصیت اور کردار میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایسی اخلاقی خوبی ہے جس پر نبی کریم ﷺ کو فخر تھا۔ عجز دل سے ذات کو کمتر اور حقیر سمجھنا اور غرور تکبر کا شکار نہ ہونا جس کے لغوی معنی عاجز ہونا، خاکسار ہونا کے ہیں۔ اگر انسان اپنی فضیلت و برتری کے اظہار کی بجائے اسے پوشیدہ رکھتا ہے۔ تو وہ عجز اختیار کرتا ہے۔ تکبر اس کی ضد ہے جہاں تکبر سے معاشرے میں فتنہ و فساد پیدا ہوتے ہیں وہاں عجز و انکسار سے محبت و یگانگت کے جذبے پروان چڑھتے ہیں۔ تکبر انسان کے لیے بد بختی کا دروازہ کھولتا ہے جبکہ عجز خدا کی دہلیز تک لے جاتا ہے ۔صوفیہ عظام جہاں خود عجز و انکسار کا نمونہ ہوتے ہیں وہاں وہ اپنے متعلقین کو بھی اسی راہ پر گامزن رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ پیر محمد طاہر حسین قادری بیشتر اپنے احباب کو عجز و انکسار کا راستہ دکھاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب آپ ایک انگلی کسی کی طرف اٹھاتے ہیں تو تین آپ کی اپنی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اکثر فرماتے ہیں اپنے سے بڑے کو دیکھو تو اس لیے بہتر سمجھو کہ عمر میں تم سے بڑا ہے لہذا اس کی نیکیاں بھی تم سے زیادہ ہیں اور اپنے سے کم عمر کو دیکھو تو سمجھو کہ مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے لہذا اس کے گناہ بھی مجھ سے کم ہیں۔ ایسی فکر اور سوچ سے نہ صرف انسانیت ایک دوسرے کا اکرام و احترام کرتی ہیں بلکہ ان کے اندر محبت اور اتحاد کی فضا مستحکم ہو جاتی ہے۔ اپنے ایک مکتوب میں اس ضمن میں یوں لکھتے ہیں:

"اے بھائی! درویشوں کے زمرہ میں کوئی بھلائی یا اچھائی دیکھنی ہو تو وہ دوسروں میں دیکھی جاتی ہے اگر کوئی برائی یا خامی دیکھنی ہو وہ اپنے آپ میں دیکھتے ہیں۔"(۳۲)

خدمت خلق کسی بھی معاشرے کی خوشحالی اور ارتقاء کے لیے لازم ہے۔ مسلمانوں نے اسلامی ریاست کی بنیاد ہی فلاح انسانیت پر رکھی۔ خدمت خلق کا لفظ اپنے معنی اور دائرہ کار کے لحاظ سے بہت وسیع ہے۔ اس میں زندگی کا ہر شعبہ اور پہلو آجاتا ہے۔ جس میں مسکینوں کی خبر گیری، غرباء مستحقین کو کھانا کھلانا، صنعت و حرفت سکھانا، بیوہ اور یتیم کی دادرسی کرنا، حاجت مند کا نکاح کروانا، لوگوں سے حسن سلوک کرنا، رفاعی کاموں میں حصہ لینا وغیرہ شامل ہے اور یہ تمام کام صوفیہ کی خانقاہوں پر ہمہ وقت شد و مد سے جاری و ساری رہتے ہیں۔ حضرت پیر محمد طاہر حسین خدمت خلق کے اور پہلو بھی روشن کرتے ہیں جو کہ اپنی ذات اور اپنے حلقۂ احباب سے باہر نکل کر دوسروں کی خوشی اور غم میں شمولیت ہے آپ اپنے وقت اور اپنی موجودگی کے احساس سے دوسرے کے دل کے بوجھ کو کم کریں، کسی کا غم ہلکا کریں تو کسی کی خوشی کو دوبالا کریں۔ آج کے دور کی یہ ایک اہم ضرورت بھی ہے کہ جس میں انسان اپنی ذات کی گرفت میں آچکا ہے۔ صرف اپنے نفع نقصان اور غم و انبساط کو ہی دیکھتا ہے۔ اپنے ایک خط میں ایک درویش کو نصیحت فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> "اللہ کریم کا ہمارے لیے یہ ارشاد ہے کُنتُم خَیرَ اُمۃٍ اُخرِجَت للناسِ۔ اور ہمارا یہ حال ہے کہ اپنے ہی حلقہ میں وقت گزار کر خوش ہو جاتے ہیں اصل کام تو احباب سے باہر نکلنا ہے۔ دوسروں کی سننا اور اپنی سنانا، لوگوں کی غمی، خوشی میں شریک ہونا مگر دعوت و تبلیغ برقرار رہے۔ اس سے بڑھ کر خدمتِ خلق اور کیا ہو سکتی ہے۔"(۳۳)

معاشرے میں امن و محبت تبھی قائم ہو سکتا ہے جب مساوات کو اپنایا جائے۔ دوسروں کی حق تلفی نہ کی جائے۔ جہاں معاشرتی توازن بگڑ جاتا ہے وہاں کمزور کمزور تر اور زردار زردار بن جاتا ہے۔ واحد گروہ صوفیا ہے جو اللہ کی مخلوق کو ایک نظر دیکھتا ہے اور ہر مسکین اور غریب کی ہر ممکن مدد کے لیے کوشاں نظر آتا ہے۔ ان کے دروازے تک پہنچنے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ ہمیں فلاحی معاشرے کے قیام کے لیے صوفیانہ طرز عمل اختیار کرنا پڑے گا۔ پیر محمد طاہر حسین ایک غریب کی استعانت کے لیے حضرت خواجہ حمید الدین سیالوی کو خط لکھتے ہیں کہ جس میں ایک مسکین آدمی کو وہاں زمیندار جن میں صاحبزادہ صاحب کا ڈرائیور بھی شامل ہے اس کو پریشان کرتے ہیں اس کی دادرسی کے لیے آپ حضرت کی خدمت میں کچھ ان الفاظ میں عرض گزار ہیں:

"بصد آداب و نیاز عرض ہے کہ حامل عریضہ میاں محمد نواز حاضرِ خدمت ہے۔ عرضداشت زبانی عرض کرے گا۔ نہایت مسکین درویش ہے چند زمیندار لوگ حضرت صاحبزادہ کے ڈرائیور ہونے اور عنایت نامہ کا عذر پیش کرتے ہوئے اسے پریشان کرتے ہیں۔ جناب اپنے موروثی اخلاقِ کریمہ اور غریب نوازی کا مظاہرہ فرماتے ہوئے کرم گستری فرمائیں۔"(۳۴)

III. سلسلہ قطبیہ کی مکتوب نگاری اصلاحی پہلو:

کائنات جب سے آباد ہوئی۔ اس میں کئی معاشرے سماج اور تہذیبیں پیدا ہوئیں اور پھر ان کا وجود صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گیا۔ اسلام نے ایک ایسے فلاحی معاشرے کی بنیاد رکھی۔ جس کی مثال سابقہ مذاہب میں نہیں ملتی۔ اسلام نے جو معاشرتی ڈھانچہ اور ضابطۂ حیات پیش کیا کوئی دوسری قوم، مذہب یا ریاست اس جیسا نظام پیش نہیں کر سکی۔ آج بھی دنیا میں جو سماجی اور معاشرتی انحطاط ہے وہ اسلام سے دوری کی بدولت ہے۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات رکھتا ہے جس میں فرد سے لے کر ریاست تک سب کے لیے تربیتی اور اصلاحی پہلو موجود ہیں۔ یہ اسلامی تعلیمات کا ہی خاصہ ہے کہ یہ محض فرد کی تربیت کی ترجمانی نہیں بلکہ اس میں کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔ (صحیح مسلم ص: ۱۲۲) گھر اور خاندان کی اصلاح کی ذمہ داری بھی موجود ہے بلکہ "فرمان کل کم راعی و کل کم مسئولا تم میں سے ہر کوئی راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"(۳۵)

تاریخ برصغیر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا یہ صوفیہ ہی تھے جنہوں نے اپنے عمل اور کردار سے غیر مسلموں کے دل میں اسلام کی محبت اجاگر کی۔ جس کی بدولت ایک مسلم معاشرے کا قیام ممکن ہو سکا۔ انہوں نے اپنے پاکیزہ اخلاق و کردار سے معاشرے کی سماجی، معاشرتی اور معاشی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ان اولیاء اللہ نے ملک کے طول و عرض میں خانقاہیں قائم کیں۔ (جن سے ہمہ وقت لوگوں کے معاشی حالات جس میں کھانا اور رہائش شامل ہیں، سماجی اور اخلاقی ضروریات کا بندوبست جاری رہتا ہے۔)

جہاں سے انسانیت ہمہ وقت، معاشی، معاشرتی، اصلاحی، اخلاقی اور روحانی تربیت کا فیض حاصل کرتی ہے۔ یہ وہ زاویے ہیں جہاں سے اصلاح معاشرہ کا کام کبھی بھی اختتام پذیر نہیں ہوا۔

سلسلہ قطبیہ کے مکتوب نگاروں نے اصلاحی پہلوؤں پر خاص توجہ دی ہے۔ ان مکتوبات میں اصلاحی و اخلاقی، مذہبی و روحانی، موت کی تیاری، فکر آخرت، دنیا کی بے ثباتی، ایثار، اخوت و ہمدردی، عشقِ الٰہی اور محبت رسول اللہ ﷺ کا ذکر ملتا ہے۔ ان حضرات کی تعلیمات میں تکبر، حرص اور انا جیسی مہلک سماجی برائیوں کی نفی کا سبق دیا جاتا ہے۔ انسان کی "انا" میں جو فساد پوشیدہ ہیں ان کی تربیت و اصلاح کرتے ہوئے پیر محمد طاہر حسین اپنے ایک خط میں معاشرے میں حرف "میں" سے پیدا شدہ بگاڑ کی نشاندہی اور اصلاح ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> "اے درویش! تمہارے لیے "میں" سے بڑا کوئی اور حجاب نہیں جس چیز کو ختم کرنے کا حکم تھا وہ مرید ہونے کے بعد ہماری دوگنی ہو جاتی ہے۔ جسے مارنا تھا اسے زندہ رکھنے کی صبح و شام تگ و دو ہے ہر شخص کچھ نہ کچھ بننے کے چکر میں ہے۔ ملازم ہے تو چاہتا ہے کہ افسر بن جاؤں، نوکر ہے تو چاہتا ہے مالک بن جاؤں، طالب علم ہے تو چاہتا ہے کہ مولوی بن جاؤں، مرید ہے تو چاہتا ہے کہ پیر بن جاؤں، مرشد بنا تو مراتب کے چکر میں ہے لیکن منزل پر وہی پہنچتا ہے جو بننے اور بنانے کے چکر میں نہ پڑے۔"(۳۶)

دورِ حاضر میں اخلاقی انحطاط کا یہ عالم ہے کہ جن کا کام اصلاح کرنا ہے وہ خود قابلِ اصلاح نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی چند پہلوؤں کی طرف دردمندانہ توجہ دلاتے ہوئے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری اپنے ایک خلیفہ محمد سعید کو موجودہ حالات پر تشویش کے ساتھ ساتھ ان رویوں کے بدلنے کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ مریدین کے ساتھ پیران عظام کا رویہ آج کل کیسا ہے؟ عجز و انکسار اور کسر نفسی جن کا طرۂ امتیاز تھا۔ دور دور تک اس کے نشانات ملتے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو سب سے بڑا پیر سمجھتا ہے اور کسی دوسرے کا وجود تک گوارا نہیں کرتا حضرت نے موجودہ دور کے مشائخ عظام اور خانقاہی نظام میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ ان کی اصلاح کرتے ہوئے جس حالت زار کا انکشاف کیا ہے وہ خانقاہی نظام کے ورثاء اور سجادہ نشینان کے لیے لمحہ فکریہ بھی ہے اور چشم کشائی کا ایک موقعہ بھی۔ اس خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"آج تو ہر ایک نے علیحدہ اپنی جماعت بنا رکھی ہے۔ ساتھ چلنا تو الگ بات ہے ایک جلسہ میں بھی ایک دوسرے کو گوارا نہیں کر سکتے۔ ہر کوئی اپنی ذات کے اندر شیخ الاسلام و المسلمین ہے جو لوگ اس مرتبہ کے حامل تھے وہ عرصہ ہوا قبروں میں چلے گئے۔ اب تو بقول اقبال

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

آج کل تو کوئی پیر صاحب کہہ کر بلائے شرم آتی ہے۔"(۳۷)

مزید لکھتے ہیں

"یہاں برطانیہ میں بھی ہمارے حضرات نے وہ گل کھلائے ہیں کہ بس کچھ نہ پوچھا جائے نام لیں تو غیبت بن جاتی ہے۔ صبح و شام ہر کوئی مانگ رہا ہے گویا مانگنے کے علاوہ انہیں اور کچھ آتا ہی نہیں۔ مانگنے کے لیے طرح طرح کے ڈھونگ رچا رکھے ہیں۔ الامان و الحفیظ ہمارے اسلاف تو فرمایا کرتے تھے۔

مانگنے سے سولی بھلی، جو ترت نکالے جی

جے پُت چاہیں اپنی، تاں پانی وی منگ نہ پی

بھلا مانگنا بھی کوئی چیز ہے۔ حضور قبلہ عالم فرمایا کرتے "جو پیر اپنے مرید سے مانگتا ہے وہ اسے دے کچھ نہیں سکتا۔" (میں فرماتے "جس روز کسی مرید سے کچھ مانگو گے اس روز تمہارے گھر میں فقیری نہیں رہے گی۔"(۳۸)

انسان کے پاس زندگی سے زیادہ قیمتی کچھ نہیں اور حیات انسانی کی انمول چیز وقت ہے۔ اہل اللہ کے نزدیک تو سانس لینے کی مہلت کو رائیگاں نہیں جانے دیا جاتا۔ جس لمحہ میں ہم جی رہے ہوتے ہیں وہ لمحہ موجود اسی شخص کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ثابت ہو سکتا ہے جو اس کی قدر و منزلت سے آگاہ ہے اور جو اس کا مصرف جانتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک "آج" بڑا اہم ہے۔ حضرت قبلہ عالم منگانویؒ فرماتے ہیں کہ زندگی کے کلیہ تین دن ہیں۔ پہلا دن محبوب سے تعلق استوار کرنے کا،

دوسرا دن اس کے انتظار کا اور تیسرا دن اس کے دیدار اور ملاقات کا۔ جس کا پہلا دن کاہلی اور سستی میں بسر ہوا اس کا ملاقاتی اور وصالی ہونا ناممکن ہے۔ وقت کی قدر و قیمت سے آگاہ کرتے ہوئے حضرت پیر محمد طاہر حسین اپنے مرید کے نام خط میں یوں رقم طراز ہیں:

"انسان کی زندگی کے تین ادوار ہیں۔ ا۔ ماضی، ۲۔ حال، ۳۔ مستقبل۔ ماضی گزر گیا اس کا لوٹنا اب ناممکن ہے۔ مستقبل کا بھروسہ نہیں پتا نہیں آئے گا بھی یا نہیں رہ سہہ کے یہی حال بچتا ہے۔ یہی ہمارا سرمایۂ حیات ہے۔ اس کی قدر کرو اور حتی الوسع فائدہ اٹھاؤ۔"(۳۹)

زندگی جہدِ مسلسل کا نام ہے۔ انسانی حیات کے بارے اقبال بھی اسی فلسفہ کو بیان کرتے ہیں کہ زندگی عمل سے عبارت ہے۔ جیسا کام کرو گے ویسا ہی صلہ ملے گا۔ جو بیجیں گے وہ ہی کاٹیں گے۔ آج کا مسلمان عمل سے خالی اور سست روی کا شکار ہو چکا ہے۔ اپنی کاہلی اور بے عملی کی بدولت مسلمان روبہ زوال ہیں۔ ایک مسلمان جس قدر اپنے آپ کو مکمل انسان بنائے گا اسی طرح وہ دنیا میں اسلام کی رونق کا موجب ہو گا۔ دنیائے اسلام کی ترقی اس وقت ہو گی جب اس کے سارے اجزاء یعنی تمام مسلمان ہر لحاظ سے اپنے آپ کو کامل انسان بنالیں گے۔ صوفیہ کرام اپنے علم و عمل اور کردار سے ہمیشہ اپنے پیروکاروں کو انسان کامل بننے کی ترغیب دیتے ہیں وہ ہر لحاظ سے اصلاح فرد اور اصلاح معاشرہ کے داعی ہوتے ہیں۔ پیر محمد طاہر حسین قادری اپنے ایک خط میں اپنے مرید کی تربیت و اصلاح فرماتے ہوئے اسے اسی جذبہ عمل اور جہد مسلسل کا درس دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہمارا حال ہمارے سامنے ہے۔ عمل اور تڑپ سے یکسر خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر بات کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیتے ہیں۔ قصور سارا اپنا ہے ہمیشہ فرسودہ خیالات کی تاویلیں کرتے ہوئے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرتے ہیں جب فیصلہ خود ہی کرنا ہے تو پھر محاسبہ کی کیا ضرورت ہے لہذا فرصت کے فریب سے بچو۔ ہمیشہ عمل پیہم پر کاربند رہو۔ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔"(۴۰)

صوفی معاشرے کا نباض اور طبیب ہوتا ہے۔ اس کا کام صرف مرض کی تشخیص نہیں بلکہ اس کا علاج تجویز کرنا بھی ہوتا ہے۔ ایک کامیاب معالج وقت پر مرض کا علاج کر کے مریض کو شفایاب کر دیتا ہے۔ آپ معاشرے میں جو بھی بیماری یا

مرض دیکھتے ہیں اس کا بروقت علاج کرتے ہیں خواہ اس سے مریض کے جسم کا کوئی حصہ کاٹنا ہی کیوں نہ پڑے۔ پیر محمد طاہر حسین دور حاضر کی مذہبی روایات میں جو قباحتیں اور کمزوریاں رائج ہو گئی ہیں۔ ان کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتے ہیں۔ خواہ یہ ان کی اپنی ذات اور اپنے منصب کی طرف ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ان کے رویوں کو ختم کرنے اور دین حق کی اصل روح کو زندہ کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ خانقاہی نظام جس تباہی کی طرف گامزن ہے اسی کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس میں پیدا شدہ نقائص کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ایک خط میں یوں اظہار کرتے ہیں:

> "درباروں پر تبلیغ و اشاعت اور ذکر و فکر کے ساتھ ساتھ اتباع شریعت کا نظام بحال کیا جائے آج کل پیشتر درباروں پر نظامِ خانقاہی مفقود ہے۔ اگر کوئی مشاہدہ کرنا چاہے تو ج اکر دیکھ لے درباروں پر اکثریت میں وہ لوگ نظر آئیں گے جو مزاراتِ مقدسہ کی زیارات و آداب سے بھی مکمل طور پر واقفیت نہیں رکھتے۔ جس کے من میں جو آتا ہے وہی کرتا ہے۔ بدنامی درباروں کی ہوتی ہے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں شاید یہی "سنیت" ہے۔ جاہلوں کی ایک حرکت سے بد نامی سارے مسلک کی ہو جاتی ہے۔"(۴۱)

عہدِ حاضر کا ایک اور بڑا گروہ جو اصلاح معاشرہ کے نمائندہ کی حیثیت سے سماج میں جانا جاتا ہے۔ اس کو بھی آڑے ہاتھوں لیتے ہیں اور ساتھ ہی سامعین کی بھی گوش کشائی کرتے ہیں۔ ہماری محافل میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کا خوب آئینہ دکھایا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے کے اس علمی اور اصلاحی گروہ میں جو بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ علمائے حاضر اور عام الناس کو ان کے موجودہ رویے کا آئینہ کچھ ان الفاظ میں دکھاتے ہیں اور شعوری سطح پر ضمیر کو جھنجھوڑنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک علماء کو محض کھوکھلے نعروں اور واہ واہ سے غرض ہے اور عوام کا یہ حال ہے کہ محفلوں میں اچھلنا، نعرہ بازی اور یہ کوشش کرنا کہ وڈیو میں تصویر آنی چاہیے۔ ہر کوئی سستی شہرت کے پیچھے پڑا ہے۔ اخلاص نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ حضرت پیر محمد طاہر حسین اپنے ایک خط میں اس صورتِ حال کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"تبلیغ و اشاعت اسلام میں علمائے حق کی نمایاں خدمات ہیں لیکن موجودہ دور میں اکثر کا دائرہ خطاب چند رٹے ہوئے الفاظ مخصوص اندازِ بیاں اور محل و قوع کی مناسبت سے رٹے ہوئے چند اشعار پر منحصر ہوتا ہے۔ خطاب کیا شروع ہوا۔ جیسے کیسٹ ریکارڈ شدہ لگا دی گئی ہو وقفہ صرف نعرہ بازی کے لیے اور معین وقت پر بات ختم۔"(۴۲)

دوسری طرف عوام کا حال دیکھیے:

"ادھر ہماری قوم کا یہ حال ہے دورانِ خطاب اچھل اچھل کر نعرے لگائیں گے لیکن گھر سے قسم کھا کر آئے ہیں اس بھلے مانس کی ایک بات بھی یاد نہیں کرنی۔ جیسے خالی دامن آئے تھے ویسے ہی خالی دامن گھر لوٹ گئے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور لوگ بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔"(۴۳)

"پیام جلوی" حضرت غلام محمد جلو آنوی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جس میں کل ۲۲ خطوط شامل ہیں۔ پہلے ۱۷ خطوط منظوم فارسی کلام ہے باقی پانچ خطوط اردو میں ہیں۔ ان خطوط میں اصلاحی پہلو بہت شاذ ہیں۔ یہ خطوط مبالغہ اور مکمل مداحی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک خط میں عجز و انکسار کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں میں آپ کی حمد بیان نہیں کر سکتا اور دل پر جذب کی جو کیفیت ہے اس میں شاد کام ہوں۔ اپنی آنکھوں کی ایک بیماری کا ذکر کرتے ہیں اور اس پر رضا کا اظہار کرتے ہیں اور تکلیف کو اس کی طرف سے سمجھتے ہوئے خوشنودی کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ جس حال میں رکھے اسی میں خوش رہنا چاہیے۔ اس ضمن میں پیر غلام محمد جلو آنوی ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"آپ کی حمد بے شمار ہے مگر عجز کا اقرار ہے۔ دل کا حال کاغذ پر لکھنا محال ہے۔ سینے میں جوش ہے مگر زبان خاموش ہے۔ الٰہی یہ جذبہ نصیب رہے اور ہر دم قریب رہے دل پر جوش اور تن میں خروش ہے۔ آنکھوں میں حرارت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ حالت عجیب مزہ دکھا رہی ہے اور زیادہ ہو ، اور زیادہ ہو، اور زیادہ ہو۔"(۴۴)

ج۔ سلسلہ قطبیہ کی مکتوب نگاری کا فنی و اسلوبی جائزہ

i. فنی پہلو:

اگرچہ خط کا تعلق تحریروں سے ہے لیکن مکتوب نگاری ایک فن ہے۔ زندگی کی طرح خط بھی اپنی راہ خود متعین کر لیتا ہے۔ یہ حیات انسانی میں جذبات کے اظہار کا انوکھا طرز ہے۔ یہ اپنی تاثیر اور جذبہ کے اظہار کی بدولت ادب کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی تحریر کرتے ہیں:

> "خط یا مکتوب بنیادی طور پر ادب نہیں بلکہ خطوط اپنی خاص خوبیوں کی وجہ سے ادب کا درجہ پا جاتے ہیں اور بعض اوقات ادب عالیہ میں شمار ہونے لگتے ہیں۔"(۴۵)

ڈاکٹر سید عبداللہ "خط" کو ادب میں شامل کرنے کے لیے کچھ شرائط مقرر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق

> "خط نگاری خود ادب نہیں مگر اس کو خاص ماحول، خاص مزاج، خاص استعداد، ایک خاص آن، خاص گھڑی اور خاص ساعت میسر آجائے تو یہ ادب بن سکتی ہے۔"(۴۶)

"ابر کرم" میں موجود زیادہ تر خطوط عزیز و اقارب، دوست احباب، رشتہ داروں، خلفاء مریدین اور متوسلین کے نام ہیں۔ اس لحاظ سے ان خطوط کا شمار شخصی خطوط میں ہوتا ہے۔ یہ خط ذاتی تعلقات کو مستحکم کرنے اور محبت و الفت کو فروغ دینے کے لیے بھی لکھے جاتے ہیں کیونکہ خط دو شخصیات کے درمیان جذباتی مکالمہ ہے۔ قبلہ عالم پیر محمد کرم حسینؒ اپنے بھانجے کو خط لکھتے ہیں اور جذبات کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "اس کے بعد باقی لوگ جن میں سر فہرست سخی حسین اور بس سخی حسین ہے۔ میں تم کو اپنا سب سے پیارا فرزند سمجھتا ہوں اور انشاءاللہ یہ حقیقت ہے دعا کرتے رہا کریں اللہ تم کو میرے دل میں اسی مقام پر رکھے۔"(۴۷)

اپنے ایک پیارے مرید محمد مبارک علی نثار کو ایک خط میں نئے سال کی مبارک پیش کرتے ہیں اور ساتھ ملاقات کے لیے کہتے ہیں۔ اس خط میں بھی آپ کی قلبی محبت اور احساسات کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے۔ ذاتی خطوط کے حوالے سے اس میں مبارک باد اور ملاقات کے عناصر موجود ہیں علاوہ یہ ایک معلوماتی حوالہ بھی ہے۔ مکتوب نگار اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"نیا سال آپ کو اللہ رسول کی طرف سے بلندیوں اور خوشیوں کا سال ہو۔ آمین۔ آپ نے خیریت نامہ میں فرمایا تھا کہ میں ۱۱ جنوری کو چھٹی پر آؤں گا اگر آئیں تو ہمیں شرف ملاقات سے نوازیں۔ میں جنوری اور فروری کا مہینہ ملتان شہر میں ہوں یہاں کچھ علاج کروا رہا ہوں۔ میرے مکان کا علم بھائی سراج دین کو ہے ان کو ساتھ لے لیں۔"(۴۸)

خطوط میں جہاں مکتوب نگار کے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار ہوتا ہے وہاں یہ کئی قسم کے ذاتی اوصاف و خصائص سے بھی مزین ہوتے ہیں۔ حضرت قبلہ عالم منگانویؒ کے خطوط میں آپ کا درد دل اور ہمدردی کا جذبہ واضح دکھائی دیتا ہے۔ آپ اکثر و بیشتر ضرورت مندوں کے لیے اپنے تعلق خاطر والے افراد کو امداد کے ہدایت دیتے ہیں۔ اپنے ایک خط میں اپنے مرید کے لیے نوکری کے حصول کے لیے یوں ہدایت فرماتے ہیں:

"حامل ہذا رقعہ گل شیر احمد ولد سلطان احمد پرائیں شیخ میرا مرید ہے۔ اس کے لیے میں نے آپ کو عرس کے موقع پر کہا تھا کہ کہیں نہ کہیں گورنمنٹ کی ملازمت اگر مل سکے تو بڑی بات ہے۔ کارِ ثواب ہے۔ آپ کاغذات وصول کریں اور اپنی پوری پوری کوشش کریں اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔"(۴۹)

آپؒ اپنے خطوط میں جہاں پند و نصیحت کرتے ہیں۔ دنیا و دین سے متعلق معاملات میں تربیت فرماتے ہیں۔ جہاں زیادہ تر تحریریں معاشرتی تعمیر کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہاں کہیں کہیں بیماری اور بیمار پرسی کی تحریریں بھی موجود ہیں۔ گو کہ اپنے احباب سے ہر طرح سے تکلم فرماتے۔ خطوط میں مزاح بھی فرمالیتے۔ اپنے ایک مرید حاجی محمد نواز کو جو سعودی عرب

مقیم تھا۔ خط تحریر کرتے ہیں اور بڑے خوبصورت انداز میں انہیں ذاتی خوشی کی خبر ذاتی طور پر سناتے ہیں۔ تحریر کرتے ہیں:

"آپ کو تازہ خبر سنائیں کہ عزیزم اختر حسین کی شادی ہو گئی ہے لہذا ان کی تنہائی کے دن کٹ گئے اور اب طبیعت خاطر مشغول اور مصروف اور مسرور زندگی گزار رہے ہیں لہذا آپ کو مبارک ہو۔"(۵۰)

"مآثر شیر یزدانی" میں موجود خطوط کا زمانہ ۱۹۰۲ تا ۱۹۶۴ بنتا ہے۔ اس مجموعہ خطوط میں اُن صوفیہ کے خطوط شامل ہیں۔ جن کا اسلوب قدیم صوفی نثر پر ہے۔ ادب و آداب کو بالخصوص ملحوظ رکھا گیا۔ مکتوب الیہ کے لیے پر تکلف القاب کا اظہار ملتا ہے اور مکتوب نگار جز و انکسار کا نمائندہ ہے۔ یہ خطوط نویسی کی قدیم طرز مراسلت ہے۔ طویل اور پر تکلف القابات خطوط کا آغاز ایک اچھوتے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ حضرت شیر محمد گیلانیؒ اپنے مرشد کی بارگاہ میں ان الفاظ میں مخاطب ہوتے ہیں:

"جناب فیض مآب، شیخ المشائخ، قطب الاقطاب، حضور فیض گنجوز، پیر دستگیر، روشن ضمیر دام ظلکم۔"(۵۱)

القاب و آداب میں ہم آواز الفاظ کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ مکتوب نگار اپنے لیے عجز و انکسار کا اظہار کرتے ہوئے نیاز مندانہ انداز میں تحریر کرتے ہیں:

"الراقم فقیر حقیر پُر تقصیر خاکپائے عارفاں سید شیر محمد"(۵۲)

جب مکتوب الیہ مرشد کی ذات نہیں تو پھر نہ ہی وہ ادب و احترام کا التزام ہے۔ نہ پر تکلف القابات کا اہتمام نظر آتا ہے، نہ ہی مکتوب نگار کے ہاں وہ عجز و انکسار دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہی مکتوب نگار یکدم زمانۂ قدیم سے نکل کر رنگ غالب میں ڈھل جاتا ہے۔ بالکل سادہ اور عام فہم طرز تخاطب نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ بوٹا رام کو خط لکھتے ہیں۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ "برخوردار بوٹا رام دعا باشد"

خط کے اختتام پر نہایت سادگی کے ساتھ مکتوب نگار کے لیے لکھتے ہیں

"زیادہ دعادار سید شیر محمد فتح پور شریف"(۵۳)

آپ کے ہاں مکتوب الیہ کے لیے القابات میں قافیہ آرائی اور ترنم کا اہتمام بھی نظر آتا ہے۔ ایک مکتوب میں اللہ دتہ خان کو ان القابات سے مخاطب کرتے ہیں۔

"عزیز القدر عزیز از جان محمد میاں اللہ دتہ خان سلم اللہ تعالیٰ۔"(۵۴)

جواہر کرم کا فن و اسلوب:

مکتوب کا تعلق سوانحی ادب سے ہے اور سوانح کا بنیادی جز صداقت ہے۔ خطوط زیادہ نجی نوعیت کے ہوتے ہیں لہذا ان میں شخصیت زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ خطوط سوانح سے بھی زیادہ صداقت کے امین ہوتے ہیں۔ تصوف کا روبار ہی سچ کا ہے۔ یہاں ڈھونگ سے کام نہیں چل سکتا۔ "جواہر کرم" حضرت پیر محمد طاہر حسین قادری کے مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ آپ کی تحریریں صداقت کی آئینہ دار ہیں۔ آپ خود سنی مسلک اور قادری مشرب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اپنے ایک خط میں دورِ حاضر میں اس مسلک و مشرب میں پائے جانے والے عیوب کو بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> "آج کل ہمارا یہ حال ہے کہ عقیدہ تو بہت اچھا رکھتے ہیں لیکن فرائض و واجبات سے کوسوں دور گویا بے عملی کا دوسرا نام "سنیت" بن گیا ہے۔ آج وقت ہے کل وہ بھی میسر آئے گا یا نہیں ہمیں اپنے گریباں میں جھانکنا چاہیے۔"(۵۵)

سچ کڑوا ہوتا ہے مگر صداقت اور امانت ہی اسلام کی بنیاد ہیں۔ انسان کو اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ چاہے وہ تحریر ہو، تقریر ہو یا حسن عمل کی بات ہو۔ حضرت یہاں اپنے معاشرے کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ آج زمانہ جس ڈگر پہ چل نکلا ہے وہ راستا ہمارے معاشرے کا ہے۔ جس سے ہم تقسیم در تقسیم ہوتے جائیں گے۔ اس روش سے ایک عدم برداشت کا معاشرہ جنم لے رہا ہے اور یہ ہمارے انفرادی اور اجتماعی رویوں کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ پیر محمد طاہر حسین اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"ایک دوسرے کو برداشت کرنا آج کل اس کا بڑا فقدان ہے ہماری اس قدر شامت آئی ہے کہ ایک پیر دوسرے پیر کو برداشت نہیں کرتا۔ ایک مولوی دوسرے مولوی کو برداشت نہیں کرتا ۔بس ماشما دیگرے نیست والا معاملہ ہے۔"(۵۶)

آپ کے خطوط ہمیں کسی خیالی دنیا کا پتا نہیں بتاتے بلکہ یہ حقیقی دنیا کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف اپنے آپ عیب کو تلاش کرنے میں مدد گار ہیں بلکہ اس مرض کا علاج بھی لیے ہوے ہیں۔ عہد حاضر میں انسان دنیادار اور مادہ پرست بن چکا ہے۔ اور دل جو مقام الٰہی ہے دنیا کے وہموں کا اکھاڑہ بن چکا ہے۔ مردہ دلوں کو دوبارہ زندہ ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ کے نزدیک دلوں کی زمین اس قدر بنجر ہو چکی ہے کہ اس پر نصیحت کے بیج فصل پیدا نہیں کر سکتے بلکہ اسے دوبارہ زرخیز بنانے کے لیے کسی کامل کی نگاہ درکار ہے۔ جس کے لیے دل زندہ کروانے والے کی سچی طلب ضروری ہے جو فی زمانہ بہت کم یاب ہو چکی ہے۔ ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں:

"شاید ہمارے دل مردہ ہو چکے ہیں کہ نصائح سے ان کی تقدیر نہیں بدلی جاسکتی۔ پھر کسی مرد کامل کی نگاہ کی ضرورت ہے جو اسے فانی سے باقی کی طرف متوجہ کرے لیکن اس میں بھی طلب صادق کی ضرورت ہے جس کا ہم میں یکسر فقدان ہے۔"(۵۷)

مزید معاشرے کی بے عملی جس کا ہر کوئی شکار ہو چکا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آجکل علم جس قدر عام ہو گیا ہے اتنا ہی عمل جاتا رہا ہے۔ ہر طرف بے عملی کا راج ہے ہم جس قدر جانتے ہیں اتنا عمل نہیں کرتے اور مقصد عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔"(۵۸)

تمام خطوط کے مشمولات پر اگر بحث کی جائے تو ایک طویل دفتر درکار ہے۔ جس کی مقالہ کی حدود بندی اجازت نہیں دیتی۔ لہذا ہم تمام مجموعہ خطوط میں سے کسی ایک کے مشمولات کا تجزیہ پیش کرتے جاتے ہیں۔

"تاریخ ابنِ کرم جلد دوم" کتاب میں حضرت سید قطب علی شاہؒ کا خط موجود اس کے مشمولات کو دیکھا جائے تو آغاز میں آپ کی طبیعت میں صلح جوئی کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے جب نواب سعادت علی خان آپ کو بار بار مناظرہ کا چیلنج کرتے ہیں تو آپ جواباً تحریر فرماتے ہیں:

> "چونکہ آپ نے مجھ کو مناظرہ کرنے کی بابت نہایت مجبور کیا ہے لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ میں اس کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اولتا تعصب اور ضد بڑھتے ہیں ہدایت کا پانا مشکل ہے۔"(۵۹)

صوفیہ کرام معاشروں کی تعمیر کرتے ہیں۔ کہ ان کی خانقاہوں کے دروازے غیر مذاہب کے لیے بھی کھلے ہوتے ہیں۔ حضرت قطب عالمؒ نے بھی یہاں تعمیری فکر کا اظہار کرتے ہوئے مناظرہ سے انکار کیا اور ساتھ وجہ بھی تحریر فرمادی کہ اس سے تعصب اور ضد بڑھتے ہیں اور مقصود ہدایت اور اتحاد یگانگت ہے نا کہ فساد و انتشار پیدا کرنا لیکن آپ کی علمی استعداد اور فراست کا اظہار خط کی آئندہ سطور میں عیاں ہو جاتا ہے۔ فریق مخالف کو ان الفاظ میں مخاطب کرتے ہیں:

> "ہاں اگر آپ کو مناظرہ کا اشتیاق ہے جو ہم نے کتاب شوائظ البرقات تحریر کی ہے۔ آپ چند علماء بلا کر اس کا جواب باثواب دے دیویں تو بعد تصفیہ منصف لمعات قطب سے درج کریں ایک دوسرے کو دین پڑے گی۔"(۶۰)

"مآثر شیر یزدانی" میں موجود خطوط کے زیادہ تر متون کا تعلق نجی ضروریات، اخبار اور دیگر معاملات سے ہے لیکن اکثر خطوط تصوف کے رموز، عشق و محبت کے اظہار، قرب الٰہی اور عبادات و ریاضات کی تلقین و ارشاد پر مبنی ہیں۔ آپ کے قلب و ذہن پر جذبہ عشق غالب ہے اور اپنے شیخ سے بے پناہ عقیدت و محبت کی بنا پر آپ کا یک ایک لفظ سراپا عجز و نیاز بن چکا ہے۔ ایک موقع پر آپؒ کے شیخ "ابر کرم" میں شامل مکتوبات کے مشمولات تمام موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں تصوف، شریعت و طریعت، زہد و عبادت کی ترغیب، معاشرت، سیاست ملکی اور نجی تمام معاملات کا تذکرہ موجود ہے۔ آپ کے خطوط میں متصوفانہ اور روحانی موضوعات کی کثرت ہے۔ آپ جہاں ظاہر اعمال و افعال کی تلقین کرتے ہیں وہاں باطنی اذکار و اشغال کا ارشاد بھی فرماتے ہیں۔ آپ پہلے دن ہی اپنے حلقۂ مریدین میں شامل ہونے والوں کو تمام اذکار اور تربیت عطا فرما دیتے ہیں۔ آپ خود بھی شریعت پر کار بند رہے اور اپنے احباب کو بھی ضروری تاکید

فرماتے رہے۔اپنے ایک سعودی عرب میں مقیم درویش کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں اور مکمل طریقہ کار بھی بتاتے ہیں۔ تحریر کرتے ہیں:

"زکوٰۃ ضروری ہے یعنی فرض عین ہے چونکہ اب آپ صاحب نصاب ہیں۔صاحب ثروت ہیں ا س لیے تنخواہ کے پیسے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں اور ہر سال تندہی سے زکوٰۃ ادا کرتے رہیں تا کہ ساری تنخواہ پاک ہو جائے۔"(۶۱)

زکوٰۃ کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے پوری تفصیل اس انداز میں بیان فرماتے ہیں کہ کوئی ابہام نہیں رہ جاتا۔دیکھیے:

"زکوٰۃ آپ کے ذمہ کتنی ہے مثال کے طور پر آپ کی تنخواہ دس ہزار روپیہ پاکستانی ہے اس میں سے دو یا اڑھائی ہزار کا ذاتی ماہوار خرچ ہے کم از کم پندرہ سو آپ کی فیملی کا خرچ ہے۔ایک ہزار روپیہ ایمرجنسی متفرق خرچ آپ کو درکار ہے تو پانچ ہزار خرچہ ماہوار آپ کا ہو گیا۔اور پانچ ہزار بچت ہو گئی۔اس بچت میں آپ پر زکوٰۃ فرض ہے یعنی ۵۰*12 =۶۰ ہزار روپیہ سالانہ ہر ۱۵۰۰روپیہ سالانہ زکوٰۃ آپ پر فرض ہے جو کہ آپ عرب شریف میں بھی خرچ کر سکتے ہیں اور پاکستان میں بھی دے سکتے ہیں۔"(۶۲)

آپ کے خطوط میں جہاں تصوف،ذکر و اذکار اور شریعت و طریقت کے تربیتی پہلو نمایاں ہیں۔وہاں حسن معاملات کا ذکر بھی موجود ہے۔اپنے ارادت مندوں کو رشتہ داروں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ حقوق والدین کا خصوصی خیال رکھنے کا حکم فرماتے ہیں۔اس تحریر سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت ہر پہلو کو نگاہ میں رکھتے ہیں اور ہر شخص کے لیے جو ضروری ہے اس کی تلقین فرماتے ہیں۔اپنے ایک مرید کو لکھتے ہیں:

"فی الحال آپ درگزر کریں اور اللہ نبی کے لیے اپنے باپ کے سامنے جھک جائیں بلکہ ہو سکے تو کچھ تنخواہ سے اپنے ماں باپ کو بھی کچھ خرچہ بھیجیں اس سے مجھے بہت خوشی ہو گی۔"(۶۳)

"جواہرِ کرم" کے مجموعہ خطوط میں تمام قسم کے خطوط شامل ہیں۔ شخصی اور ذاتی خطوط، عمومی خطوط، علمی اور سیاسی خطوط وغیرہ ان تمام مکتوبات کے مشمولات کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔اس میں مذہب ،تصوف ، سیاست ،معاشیت، سماج، نجی اور اجتماعی تمام پہلو مختلف خطوط میں سموئے ہوئے ہیں۔یہ مجموعہ اسم با مسمی ہے۔ مکتوب نگار نے دقیق مسائل کو بڑے آسان پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس سے قارئین کے لیے تفہیم کا راستا آسان ہو جاتا ہے۔انا کے مسئلہ کو سمجھاتے ہوئے ایک مکتوب میں حافظ سعید کو لفظ "میں" کے حجاب کے بارے وضاحت کرتے ہیں۔" جیسے مسئلہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

رَبِ اَرنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔درمیان سے نکال دیجیے۔"(۶۴)

اس خط کے مشمولات کا مطالعہ کریں تو یہ بھید سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے لیے انسان کو اپنی "میں "خوبصورت تمثیل کے ساتھ اس مسئلہ کو آسان بنادیا ہے۔ تمام جزئیات کو الگ الگ کر کے بیان کیا گیا ہے۔

ii. اسلوبیاتی مطالعہ:

اسلوب نگارش بھی انسان کے کردار یا شخصیت کی ایک شکل ہے۔اس طرح نہ تو اس کے وجود سے انکار ممکن ہے اور نہ اسے خود سے بڑھایا اور کم کیا جا سکتا ہے۔ سلسلہ قطبیہ کی مکتوب نگاری میں جو اسلوب نگارش پیش کیا گیا ہے وہ ان شخصیات کی طرح سادہ، شگفتہ اور صداقت کی تراوت سے نکھرا ہوا ہے۔ ان شخصیات کے جذبات و احساسات، ہمدردی نرم دلی اور انسان دوستی کی مہک ان کے اسلوب سے چھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ جیسا کہ اسلوب اور شخصیت کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

> "اسلوب بظاہر ایک لباس ہے مگر اس کی تشکیل اور بنت میں عصری تقاضوں کو خاص دخل ہوتا ہے اور پھر یہی اسلوب زمانی اور عصری طرز فکر اور طرز اظہار کا عکاس بن جاتا ہے اس اعتبار سے خیال کو اسلوب سے جدا کرنا گوشت کو ناخن سے علیحدہ کرنے کے مترادف ہے۔"(۶۵)

سلسلہ قطبیہ کے خطوط نویسوں کے اسلوب میں سادگی، سہل نگاری، بے تکلفی، مکالمانہ انداز، متانت اور سنجیدگی نمایاں پہلو ہیں۔ "جواہر کرم" سے سادگی اور بے تکلفی طرز تحریر کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت پیر محمد طاہر حسین اپنے مریدین کو اپنے دوستوں کی طرح مخاطب کرتے ہیں اور ان کے جملوں سے بے تکلف اظہار ان کی باہمی محبت و الفت کا بین ثبوت ہے۔ مکالماتی انداز میں مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سناؤ مولوی صاحب کس حال میں ہو۔ کس خیال میں ہو۔ علم فقہ خوب پڑھ رہے ہوگے۔ بھئی صحیح مولوی صاحب بن جاؤ یعنی لوگ تمہیں دیکھتے ہی خیال کریں کہ کوئی ملاں ہے لیکن تمہارے دل میں سوائے یار کے اور کوئی چیز موجود نہ ہو۔ شریعت کو ظاہر میں اپناؤ کیوں کہ اس کے بعد تمہیں طریقت کا پتہ چلے گا۔"(۶۶)

آپ کی عبارت سادہ، رواں اور عام فہم ہے۔ ایک مرید جو قرض کے مرض میں گرفتار ہے۔ آپ سے اپنی پریشانی کا حال بیان کرتا ہے تو آپ جواب میں اسے قرض کی ادائیگی کے لیے ایک آسان سا عمل تلقین فرماتے ہیں۔ جملوں کی سادگی اور بے ساختگی قابلِ دید ہے۔ اسے صبر کی تلقین کے بعد فرماتے ہیں:

"رات کو سونے سے قبل ایک دفعہ اپنے سر اور داڑھی کے بالوں میں کنگھی کر لیا کریں لیکن اس کی ابتداء ابرو سے کریں کہ اس کی تخلیق سب سے اول ہے۔ اللہ کریم قرض سے نجاب عطا فرمائے گا ۔ باقی ہمہ وقت باوضو رہنے کی کوشش کریں اور درود شریف کثرت سے پڑھا کریں۔"(۶۷)

ایک اور مقام پر آپ کی بے تکلفی کا انداز دیکھیے۔ اپنے ایک مرید کو لکھتے ہیں:

"اَبے او صاحب! کس حال میں ہو اور کاہے کا خیال ہے؟"(۶۸)

حال احوال دریافت کرنے کے بعد دوبارہ مکالماتی اور دوستانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"ہاں مجھے بتاؤ پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔ ہمیں تو ہر وقت صاحب تمہارا دھیان رہتا ہے البتہ تم اپنی فکر تعلیم کے بارے میں کرو۔"(۶۹)

یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ انسان یہاں پر جو اعمال کرے گا اس کا صلہ پائے گا۔ نیکی کا صلہ نیک اور بدی کا صلہ بد ہے لیکن اعمال کے لیے خشوع و خضوع لازم قرار دیا گیا ہے۔ پھر اعمال کے درجات ہیں۔ کوئی عمل وزنی ہے اور کوئی ہلکا جیسا کہ روز حشر میں میزان پر اعمال کو تولا جائے گا۔ حضرت پیر محمد طاہر حسین قادری نہایت سادہ اور دل کش انداز میں تلقین عمل اور قبول عمل کا راز اپنے ایک مرید کو لکھے گئے مکتوب میں کرتے ہیں۔ جملے مختصر مگر جامعیت سے بھرپور لکھتے ہیں:

"شوق سے کیا جانے والا تھوڑا سا عمل بھی گراں مایہ ہے اور بغیر محبت کے طویل ریاضت بھی محض عادت ہے لہذا وہی کچھ مقبول ہے جو دل و جاں سے کیا جائے۔"(۷۰)

اپنی شگفتہ بیانی کے حوالہ سے "ابر کرم" کے خطوط بطور خاص اہم ہیں۔ مصنف کے مکتوبات میں القابات پر تکلف ہیں لیکن متن کی عبارت سادہ، رواں اور سہل ممتنع سے لبریز ہے۔ آپ کی شخصیت کی سنجیدگی اور متانت آپ کی تحریر میں بھی نظر آتی ہے مگر آپ کے اسلوب میں شگفتگی کا پہلو نمایاں ہے۔ جو اسے دل کش اور رنگین بنا دیتی ہے۔ اپنے بھانجے کو خط لکھتے ہوئے۔ رقم طراز ہیں:

"حضرت سری سقطیؒ اور جنید بغدادی ماموں بھانجا تھے۔ حضرت بابا فرید اور علی احمد صابر ماموں بھانجا تھے۔ تم اور ہم بھی ماموں بھانجا ہیں دیکھو لاج رکھنا۔"(۷۱)

آپ نے اپنے خطوط میں زبان شائستہ اور بے تکلف استعمال کی ہے۔ بعض مواقع پر استفسار کرتے ہوئے شگفتہ بیانی کا عنصر پیدا کرتے ہیں۔ جس سے عبارت میں کشش اور رغبت کا پہلو بڑھ جاتا ہے کہیں کہیں آپ تمثیل نگاری سے بھی کام لیتے ہیں اور ضرب المثل کے استعمال سے معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اپنے ایک مرید ملک رب نواز کو خط میں ان کے گھر معاملات کے متعلق پوچھتے ہیں مگر طرز تحریر قابل قرات ہے۔ لکھتے ہیں:

"سنایئے آپ کے والد گرامی کیسے آئے اور کیسے چلے گئے۔ شیر اور بکری نے ایک گھاٹ سے کیسے پانی پی لیا۔ آپ کو تو کوئی بنگال کا جادو مل گیا جس نے آپ کو کمال تک پہنچا دیا۔ اگر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کریں تو ہمیں بڑی خوشی ہو گی۔"(۷۲)

زبان و بیان:

زبان و بیان کے حوالے سے سلسلہ قطبیہ کے خطوط قدیم اور جدید طرز تحریر کا عمدہ مرکب ہیں کیوں کہ مکتوب نویسی کی یہ روایت ڈیڑھ صدی پر محیط ہے۔ اس میں قدیم فارسی طرز پر پُر تکلف القاب و آداب کا اظہار بھی ملتا ہے۔ جن پر قافیہ پیمائی کا التزام بھی ہے۔ "یستون من رمیق مختوم" سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"عزیز القدر، عزیز از جان عاشق صادق، طالب سبحان، صادق الیقین، کامل الایمان عطا محمد سلمکم اللہ الرحمان۔"(۷۳)

اسی طرح "ابر کرم" میں مستعمل القابات میں قافیہ آرائی بھی نظر آتی ہے۔ ایک خط میں میاں جان محمد گجراتی کو یوں مخاطب کرتے ہیں:

"برخوردار، گل گلزار، محب پرودگار، عاشق زار میاں جان محمد زاد اللہ شوقہ،"(۷۴)

قدیم اردو نثری اسلوب کی طرح کہیں کہیں مفرس الفاظ، تراکیب کا استعمال بھی دکھائی دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تضاد لفظی تضاد معنوی تضاد اور قافیہ فارسی کی چھب دیدنی ہے لیکن اس انداز میں کہ عبارات بوجھل محسوس نہیں ہوتیں اور اس کے حسن و لطافت میں کمی نہیں آتی۔ ایک اقتباس دیکھیے:

"صرف انتظار ملاقات یار میں گھڑیاں گزر رہی ہیں۔ ایسی ملاقات نصیب ہو، ایسا جلوۂ یار نمودار ہو کہ جس میں من و تو، بود و نابود، ہست و نیست اور موت و حیات کو بھول جاؤں۔"(۷۵)

خطوط نگاری کی روایت کی طرح خطوط میں سلسلہ قطبیہ کے مکتوب نگاروں کے ہاں بھی خطوط میں شعر کے استعمال کا چلن مضبوط روایت کے ساتھ موجود ہے۔ سلسلہ قطبیہ کے خطوط نویسوں کے ہاں پنجابی، فارسی اور اردو کے بے سے شعرا کے اشعار ملتے ہیں۔ بہت سے دوسرے مصنفین اور ادیبوں کی تصنیفات اور مکتوبات میں بھی اشعار ملتے ہیں۔ جس طرح ابو الکلام آزاد کے مجموعہ غبار خاطر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

"سر کی گرانی کسی طرح کم ہونے پر نہیں آتی۔ حیران ہون اس وبال دوش سے کیونکر سبک دوش ہوں؟ دیکھیئے "وبال دوش" کی ترکیب نے غالب کی یاد تازہ کر دی۔

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش

صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں"(۷۶)

سلسلہ قطبیہ کی مکتوب نگاری میں بھی خوبصورت اشعار ملتے ہیں۔ جس سے نہ صرف تحریر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ لذت آفرینی بھی افزوں تر ہو جاتی ہے۔ یہ اس کی اثر انگیزی اور دلچسپی میں بھی اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہمارا کام ہاتھ پاؤں مارنا ہے، پار لگانا اس کے ذمہ ہے جو کچھ آپ کر سکتے ہیں وہ کریں باقی جو مالک و مولیٰ کے ذمہ ہے وہ ہی کرے گا۔

خوشی چاہتے ہیں نہ غم چاہتے ہیں

جو تم چاہتے ہو وہ ہم چاہتے ہیں"(۷۷)

صوفیہ کی تحریروں میں القاب و آداب ہیں جو عوام الناس کو مبالغہ کا مغالطہ ہوتا ہے وہ اس لیے ہے کہ وہ اپنے شیخ کی بارگاہ میں بے حد آداب و نیاز سے پیش آتے ہیں۔ ان کی تحریریں عام اور خواص کی درجہ بندی میں دیکھنا ہو گا۔ جیسے قدیم زمانہ میں بادشاہوں اور امراء کے لیے القابات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

حوالہ جات

۱. محمد اسحاق جلالپوری، تاج محمد۔ مترتبین؛ درسی اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، بار دوم، ۲۰۰۴، ص:۱۳۲۷

۲. عبدالقیوم، پروفیسر، مرتب: اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۱، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۷، ص:۴۷۳

۳. محمد عبداللہ خیویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹، ص:۶۰۹

۴. عبدالعزیز، مولوی، محمد سعید انصاری، مولانا، مرتبین۔ لغاتِ سعیدی، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ص:۱۷۷

۵. Farah, A. Said.M, The Dictionary Enlgish Arabic, Dar-al-ktob, Al-Ilmiyah, Libnan, 2004, page: 445

۶. حبیب اللہ آموزکار، فرہنگ فارسی دانش، موسسہ نشر علوم نورین انتشارات صفار، تہران، ۱۳۸۴ھ، ص۸۶۹

۷. ایس۔ڈبلیو۔ فیلن، ڈاکٹر، اردو انگریزی ڈکشنری، اردو سائنس بورڈ، لاہور، بار دوم، ۱۹۸۶، ص:۱۱۱۰

۸. Sally Wehmeier, Oxford Advanced Learner Dictionary, Oxford University Press, London, page 737

۹. سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجیہی سے عبدالحق تک، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص:۲۶۰

۱۰. محمد منور، مرزا، انشا مکتوبات، مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند، جلد سوم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱، ص: ۲۵۹

۱۱. انور سدید، ڈاکٹر، اردو میں خطوط نگاری، مشمولہ شہاب نامہ، مرتبہ۔ تسلیم احمد تصور، سورج پبلشنگ بیورو، لاہور، ۱۹۹۶، ص:۱۴

۱۲. محمد طاہر حسین قادری، پیر، لمعاتِ قطب، مطبوعہ کتابخانہ ابنِ کرم، منگانی شریف، جھنگ، طبع سوم، ۲۰۱۹ ص:۱۶۹

۱۳. ۔ محمد طاہر حسین قادری، پیر، مآثر شیر یزدانی، قادریہ آرگنائزیشن دربار کرم طاہر آباد منگانی شریف، جھنگ، ۲۰۱۳، ص:۳۷

۱۴. ۔ مآثر شیر یزدانی، ص:۸۵

۱۵. ۔ تاریخ ابنِ کرم، ص:

۱۶. ۔ اقبال، ص:

۱۷. ۔ سید شیر محمد گیلانی مکتوب مشمولہ "مآثر شیر یزدانی مرتبہ پیر محمد طاہر حسین، قادریہ آرگنائزیشن، دربار کرم طاہر آباد منگانی شریف، جھنگ، ۲۰۱۲ء، ص:۲۵

۱۸. ۔ مآثر شیر یزدانی، ص:۲۶

۱۹. ۔ مآثر شیر یزدانی، ص:۲۵

۲۰. ۔ مآثر شیر یزدانی، ص:۸۹

۲۱. ۔ جواہر کرم، دفتر ثانی، ص:۱۹

۲۲. ۔ تاریخ ابنِ کرم (جلد دوم)، ص:۱۲۳۳

۲۳. ۔ پیر غلام محمد جلو آنوی، یسقون مِن رحیق مختوم "جلوی کتب خانہ چک، ۲۱۴، لائل پور شہر، ۱۳۸۴ھ، ص:۳۲

۲۴. ۔ یسقون من رحیق مختوم، ص:۲۱

۲۵. ۔ یسقون من رحیق مختوم، ص:۴۴

۲۶. ۔ پیر محمد طاہر حسین قادری، "جواہر کرم" دفتر ثالث ۲۰۰۷ء، ۲۰۱۰ء، کتابخانہ ابن کرم (غیر مطبوعہ)، ص:۵۴

۲۷. ۔ یسقون من رحیق مختوم، ص:۷۵

۲۸. ۔ پیر محمد کرم حسین قادریؒ "ابر کرم" مرتبہ پیر محمد طاہر حسین قادری، مکتبہ جمال کرم، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۹۲

۲۹. ۔ ابرِ کرم، ص:۹۸

۳۰. ۔ ابرِ کرم، ص:۹۹

۳۱. ۔ ابرِ کرم، ص:۱۶۹

۳۲. ۔ ابرِ کرم، ص:۱۳۵

۳۳. ۔ جواہرِ کرم، ص:۳

۳۴. ۔ جواہرِ کرم، جلد اول، ص:۱۸

۳۵. ۔ جواہرِ کرم، جلد دوم، ص نمبر:۲۸

۳۶. ۔ جواہرِ کرم، جلد دوم، ص:۸۰

۳۷. ۔ جواہرِ کرم، ص:۱۱۴

۳۸. ۔ جواہرِ کرم، جلد سوم، ص:۸۴

۳۹. ۔ جواہرِ کرم، جلد سوم، ص:۸۷

۴۰۔جواہرِ کرم، جلد سوم، ص:۹۸۔۹۷

۴۱۔ جواہرِ کرم، جلد سوم، ص:۱۲۳

۴۲۔جواہرِ کرم، جلد سوم، ص:۱۰۱

۴۳۔ جو۔

اہرِ کرم، جلد سوم، ص:۱۰۲

۴۴۔ پیر۔

غلام محمد جلو آنوی، پیام جلوی، جلوی کتب خانہ، ڈھڈی والا کلاں، ڈاکخانہ طارق آباد، لائل پور، ۱۳۸۲ھ، ص ۹۲

۴۵۔ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص:۱۸۹

۴۶۔سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اردو میں خط نگاری، مشمولہ نقوش، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص:۲۴

۴۷۔ ابرِ۔

کرم، ص:۱۴۰

۴۸۔ ابرِ۔

کرم، ص:۱۶۴

۴۹۔ابرِ کرم، ص:۱۸۱

۵۰۔ابرِ کرم، ص:۲۰۳

۵۱۔ مآثر شیریزدانی، ص:۲۵

۵۲۔////، ص:۲۷

۵۳۔ مآثر شیریزدانی، ص:۲۸

۵۴۔ایضاً

۵۵۔۔۔۔۔۔۔ص:۲۸

۵۶۔۔۔۔۔۔ص:۳۰

۵۷۔ جو۔

اہرِ کرم، جلد سوم، ص:۱۰۱

۵۸۔جواہرِ کرم، جلد سوم، ص:۹۲

۵۹۔جواہرِ کرم۔ص:۹۲

۶۰۔ سید قطب علی شاہ، لمعاتِ قطب، ص:

۶۱۔ لمعاتِ قطب

۶۲۔ ابرِ کرم، ص:۹۴

۶۳۔ ایضاً

۶۴۔ ابرِ کرم، ص:۱۸۶

۶۵۔ جواہرِ کرم، جلد سوم، ص:۸۳۔۸۲

۶۶۔ رفیع الدین ہاشمی، مشمولہ اردو میں اسلوب اور اسلوبیات کے مباحث، مرتب قاسم یعقوب، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص:۱۰۸

۶۷۔ جواہرِ کرم، جلد اول، ص:۲۱

۶۸۔ جواہرِ کرم، جلد دوم، ص:۴۴

۶۹۔ جواہرِ کرم، جلد اول، ص:۷۲

۷۰۔ جواہرِ کرم، جلد سوم، ص:۲۶

۷۱۔ ابرِ کرم، ص:۱۶۱

۷۲۔ ابرِ کرم، ص:۱۹۵

۷۳۔ یسقون من رحیق مختوم، ص:۳۳

۷۴۔ ابرِ کرم، ص:۴۳

۷۵۔ ابرِ کرم، ص:۷۷

۷۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد، غبارِ خاطر، مکتبہ جمال، لاہور ۲۰۰۸ء، ص:۴۴

۷۷۔ جواہرِ کرم، جلد دوم، ص:۱۰۵

باب چہارم

سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی سفر نامہ نگاری کا جائزہ

الف۔ روایت و تعارف

i. اردو ادب میں سوانح نگاری کی روایت:

حضرت آدم کا بہشت سے خروج اور زمین پر ورود تاریخ انسانی کا اولین سفر ہے۔ انسانوں کے جد امجد نے جنت سے قدم کیا نکالا کہ تب سے اب تک ابن آدم کے پاوں سے چکر نہیں نکلا۔ آدم ثانی کا حضرت نوح کا اپنی کشتی پر تاحد نگاہ پھیلے پانیوں کا سفر آبی سفر کا آغاز ٹھہرا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل کا سفر لق دق صحرا میں خدا کے گھر کی تعمیر کے لیئے تھا۔ حضرت موسی کا سفر ان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ حضرت یوسف کا کنعان سے مصر تک کا سفر بھائیوں کی خود غرضی اور شقاوت قلبی کو افشاں کرنے کا باعث بنا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں کئی اسفار اختیار کیے۔ دوران سفر عیسائی راہب نے آپ کی نبوت کو پہچان لیا۔ جوانی میں قدم نکلا تو تجارت کی غرض سے متعدد سفر اختیار کئے۔ اعلان نبوت کے بعد جو مکہ سے مدینہ کی طرف تحا۔ جس تاریخ اسلام میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور اسلامی ریاست کی بنیاد کا سبب بنا۔ آپ نے ایک سفر وہ بھی کیا جو دنیا میں آج کسی بشر کو نصیب نہیں ہوا۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور جو سفر معراج کے نام سے عالم میں معروف ہے۔ ہمارے موضوع میں وہ سفر ہے جو انسان مختلف مقاصد کے مکانی فاصلے طے کرتے ہوئے کرتا ہے۔ سفر کی اس اہمیت کے پیش نظر بہت سے لوگوں نے اپنے سفری حالات کی روداد محفوظ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ آج دنیا کی بہت سی زبانوں میں سفر سے متعلق کثیر اور وقیع ادب موجود ہے۔ اردو میں بھی ملکی اور غیر ملکی اسفار کی سینکڑوں رودادیں اور سفر نامے تحریر کئے گئے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

سفر نامہ:

"سفر" عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کی جمع اسفار ہے۔ قواعد کی رو سے یہ اسم ہے۔ جس کے معنی مسافرت، کوچ ،سیاحت اور روانگی ہیں۔ لفظ "نامہ" بھی قواعد کی رو سے اسم ہے۔ معنی خط، چھٹی، رسالہ، کتاب، دفتر اور رجسٹر کے ہیں۔ اردو میں انہیں دو الفاظ کو ملا کر "سفر نامہ": کی خوبصورت ترکیب وضع کی گئی ہے۔ سفر نامے کی ماہیت اور تعریف جاننے کے لیے مختلف لغات سے رجوع کرتے ہیں۔،، نور اللغات کے مئولف مولوی نور الحسن نے لفظ "سفر نامہ" کے معنی سفر کے حالات اور سر گزشت لکھتے ہیں[۱]

فرہنگ آصفیہ میں لفظ سفر نامہ کے بارے درج ہے "سیاحت نامہ، سفر کی کیفیت، روزنامچہ سفر، حالات و سر گزشت سفر" [۲]

دور حاضر میں سفر نامے پر جن لوگوں نے کام کیا ہے اور سفر نامے کی ماہیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں سے ایک متعبر نام ڈاکٹر قدسیہ قریشی کا ہے۔ لکھتی ہیں:

> "اس طرح سفر نامہ وہ طرز تحریر اور اسلوب بیان ہوا، جس میں انسان یا سیاح اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر اپنی ذہنی، دلی اور طبعی کیفیت ظاہر کرتا ہے"۔[۳]

ڈاکٹر انور سدید کے مطابق سفر نامہ کی تعریف کچھ اسطرح ہے۔

> "سفر نامہ "سفر کے تاثرات، حالات، کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار کے سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات مرتب کرتا ہے۔"[۴]

سفر نامہ کی تعریف کے ضمن میں مختلف محققین کی آراہیں جن کے مطالعہ سے سفر نامہ کی تعریف اور وژن زیادہ وسیع اور واضح ہوتا جاتا ہے۔ ایک سیاح اپنے سفری حالات، مشاہدات، تجربات اور احساسات کو جب ایک خاص ترتیب میں

قلم بند کرتا ہے تو وہاں کے جغرافیائی، سیاسی اور سماجی ماحول کی تصویر کشی الفاظ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ حفیظ صدیقی لکھتے ہیں۔

"اجنبی شہروں اور غیر ممالک کے جغرافیائی اور سماجی حالات میں انسان نے ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے۔ ایک سیاح جب اپنے جغرافیائی اور سماجی گرد و پیش سے نکل کر کسی دوسرے مقام پر پہنچتا ہے تو اسے وہ مقام، چیزیں جو اس کے اپنے مولد و منشاء کے مانوس ماحول سے مختلف ہوتی ہیں۔ اختلاف ماحول اور اختلاف معاشرت کے باعث دلچسپ اور استعجاب انگیز نظر آتی ہیں۔ اور وہ باتیں جو مشترک ہوتی ہیں دلچسپ معلوم ہوتی ہیں وہ انہیں دوسروں کے لئیے قلم بند کرلیتا ہے۔ اس تحریر کو ہم ادبی اصطلاح میں سفر نامہ کہتے ہیں۔"(۵)

ایک سیاح دوران سفر معاشرتی و سیاسی، مذہبی و سیاسی اور تاریخی و جغرافیائی حیثیت کے حامل مقامات کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ اور پیش آمدہ حادثات، واقعات کو حسیاتی اور جذباتی سطح پر محسوس کرتا ہے۔ پھر ان تجربات و محسوسات کو بیان کرتے اور مصور کرتے ہیں۔ وہ ایک ماہر سنگ تراش کی طرح اپنے پیشہ فن سے تراش خراش بھی کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک فن پار معرض وجود میں آتا ہے۔ دوران سفر ہر موڑ سے گزرتے ہوئے سفر نامہ نگار کی دلی کیفیات بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ سفر نامہ میں اس کا ارتقاء واضح دکھائی دیتا ہے۔ بقول عطاالحق قاسمی:

"سفر نامہ نگار ایک ایک لمحے کی کیفیات کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں اتارنے میں منہمک رہتا ہے۔ سفر نامے میں لمحوں کے ساتھ ساتھ جو قلبی کیفیات متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا تدریجی ارتقاء ملتا ہے"(۶)

سفر نامہ کی مذکورہ بالا تعریف کے تناظر میں دیکھا جائے تو سفر نامہ محض سفری حالات، مشاہدات اور قلبی واردات کا بیان نہیں ہے بلکہ سفر نامہ کے لیے اس کا ادبی اسلوب ہونا بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رابعہ سرفراز رقم طراز ہیں۔

"مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفر نامے کی پیش کش ادبی ہوتی ہے۔ اور اسے محض مسافر کا بیان تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ہر مسافر کا سفری احوال ادبی حوالے سے سفر نامہ یا سیاحت نامہ نہیں کہلاتا۔"(۷)

مذکورہ بالا بحث کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سفر نامہ مشمولات کے اعتبار سے متنوع پہلو رکھتا ہے۔ یہ اپنے عہد کی تاریخ بھی ہے۔ متعلقہ عہد کی سماجی، سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی جھلک بھی پیش کرتا ہے۔ اس میں جغرافیہ رنگارنگی بھی موجود ہوتی ہے۔ لیکن اس تنوع کے لیے بنیادی شرط توازن ہے۔ ایام سفر میں سیاح شب وروز، اس کا شوق، اس کی پسند وناپسند، اس کی سرگرمیاں، اور اس کی داخلی شخصیت کے مختلف رجحانات واضح ہوتے ہیں۔ سیاحت نامہ خود سفر نامہ نگار کے ظاہر کے ساتھ باطن کی تصویر بھی ہے۔

سفر نامے کے بنیادی عناصر:

مذکورہ مباحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے سفر نامے کے بنیادی مشتملات کے طور پر درج ذیل عناصر ضروری ہیں۔

۱۔ مشاہدہ
۲۔ قلبی تاثرات
۳۔ زبان اور اسلوب

۱۔ مشاہدہ:

سفر نامہ اگر وجود ہے تو آنکھیں مشاہدہ ہیں۔ اس کے بغیر سفر نامہ بے رنگ اور پھیکا پڑ جائے گا۔ یہ وہ بنیادی عنصر ہے جس کے بغیر سفر نامہ لکھنا ممکن نہیں۔ سیاح یا مسافر کی حس مشاہدہ جس قدر عمیق اور تیز ہو گی۔ اس میں منظر کی داخلی اور خارجی سطح دیکھنے کی صلاحیت بھی اسی تاریخ میں جھانکے گا۔ فراعین کے شان و شوکت کا مشاہدہ کرتے ہوئے اسے مزدوروں کی چیخیں سنائی دیں گی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید تحریر کرتے ہیں۔

"سفر نامہ ایک ایسی صنف ہے جس میں مشاہدے کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے۔ یہ صنف علم تاریخ اور علم جغرافیہ کے فنی مقاصد کے لئے میکانکی انداز میں کوائف جمع نہیں کرتی بلکہ ایک مربوط، دلچسپ اور خوش گوار بیانیہ مرتب کرنے کے لئے ان سب سے فائدہ ضرور اٹھاتی ہے"(۸)

۲۔ قلبی تاثرات:

کوئی بھی چیز جب کسی سیاح یا مسافر کے مشاہدہ میں آئے تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ کوئی واقعہ ہو یا منظر دل و دماغ کو کسی درجے میں متاثر کرے گا۔ جس درجہ اس کا قلب تاثرات محسوس کرتا ہے وہ سفر نامے کا فطری جزو بن جاتے ہیں۔ البتہ سفر نامہ کے بیان کے معیاری ہونے کے لئے ضروری ہے کہ سفر نامہ نگار ظاہری مناظر کے ساتھ اپنے باطن کے تاثرات و احساسات اور کیفیات کو بھی سفر نامہ میں پیش کرے۔ ڈاکٹر شہاب الدین رقم طراز ہیں۔

"قلبی کیفیات و واردات کے ذریعہ سفر نامہ میں حرارت اور زندگی کے نقوش پیدا ہوتے ہیں اور یہ جمود سے دور ہوتا ہے بہ صورت دیگر سفر نامہ بے آواز فلم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔"(۹)

۳۔ زبان و اسلوب:

مختلف اصناف ادبی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق ان کی زبان و بیان اور اسلوب میں بھی فرق و امتیاز ہوتا ہے۔ سفر نامہ کا اپنا الگ اسلوب ہے۔ سفر نامہ نگاری کے ادبی، لسانی اور اسلوبیاتی معیار مقرر ہیں۔ موقع محل کی مناسبت سے اسلوبیاتی اظہار بھی مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً کہیں سلیس اور سادہ اور شگفتہ نثر کی ضرورت ہوگی۔ کہیں رمز و ایمائیت، کہیں انشائیہ و کہیں مزاح کے عناصر کی ضرورت ہوگی۔ البتہ سفر نامہ کے لیئے حقیقی منظر کشی اور کامیاب تخیل ضروری ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مختار الدین احمد لکھتے ہیں۔

"سفر نامے میں دو خوبیاں ضرور ہونی چاہئیں ایک تو یہ کہ وہ قاری کے دل میں سیاحت کا شوق پیدا کر دے اور اگر پہلے سے موجود ہو تو سفر نامہ آتش شوق کو تیز تر کر دے۔ دوسری یہ کہ منظر کشی ایسی مکمل اور جاندار ہو کہ یہ منظر سامنے آ جائے۔"(۱۰)

سفر نامے کی تکنیک:

اردو میں سفر نامے کی عمر ڈیڑھ صدی سے متجاوز ہو رہی ہے۔ ان سفر ناموں کی تصنیف میں جو تکنیک عام طور پر استعمال کی گئی ہے۔ اس کی تین شکلیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ تکنیکِ روزنامچہ
۲۔ تکنیکِ خطوط
۳۔ تکنیکِ پسِ سفر

۱۔ روزنامچہ کی تکنیک:

اس تکنیک میں سفر نامہ نگار اپنے روز مرہ کے حالات و اتاثرات کو تاریخ وار تحریر کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ مشاہدے کی تازگی کے سبب اس میں صداقت کے عنصر کو تکنیک کے دیگر عناصر کے مقابلے میں زیادہ در آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب سفر نامہ نگار کے ذہن میں مناظر پوری طرح محفوظ ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ انہیں لکھنے بیٹھتا ہے تو دن بھر کے تمام حالات و واقعات بآسانی صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس شکل میں سفر نامے میں تازگی، صداقت اور حقیقت نگاری کے عناصر کو پوری طرح وجود میں آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ البتہ اس تکنیک میں تکرار بھی ہو سکتی ہے اور غیر اہم عناصر بھی بعض اوقات جمع ہو جاتے ہیں۔

روزنامچہ کی تکنیک کا ایک نقص یہ ہے کہ اس میں واقعات کا تسلسل پوری طرح قائم نہیں رہ پاتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی عدم تسلسل اس کا حسن بن کر سامنے آتا ہے۔ بہت سی ایسی معلومات اس میں تاریخ کی قید کے ساتھ بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں جنہیں پس سفر یا خطوط کی تکنیک میں تلاش کرنا بالعموم ممکن نہیں ہوتا۔

۲۔ خطوط کی تکنیک:

سفر نامہ نگاری کی دوسری ہیئت خطوط کی تکنیک ہے۔ اس میں سفر نامہ نگار اپنے گھر کے افراد، دوست، رشتہ دار یا کسی دیگر متعلق شخص کو خط کے ذریعے احوالِ سفر سے واقف کراتا ہے چونکہ اس تکنیک میں بھی حالات وواقعات دورانِ سفر ہی تحریر کیے جاتے ہیں۔ اس لیے اس میں بھی واقعات و جذبات کی تازگی اور صداقت کے عناصر موجود ہوتے ہیں لیکن اول الذکر کے مقابلے میں مختلف ہوتی ہے مثلاً خط کے مضامین ہر روز تحریر نہیں ہوتے اور مکتوب نگار کو بھی حالات وواقعات کی ترتیب وہی میں حذف واضافہ اور آرایش کے عمل سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور پھر اس کی طوالت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ لہذا اس میں تازگی اور صداقت کے عناصر کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے روزنامچہ کے مقابلے میں کچھ کم ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں تراش خراش کے نتیجے میں تخیل کو بھی راہ مل جاتی ہے۔ اس تکنیک میں تسلسل کی نوعیت روزنامچہ تکنیک سے زیادہ اور پسِ سفر تکنیک سے کم ہوتی ہے۔

۳۔ پسِ سفر کی تکنیک:

سفر نامہ نگاری کی یہ سب سے عام تکنیک ہے۔ اس تکنیک میں سفر نامہ نگار مشاہدات و تاثراتِ سفر کچھ یادداشت کی شکل اور کچھ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ اس طرح سفر سے واپسی پر اپنی یادداشت اور ذہنی حافظے کی مدد سے عموماً وہ اپنا سفر نامہ ترتیب دیتا ہے۔ پیش تر سفر نامے اسی تکنیک میں لکھے جاتے ہیں۔ البتہ بعض سفر نامہ نگار دوران سفر بھی کئی چیزوں بالخصوص حقائق، اشارے اور اعداد و شمار وغیرہ لکھتے رہتے ہیں۔

سفر سے واپسی کے بعد لکھے جانے والے سفر نامے میں چونکہ سفر نامہ نگار کے پاس وقت کافی ہوتا ہے۔ اس لیے اسے سفر نامے کی ترتیب اور تراش خراش کا خاصا موقع مل جاتا ہے۔ اس طرح وہ اس میں تخیل اور زیادہ مربوط، مسلسل، دلچسپ اور خوبصورت ہوتا ہے البتہ تازگی اور صداقت کے عناصر کچھ کم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات زمانی بعد کے باعث کچھ غلطیاں بھی راہ پا جاتی ہیں البتہ سفر نامہ نگار تخیل اور تزئین کے عمل کے ذریعے تازگی کی حقیقی شکل کو واپس لانے ور سفر نامے کو مزین بنانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

سفر نامے کی اقسام:

اردو سفر نامے کی درجہ بندی کی جائے تو اس کی تین بڑی قسمیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ مقامی سفر نامے
۲۔ بیرونِ ممالک سفر نامے
۳۔ مذہبی سفر نامے

۱۔ مقامی سفر نامے:

مقامی سفر نامے سے مراد ایسے سفر نامے ہیں جو اپنے ملک کی سیاح کی روداد پر مشتمل سفر نامے ہوتے ہیں یعنی سفر نامہ نگار نے اپنے ہی ملک کی سیر کرتے ہوئے اپنے مشاہدات، واقعات، تجربات اور تاثرات کو خوبصورتی سے قلمبند کر کے سفر نامہ کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مقامی سفر ناموں کی مثال میں اشفاق احمد کا سفر نامہ "مختار مسعود کا سفر نامہ" "سفر نصیب" اور شوکت علی شاہ کا سفر نامہ "اجنبی اپنے دیس میں" پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مصنف عام قارئین کی روزمرہ دیکھی بھالی اشیاء اور جگہوں کو اپنے انداز نظر سے مقامیت سے آفاقیت کی سطح پر لے آتا ہے۔

۲۔ بیرون ممالک کے سفر نامے:

اردو میں تحریر کیے گئے سفر ناموں میں سب سے بڑا ذخیرہ اسی نوع کے سفر ناموں پر مشتمل ہے۔ سفر نامہ نگار مختلف مقاصد کے تحت بیرون ممالک کی سیر کرتا ہے اور سیاحت کی روداد، سفر نامہ کی شکل میں پیش کرا ہے۔ اپنے مشاہدات، تجربات، واقعات اور تاثرات سے قارئین کو آگاہ کرتا ہے۔ اردو زبان میں یورپ، امریکہ، عرب ممالک، ترکی، ہندوستان اور مشرق بعید کے سفر نامے نسبتاً زیادہ ہیں۔ دنیا کے بہت سے ممالک کی سیاحت کی روداد پر مشتمل سفر نامے اردو زبان میں موجود ہیں۔

۳۔ مذہبی سفر نامے:

اردو زبان میں لکھے گئے سفر ناموں میں ایک بڑی تعداد اس نوع کے سفر ناموں کی ہے۔ اس نوع سے مراد ایسے سفر نامے ہیں جو مصنف مذہبی مقصد کے تحت سفر کرتا ہے اور سیاحت کی روداد قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر شہاب الدین نے مذہبی سفر ناموں کو بھی موضوعاتی اعتبار سے تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

الف۔ حج کے سفر نامے

ب۔ عمرہ کے سفر نامے

ج۔ بلاد اسلامیہ کے سفر نامے

حج اور عمرہ دو الگ چیزیں ہیں۔ حج ایک بنیادی رکن ہے اور مخصوص ایام میں ہی ادا ہوتا ہے۔ جب کہ عمرہ کے لیے مخصوص ایام کی کوئی قید نہیں ہے۔ بلاد اسلامیہ کے سفر ناموں سے شام و فلسطین، مصر، عراق اور ایران سمیت ان مقامات کے سفر نامے مراد لیے جاتے ہیں۔ جہاں لوگ آثار و زیارات کی موجودگی کے سبب قصد کرتے ہیں۔ جو ظاہر ہے، حج و عمرہ کے سفر ناموں سے الگ ہیں۔ اگرچہ موجودہ دور میں ان مقامات کے سفر نامے کم لکھے جا رہے ہیں لیکن نصف صدی قبل ان مقامات کے سفر کی روداد بالعموم حج کے سفر ناموں کے ساتھ ہی لکھی جاتی تھی۔

سفر نامے کی ابتدا:

چھٹی صدی قبل مسیح تک انسان کو ذرائع نقل و حمل کے ذریعے دور دراز علاقوں تک رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ دنیا کے قدیم ترین دریافت ہونے والے سفر ناموں میں میگا ستھینز کا سفر نامہ خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس زمانۂ تحریر قریب قریب تین سو سال قبل مسیح کا ہے۔ میگا ستھینز، چندر گپت موریہ کے عہد (۳۰۳ق م) دارالخلافہ پاٹلی پتر میں آیا۔ اُسے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُس نے عوام کے علاوہ خواص کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ اسی بنا پر اس کے سفر نامے کو عہدِ چندر گپت موریہ کا ایک مستند اور قابل اعتماد ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"ہندوستان پر سکندرِ اعظم کے حملے کی تفصیلات اور کوائف بھی اسی سفر نامے سے اخذ واکتساب کیے جاتے ہیں۔ یہ سفر نامہ تیسری صدی قبل مسیح کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور صنعتی حالات کا آئینہ ہے۔"(۱۱)

پانچویں صدی عیسوی میں ایک چینی، راہب فاہیان ہندوستان میں آیا۔ فاہیان کا سفر نامہ پانچویں صدی عیسوی کے ہندوستان کے متعلق ایک عینی شہادت اور دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ اس زمانے میں مسلمان "الارض وللہ" کی بنا پر اور "تسیر وفی الارض" کے حکم کی تکمیل کے سلسلے میں ملکوں ملکوں پھیل گئے۔ اس سیاحت کے نتیجے میں کئی اہم سفر نامے معرضِ وجود میں آئے جو ارتقائے انسانی کی ابتدائی خدوخال فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر احمد فضلان کا "سیاحت نامۂ روس" ابو عبد اللہ مقدسی کا "مراکش سے تاشقند تک" کا بیس سالہ سفر، اسی دور کی یادگار ہیں۔

مسلمان سیاحوں میں ایرانی سیاح حکیم ناصر خسرو بلخی علوی کو تقدیم حاصل ہے۔ یہ وہ پہلا سیاح ہے جس نے خالصۃً سیاحت کے نقطۂ نظر سے آٹھ نو ہزار میل لمبا سفر طے کیا اور اپنے مشاہدات کو "زاد لا مسافرین" کے نام سے جمع کیا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اسے "دار المسافرین" لکھا تھا۔ چوں کہ سفر کے ساتھ زاد کا تعلق ہے دار کا نہیں، اس لیے "دار المسافرین" موزوں نام نہیں ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق "زاد المسافرین" ہے جو کہ زادِ سفر سے متعلق ہے لہذا یہ درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ سہوِ کاتب بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید، حکیم ناصر کے متعلق لکھتے ہیں:

"حکیم ناصر خسرو نہایت باریک بین سیاح تھا۔ اس نے زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں مشاہدات جمع کیے اور ہر قصبہ و شہر کے تاریخ واقعات اور جغرافیائی کوائف کو سفر نامے میں جگہ دی۔ اس نے مختلف شہروں کی آبادی کے کوائف، عوام کی حالت، دینی نظریات، فرماں روائی کا رعایا سے سلوک اور عقائد، علما اور مشائخ کے حالات و معمولات کے بارے میں بھی نادر معلومات فراہم کیں۔"(۱۲)

ابو ریحان البیرونی وسط ایشیا کے مردم خیز خطے خوارزم کے رہنے والے تھے ۔ عہد غزنوی(۱۰۳۰ء-۹۹۸ء) میں ہندوستان کے لیے رختِ سفر باندھا۔ جس کا نتیجہ "کتاب الہند" کی صورت میں نکلا۔ سیاحت کے حوالے سے محمد بن جبیر اُندلسی کا نام بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب اور شاعر تھے۔ ابنِ جبیر حجِ بیت اللہ اور زیارتِ حرمین کی غرض سے غرناطہ سے نکلے۔ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد انہوں نے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے کمر باندھ لی۔ دمشق، شام اور عراق سے وہتے ہوئے ۵۸۱ھ میں غرناطہ واپس لوٹ آئے۔ ابنِ جبیر نے اس کے علاوہ دو اور بھی سفر کیے۔ آخری سفر کے بعد واپسی پر انہوں نے مصر کو اپنا وطن بنالیا اور وہیں آباد ہو گئے۔

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "ابنِ جبیر منظر کو مسافر کی نظر سے دیکھتے اور مؤرخ کی صداقت سے پیش کرتے ہیں۔ وہ ادیب کی نظر سے ماحول کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہیں اور سیاست و تمدن کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ ابنِ بطوطہ بلند مرتبہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا قبیلہ بربر، نواحِ مصر میں آباد تھا۔ اس خاندان کے کئی افراد ہسپانیہ میں اعلیٰ عدالتی عہدوں پر فائز رہے تھے۔"(۱۳)

ابنِ بطوطہ ایک لمبے عرصے تک دشتِ دنیا کی خاک چھانتا پھرا۔ جب وہ گھر سے سفر پر نکلا تو ۲۲ برس کا جوانِ رعنا تھا۔ واپس آیا تو اس کے بالوں میں چاندی اُتر آئی تھی اور وہ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ ابنِ بطوطہ کا سفر نامہ "عجائب الاسفار" دیکھا جائے تو وہ انسانی تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو ملاتا اور اس کے گم شدہ اوراق کی شیرازہ بندی کرتا نظر آتا ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں اٹلی کے ایک "دیوانے" مارکو پولو نے دشتِ سیاحت میں قدم رکھا اور چالیس سال تک سرگرداں رہا۔ مشرق کے چمکتے کلسوں اور بلند میناروں کے دید نے ننھے مارکو سے گھر بار چھڑایا اور وہ اپنے باپ کے ساتھ سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ مارکو پولو مالابار کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا اور ۱۲۲۵ء سے ۱۲۲۷ء تک یہاں مقیم رہا۔ یہ زمانہ غیاث الدین بلبن کا زمانہ تھا۔ مارکو پولو کا سفر طویل مدت پر محیط ہے۔ اُس نے زمین کی سیر کرتے ہوئے زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے اور انھیں سفر نامے کی صورت میں قلم بند کیا۔ مارکو پولو کے اس سفر نامے کا شمار دنیا کی

عظیم کتابوں میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر برینز کا یہاں قیام عہدِ شاہجہان سے عہدِ اورنگ زیب تک پھیلا ہوا ہے۔ اسے ہندوستان میں بہت اہمیت حاصل رہی۔ سفر نامہ " وقائع سیاحتِ برینز" اس طویل قیام کا ماحصل ہے۔ مغلیہ عہد کے سیاسی سفر ناموں میں اطالوی سیاح منوچی کا سفر نامہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

الغرض ہم نے یہاں تک سفر ناموں پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں رسل ورسائل کی کمیابی کے باوجود انسان کے اندر جہاں گردی کا شوق اور نئے نئے علاقوں کو دریافت کرنے کا جنون بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس نے راہ کی مشکلات کو کچھ اہمیت نہ دی اور سفر پر نکل کھڑا ہوا پھر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔اس زمانے کے سفر ناموں کا اسلوب سادہ ہے اور معلومات راست دی گئی ہیں۔قدیم سفر نامہ یک جہتی سفر نامہ ہے۔ عمرانی علوم میں اس کی حیثیت بہ طور مآخذ مسلمہ ہے۔

اردو سفر نامے کی روایت:

اُردو سفر ناموں میں یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے "عجائباتِ فرنگ" کو ابھی تک تقدیم حاصل ہے۔یوسف خان کمبل پوش کا دل اچانک ہی سیر لندن کے لیے نہیں دھڑکا تھا اور نہ ہی وہ ایکا ایکی ہی سفر کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا تھا بل کہ وہ اسے پہلے ۱۸۲۸ء میں اپنے وطن حیدر آباد سے نکلا اور مختلف شہروں اور قریوں کی خاک چھانتا ہوا لکھنو آپہنچا۔اُس نے سفر لندن کے لیے خوب تیاری کی، انگریزی زبان سیکھی، تاریخی کتابوں سے انگلستان کے علاقوں اور شہروں سے متعلق معلومات جمع کیں اُس کے شوقِ سفر کے سامنے زادِ راہ کی کمی بھی حائل نہ ہوئی اور مختلف ممالک سے ہوتا ہوا ولایت پہنچ گیا۔ انگلستان گھومتے ہوئے اُس کے ہاں قدم قدم پر حیرت کا اظہار ملتا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

> "کیا خوب شہر لندن ہے۔ لوگ وہاں کے مسافروں پر ایسی عنایت کرتے ہیں کہ ماں باپ بیٹوں کے ساتھ نہیں کر سکتے، فقیر نے سفر بہت شہروں کے کیے مگر صاحب مروت ایسے نہیں پائے ،انگریز جو ہندوستان میں آتے ہیں، مزاج میں بدل جاتے ہیں، ان لوگوں کو اُن سے کوئی نسبت نہیں۔"(۱۴)

"عجائباتِ فرنگ" سے پہلے اردو میں لکھا گیا کوئی سفر نامہ تا حال سامنے نہیں آیا، لہذا ہم "عجائبات فرنگ" (جس کا یاک عنوان "تاریخ یوسفی"" بھی ہے) کو بجا طور پر اُردو کا سب سے پہلا سفر نامہ کہہ سکتے ہیں۔ سفر نامے کا سفر اگرچہ انیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں شروع ہو چکا تھا لیکن دوسری ادبی اصناف کی طرح سفر نامہ نگاری نے بھی اس صدی کے اختتام تک اپنی حیثیت کو مستحکم کر لیا۔

سر سید احمد خان کا "مسافران لندن" اور "سفر نامہ پنجاب" نثار علی بیک کا سفر نامہ "سفر نامہ یورپ" مولوی جعفر تھانیسری کا "کالا پانی" محمد حسین آزاد کا "سیر ایران" اور انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت "نواب عمر علی خاں کے سفر نامے زاد سفر، زاد غریب، سفر نامہ آئینہ فرنگ، سفر نامہ رئیس، نیرنگ رنگون، نیرنگ چین، فرہنگ فرنگ، قند مغربی اور ارژنگ چین۔ شبلی نعمانی کا سفر نامہ روم و مصر و شام، ڈاکٹر شاہ علی سبزہ واری کا خوفناک دنیا، نواب حامد علی خاں کا مسیر حامدی، انیسویں صدی کے ایسے سفر نامے ہیں جن میں دنیا کے مختلف ممالک موجود ہیں، افریقہ، یورپ، چین، ایران، عراق، شام، ترکی اور افغانستان تمام ممالک کی تہذیب و تمدن، طرز معاشرت، رسوم و رواج، تعلیم و تربیت اور سیاسی و سماجی اور اقتصادی حالات کا بیان ان سفر ناموں میں بالتفصیل ملتا ہے، زبان و بیان، طرزِ فکر اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے یہ اصلاحی دور تھا۔ اس عہد کی زبان مشکل پسندی کو چھوڑ کر سادگی اور سلاست کی جانب مائل ہو چکی تھی، اس دور کے سفر ناموں میں زیادہ تر واقعاتی اور بیانیہ لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس عہد کے سفر نامے صرف شہروں، عمارتوں اور تہذیب و تمدن یا کوائف زندگی کی تفسیر و تعبیر یا تاریخ و جغرافیہ کی معلومات کا ذریعہ ہی نہیں، اکتساب مسرت کا وسیلہ بھی ہیں۔ یہ سفر نامے قاری کو ماضی سے متعارف کراتے ہیں اور حال و مستقبل کی تعمیر پر آمادہ کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے سفر ناموں میں اس بات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ سیاح نے کیا کیا دیکھا اور کن ملکوں کی سیاحت کی، اس کے اپنے تاثرات، رد عمل اور زاویہ نظر نے سفر نامے کے سفر میں بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے اور اس میں بھی زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ سفر نامہ نگار نے اپنی بات کس طرح کہی ہے یا جو کچھ بھی کہنے کی کوشش کی ہے اس کا طرز کیا ہے یعنی اظہار میں کسی درجہ ندرت، لطافت اور ادبیت پائی جاتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ اہم سہی کہ سفر نامہ نگار

نے کیا کہا ہے مگر کس طرح کہا ہے اسے دیکھنا بھی ضروری ہے۔ بیسویں صدی میں اس کی اہمیت بھی مسلم ہو چکی تھی اس اصول کو ذہن میں رکھ کر درج بالا سفر ناموں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں کئی خوبصورت سفر نامے منظر عام پر آئے جن میں سیاحت سلطانی از نواب سلطان جہاں بیگم والی ریاست بھوپال، سفر نامہ یورپ و امریکہ اور "سیاحت نامہ، از نواب لیاقت جنگ بہادر، مسافر کی ڈائری، کابل میں سات سال، از مولانا عبید اللہ سندھی، نواب محمد عمر علی خان کے سفر نامے، جاپان کا تعلیمی نظم و نسق از سر راس مسعود وغیرہ مختلف النوع خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان میں کچھ ایسے سفر نامے بھی ہیں، جو اردو ادب میں بیش قیمت اضافہ کہے جاسکتے ہیں، مثال کے طور پر شیخ عبد القادر، خواجہ غلام الثقلین، منشی محبوب عالم، خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، نشاط النساء بیگم اور قاضی عبد الغفار کے سفر نامے اپنی اپنی طرز میں منفرد ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد حیدر آباد کے وزیرِ اعظم تھے ان کا سفر نامہ ۱۹۱۶ء میں منظر عام پر آیا۔ دکن سے متعلق اس سفر نامے کا عنوان بھی، سفر نامہ ہے۔ ایک دوسرا "سیر پنجاب" ہے مہاراجہ کشن پرشاک کی شخصیت بڑی پر کشش تھی۔ ان کا مطالعہ گہرا اور ذہن وسیع تھا۔ دکن کے سفر نامے میں ان کے دور کی سیاحت اور معاشرت کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ انسانی فطرت کا تجربہ ان کے سفر نامے کی اضافی خوبی ہے۔ حیدر آباد دکن کے تعلق سے ان کا سفر نامہ اہم ترین مآخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سر شیخ عبد القادر کے دو سفر نامے، "مقام خلاف" اور "سیاحت نامہ یورپ" ہیں۔ مقام خلافت میں ترکستان کی سیاست پر بصیرت افروز خیالات پیش کیے گیے ہیں۔ یہ سفر نامہ ۱۹۰۶ء کی سیاحت ترکی سے متعلق ہے اور اس عہد کے مسلم ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ شیخ عبد القادر اپنے دوسرے سفر نامے، سیاحت نامہ یورپ، میں ہندوستان کے دیگر سیاحوں کی طرح انگریزوں سے متاثر ہیں مگر مرعوب نہیں۔ انھوں نے ایک غیر جانب دار سیاح کی طرح یورپ کی تعریف کی ہے۔ انھیں اچھی چیزوں کے انتخاب کا بڑا سلیقہ ہے۔ مناظر فطرت کا بیان خوبی سے کرتے ہیں۔ شیخ عبد القادر کے سفر ناموں میں سیاسی، سماجی، تعلیمی اور تہذیبی پسِ منظر کا حسین امتزاج ہے۔ ان کا قلم مناظر و واقعات کو زندہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

خواجہ غلام الثقلین مناظر اور اس کے گرد و پیش سے بہت جلد بے تکلف اور مانوس ہو جاتے ہیں۔ان کے سفر نامے میں تاریخ اور جغرافیہ کو پس منظر کے طور پر ابھارنے کا انداز نمایاں ہے۔وہ تاریخ کو معاشرتی پس منظر اور جغرافیہ کو موجودہ تناظر میں دیکھتے ہیں۔ان کی نگاہیں ایسے حالات و واقعات میں بھی دلچسپی لیتی ہیں، جنھیں دوسرے سیاح لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ان کا سفر نامہ بعنوان "سیاحت نامہ "روس، قسطنطنیہ، ایران، عراق، عرب (مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ) کی سیاحت و زیارت کا حاصل ہے۔اسلوب سادہ پر وقار ہے، بے تکلفی، برجستگی اور حقیقت نگاری ان کے اسلوب کے عناصر ثلاثہ ہیں۔

منشی محبوب عالم صحافی ہیں، اردو کے مشہور و معروف "پیسہ اخبار" کی ادارنے اُنھیں باریک بینی اور جزئیات نگاری کا ماہر بنادیا ہے۔انھوں نے اپنے سفر نامے "عجائبات یورپ" اور "سفر نامہ بغداد" میں نت نئی خبروں اور معلومات کا ایسا ذخیرہ جمع کر دیا جو کسی اور سفر نامے میں مشکل سے ملے گا، تاریخی اور جغرافیائی حوالے بھی ان کے سفر ناموں کی افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ایک کثیر الاشاعت اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے منشی محبوب عالم ہلکی اور عالمی سیاست سے دلچسپی اور واقفیت رکھتے تھے۔انھیں ہندوستان کی علمی کم مائیگی کا اندازہ تھا، وہ ایک وطن پرست اور قوم پرور انسان کی طرح ملک کو ترقی کی راہ پر دیکھنے کے خواہش مند تھے۔چنانچہ اپنے سفر ناموں کے ذریعے بھی انھوں نے معلومات فراہم کرنے کے علاوہ قوم کی غیرت و حمیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

قاضی ولی محمد اندلس کے مسافر ہیں۔وہ اندلس جو کسی زمانے میں مسلمانوں کے عروج کی علامت سمجھا جاتا تھا ۔آج زوال کی نشانی ہے۔ولی محمد مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے آثار دیکھنے کے آرزو مند تھے انھوں نے ۱۹۲۴ء میں اندلس کا سفر کیا۔ قاضی ولی محمد نے اندلس کی تاریخی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا اور ماضی کو حال میں تلاش کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔سفر نامہ اندلس کے علاوہ قاضی ولی محمد کے دو اور سفر نامے "مسجد اقصیٰ" اور "سفر نامہ مصر" بھی ہیں۔ان سفر ناموں میں تخلیقی انداز اختیار کیا گیا ہے اور تاریخی حقائق کی بازیافت بھی کی ہے۔ قاضی ولی محمد ماضی کو حال میں لانے کے لیے خود ماضی میں سانس لیتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی، نادر خاں کے عہد حکومت میں افغانستان گئے تھے۔ یہ عالموں کی ایک جماعت تھی۔ جس میں اسلام کے تین عظیم مفکر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، سر راس مسعود اور خود سلیمان ندوی شامل تھے۔ کابل کے بادشاہ نادر خان نے ۱۹۳۳ء میں اپنے ملک کی تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں صلاح و مشورے کی غرض سے ان دانشوروں کو مدعو کیا تھا۔ "سیر افغانستان" اسی تعلیمی اور اصلاحی سفر کی یادگار ہے سید سلیمان ایک معتبر عالم، تاریخ داں اور صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ "سیر افغانستان" میں مولانا کی ان تینوں خصوصیات کی جھلکیاں موجود ہیں۔

مولانا کا تبحر علمی اور تاریخی سفر نامے کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ مولانا نے اپنے وسیع مطالعے کی مدد سے تاریخی آثار کو بڑی بڑی خوبی سے یکجا کیا ہے۔ افغانستان کے جغرافیائی نقوش اور تاریخی آثار "سیر افغانستان" میں غیر جامد اور متحرک نظر آتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا سفر نامہ اسلوب کی سطح پر شوق کی وسعتوں اور معنوی اعتبار سے علامہ شبلی کی روایات کا فروغ ہے۔

نشاط النساء بیگم نے "سفر نامہ عراق" اور "سفر نامہ حجاز" دو سفر نامے یادگار چھوڑے۔ نشاط النساء بیگم کوئی معمولی خاتون نہیں، مولانا حسرت موہانی کی بیگم تھیں۔ مولانا حسرت موہانی جیسے بے باک مجاہد آزادی اور عظیم المرتبت شاعر کی بیگم ہونا بھی اگرچہ اعزاز کی بات ہے مگر نشاط النساء بیگم حسرت موہانی کی بیگم ہونے کے علاوہ ان کی دوست، صلاح کار، سیاسی اور صحافتی مشیر اور رفیق سفر بھی تھیں۔ بیگم حسرت موہانی نے ۱۹۳۶ء میں مولانا کے ہمراہ عراق کا سفر کیا اور سفر نامہ عراق مرتب کیا یہ سفر نامہ ۱۹۳۷ء میں مولانا حسرت موہانی کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا، نشاط بیگم نے عراق کو ایک مشرقی خاتون کی نظر سے دیکھا اور سفر کی تمام جزئیات کو سفر نامہ عراق میں سمیٹ لیا، مشرقی وضع قطع کے باوصف نشاط النساء بیگم نے عراق کے طبقہ نسواں میں آزادی کی روش کو سراہا ہے ان کے ہاں روشن خیالی اور مشرقی کا تعمیری انداز اور اسلامی روایات کا پرتو موجود ہے، عراق کی نسوانی دنیا اندرون خانہ زندگی کے پہلو اور گھر سے باہر کی روش، سفر نامہ عراق میں تفصیل اور فراوانی سے پیش کی گئی ہے۔ بیگم حسرت موہانی کے اس سفر نامے سے، مرد سیاحوں کے لکھے ہوئے ان سفر ناموں کی خامیوں، کوتاہیوں اور لاعلمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ جن میں خواتین سے متعلق یا تو ناقص، سطحی اور سر سری معلومات ہوتی ہیں یا سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی ہیں۔

"لیلیٰ کے خطوط" کے مصنف قاضی عبد الغفار اپنے طرزِ تحریر کی بدولت دنیائے ادب کی جانی مانی شخصیت ہیں" نقش فرنگ" ان کے سفر انگلستان کی روداد ہے۔ یہ سفر اس دور میں کیا گیا تھا۔جب ہندوستانی سیاست دانوں اور دانشوروں کا ایک وفد احیائے خلافت کے مسئلے پر برطانوی وزیر اعظم لارڈ جارج سے گفتگو کرنے لندن گیا تھا۔ قاضی صاحب ایک معزز رکن کی حیثیت سے اس وفد میں شامل تھے۔ ملاقات کا نتیجہ حوصلہ افزا نہیں تھا مگر قاضی صاحب کے قلم نے سیاسی وقائع نگار کی حیثیت سے انگریز کی سیاست اور اس قوم کی نفسیات پر بصیرت افروز تبصرے کئے ہیں۔ وہ قاری کو ایک گائیڈ کی حیثیت سے سیر کرانے پر آمادہ نہیں بل کہ انھوں نے مناظر وواقعات کا تجزیہ کرنے کی مشکل ذمہ داری قبول کی ہے۔ان کے تبصرے جرات مندانہ اور نتائج آمیز ہیں۔انھوں نے قارئین کی ذہنی پس ماندگی کو دور کرنے کی ترغیب دی ہے، قاضی صاحب لندن سے نہ تو حد درجہ متاثر ہیں اور نہ مرعوب، اسی لیے وہ نہ تو اس شہر معانقہ کرتے ہیں اور نہ قدم بوسی، "نقش فرنگ" میں لندن سے یگانگت کی بجائے بے گانگی کا احساس نمایاں ہے اور یہ احساس فطری بھی تھا کہ ایک غلام ملک کا غیور نمائندہ بالجبر آقا بن جانے والے حاکم کی اکڑی ہوئی گردن کو مستحسن نظروں سے نہیں دیکھ سکتا لیکن ایسا بھی نہیں کہ قاضی صاحب لندن کی فطری خصوصیات سے بھی خواہ مخواہ ناراض ہوں، انھوں نے ہر قابل تعریف چیز کی تعریف کی ہے اور حیرت کے واقعات کو حیرت کی نظر سے دیکھا ہے۔

عصرِ حاضر میں سفر نامے کی سمت ورفتار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اُردو سفر نامے نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ جہاں تک اسلوب اور تکنیک کا سوال ہے۔ یہ صنف بڑی حد تک قدیم روش پر گامزن رہی لیکن فنی صلاحیت، علمی استعداد اور تخلیقی شعور رکھنے والوں کے لیے تمام راہیں کبھی مسدود نہیں ہوتیں، وہ ہر جگہ ارتقا کی گنجائش نکال لیتے ہیں چنانچہ عصر رواں کا سفر نامہ تجربات ومشاہدات کی رنگارنگی اور تنوع کے ساتھ سفر نامہ نگار کے جذبات واحساسات اور رد عمل کی زبان بن گیا ہے۔ آج کا سفر نامہ نگار صرف تاریخی اور جغرافیائی سطح پر معلومات جمع کرنے کا قائل نہیں تخلیق کی فنی چابکدستی کے ساتھ اپنی بات کو اس خوبی سے پیش کرتا ہے کہ قاری بھی سفر نامہ نگار کے تجربات ومشاہدات میں شریک ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس جو سفر نامے روکھے، پھیکے اور غیر ادبی انداز میں صرف معلومات فراہم کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ ان کی حیثیت گائیڈ بکوں سے زیادہ نہیں۔اس قبیل کے سفر نامے قبول عام کی سند حاصل نہیں کرتے۔

کئی اعتبار سے سفر نامہ لکھنے کے لیے روز نامچوں، یادداشتوں اور خطوط کی قدیم تکنیک آج بھی اسی طرح رائج ہے البتہ تخلیقی انداز بیان کو فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ قدیم سفر نامہ نگار نئی سرزمین کی تلاش کا احوال اجنبی دیس کے بازاروں کی رونق، تہذیب و معاشرت، رسم و رواج، عجائب و غرائب، تاریخ و جغرافیہ اور تمدن کی تفصیل رقم کرتا تھا۔ پڑھنے والے اس تفصیل کے ذریعے گھر میں بیٹھے بیٹھے سفر نامے کے معلوماتی ذخیرے سے فیض یاب ہو جاتے تھے مگر آج صورت حال مختلف ہے۔ آج معلومات حاصل کرنے کے بے شمار زرائع نے دنیا کے کم و بیش تمام ممالک تمام کی تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی، تمدنی اور سماجی تفصیلات عام کر دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئے سفر نامے کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ آج کا سیاح اشیا کا شمار اور افراد کا تعارف کرانے کے بجائے ذاتی تاثرات، جذبات و احساسات اور نجی رد عمل کا اظہار کرتا ہے قدیم سفر ناموں میں انسانی مفادات سے تعلق رکھنے والے تمام پہلوؤں پر ہمہ وقت نظر رکھی جاتی تھی۔ نیا سفر نامہ دوسروں سے زیادہ اپنے لیے لکھا جا رہا ہے۔

جہاں تک تکنیک کا سوال ہے یہ صنف بڑی حد تک قدیم روش پر گامزن ہے لیکن موضوعات کے لحاظ سے آج کا سفر نامہ نگار صرف تاریخی اور جغرافیائی سطح پر معلومات جمع کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بل کہ اپنی ذات میں سفر کرتا ہے ۔اس کے نزدیک سفر نامہ نگار کی ذات ہی سفر نامے کا مرکزی کردار ہے۔ اسی کے آس پاس سارا ماحول گردش کرتا ہے ۔اس لیے وہ سفر نامے کو اپنی شخصیت اور ذات و صفات کے اظہار کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ اس کا سفر صرف نظری یا بصری نہیں تاثراتی بھی ہوتا ہے۔ وہ ماضی کو حال کے وسیلے سے دیکھتا ہے۔ تاریخ اس کے لیے حصولِ عبرت اور فخر و مسرت کے جذبات کو ابھارنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ نیا سفر نامہ نگار سفر نامے کو اپنی ذات سے ذات کو سفر نامے سے خارج نہیں کرتا بل کہ خود مرکز و محور بن کر ہر شے کو اپنے گرد و پیش میں محسوس کرتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کو تخلیقی انداز میں بیان کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک سفر نامہ صرف واقعات سفر کا بیان نہیں، کیفیات سفر کا بیانیہ ہے۔

اردو سفر نامے کی روایت میں حج کے سفر ناموں کا ذکر بھی لازمی حیثیت رکھتا ہے۔ حج کا سفر نامہ دوسرے ارضی سفر ناموں کے مقابلے میں بہ لحاظ کیفیت مختلف ہوتا ہے۔ حج مذہبی فریضہ بھی ہے اور دیارِ محبوب کی زیارت بھی۔ اس میں مقصد ادائیگی فرض کی صورت میں نمایاں طور پر موجود ہے لیکن یہ ایسا مقصد ہے جو ذہن و قلب کو مسحور کر دیتا ہے

اور روحانی وارد اکا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ سفر حج کا مقصد زائر کے شوق فراواں کو مغلوب نہیں کرتا بل کہ دیارِ محبوب کی طرف اٹھتا ہوا ہر قدم اس شوق میں مزید فراوانی پیدا کرتا ہے۔ جیلانی کامران لکھتے ہیں:

> ''حج کے سفر نامے بنیادی طور پر محبت کے سفر نامے ہیں۔ محبت کے جذبے کے بغیر یہ سفر شروع ہی نہیں ہوتا۔ واردات حج کی باتیں عموماً عشق و جذب کی باتیں ہیں۔''(۱۵)

یہی وجہ ہے کہ حج کا زائر بنیادی طور پر مسافر نہیں بل کہ سیاح ہے۔ وہ مناظر و مناسک حج کو چشم تماشا سے دیکھنے کے بجائے چشم شوق سے دیکھتا ہے اور انہیں اپنی روح میں جذب کر لیتا ہے۔ حج سے متعلق ہندوستان کے قدیم سفر ناموں میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا سفر نامہ حجاز، جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب، فارسی زبان کا قدیم سفر نامہ ہے۔ محمد شفیع مراد آبادی نے '' دیارِ حبیب'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ۱۵۸۹ء میں حج بیت اللہ شریف لے گئے تھے۔ حج کے قدیم سفر ناموں میں ایک بہت اہم سفر نامے کے وسیلے سے ایمان و ایقان اور فیض و برکات کو شانِ جمال کے ساتھ پیش کیا ہے اور ارشادات نبوی ﷺ کی تبلیغ بھی کی ہے۔ متاخرین میں مولوی رفیع الدین کا سفر نامہ '' سوانح الحرمین'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا سفر نامہ '' ترغیب المسالک الیٰ احسن الممالک'' ادبی لحاظ سے اہم ہے۔ نواب شیفتہ ۱۸۳۹ء میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۸۴۱ء میں واپس آئے۔ نواب صدیق حسن خان کا سفر نامہ "رحلۃ الصدیق الیٰ بیت العتیق" ۱۸۶۸ء کے واقعات سفر حج کی روداد ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم والی ریاست بھوپال کا "سفر نامہ حجاز" اور حاجی منصب علی خاں کا سفر نامہ "ماہِ مغرب" المعروف بہ "کعبہ نما" سفر حج کے واقعاتی سفر نامے ہیں۔ محمد عمر علی خان رئیس باسودہ کا سفر نامہ "زاد غریب" ۱۸۸۰ء میں لکھا گیا۔ مرزا عرفان علی بیگ کا سفر نامہ حجاز ۱۸۹۴ء کے واقعات سفر کا مرقع ہے۔ شیخ الہند مولانا الحسن کا سفر نامہ شیخ الہند، مولانا عبد الماجد دریابادی کا " سر نامہ حجاز" مولانا غلام رسول مہر کا "سفر نامہ حجاز" مولانا مسعود عالم ندوی کا "دیارِ عرب میں چند ماہ" سید ابو الحسن علی ندوی کا "شرق اوسط میں کیا دیکھا" مولانا سید بو الاعلیٰ مودودی کا "سفر نامہ ارض القرآن" عبد الصمد صارم کا "سفر نامہ حج و زیار" نسیم حجازی کا "پاکستان سے دیارِ حرم تک" شورش کاشمیری کا "شب جائیکہ من بودم" ماہر القادری کا "کاروانِ حجاز"، ممتاز مفتی کا "لبیک"، عبد اللہ ملک کا "حدیث دل" خواجہ حسن نظامی کا "سفر نامہ حجاز و مصر و شام" عبادت بریلوی کا "دیارِ

حبیب میں چند روز" اور بشریٰ رحمٰن کا" باؤلی بکارن"۔ مشاہیر ادب کے وہ سفر نامے ہیں جن میں جبین شوق، جبہ سائی میں پیہم مصروف ہے اور دل یاد اللہ اور یاد محبوب اللہ میں ہر پل دھڑکتا ہے۔ دیارِ حرم کا ہر راہی سر میں سودائے عشق لیے جاا ہے اور معرفت الٰہی کا طلب گار ہو کر سجدہ ریز ہو جاا ہے۔ دعائیں مانگتا ہے، گڑگڑاتا ہے اور یوں اپنے دل و دماغ و دنیا بھر کا گرد و غبار جھاڑ کر دیارِ حرم سے روضہ محبوب کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔

اردو سفر نامہ اب باضابطہ ایک پختہ صنف ادب شمار کیا جاتا ہے۔ اجمالی جائزے کی وجہ سے منظوم سفر ناموں کا ذکر نہ کیا جاسکا۔ اگرچہ منظوم سفر نامے بھی ہر دور میں کسی نہ کسی انداز میں روایت کا حصہ رہے ہیں۔ موجودہ دور میں سفر نامہ پہلے کی نسبت زیادہ تعداد میں لکھا جارہا ہے اور پڑھا جارہا ہے۔ ادیب اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ پہلے کی نسبت موجوہ دور میں سفر کرنے کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں اور اپنے ہم وطنوں کو اپنے تجربات و مشاہدات اور خیال و افکار میں شریک بھی کرتے ہیں۔ اردو ادب میں سفر نامے لکھے جانے کا سلسلہ جاری ہے اور قارئین میں روز بروز زیادہ مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

ii. سلسلہ قطبیہ میں سفر نامہ نگاری کی روایت:

سلسلہ قطبیہ میں سفر نامہ کا آغاز تو بانی سلسلہ اور ان کے خلفاء کے مختلف اسفار سے ہوتا ہے جن کا احوال ان کے ملفوظات میں ملتا ہے۔ سید قطب علی شاہ کے مختلف تبلیغی دورہ جات کا تذکرہ لمعات قطب میں ملتا ہے۔ اسی طرح ان کے بعد ان کے خلیفہ اکبر سید شیر محمد گیلانی نے آپ کی معیت میں اور اپنے طور پر بھی ملک کے طول و عرض میں سفر کئے۔ ان کا ذکر "لمعات قطب" میں موجود ہے۔ لیکن آپ سے باقاعدہ سفر کی روداد تحریر کرنے کے نشان نہیں ملتے۔ لیکن ملفوظات میں موجود مختصر سفری واقعات اوراحوال آنے والے وقتوں میں سفر نامہ نگاری کے لئیے تحریک کی بنیاد ہیں۔

سید سردار علی شاہ نے بھی اپنی مشائخ کے راستے پر چلتے ہوئے کئی اسفار کئے۔ آپ نے ایک مرتبہ سفر حجاز بھی کیا لیکن افسوس کے آپ کے سفری حالات کہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ سلسلہ قطبیہ میں سفر نامہ نگاری کی روایت کا باقاعدہ

آغاز حضرت سائیں پیر محمد کرم حسین کے سفر حجاز سے ہوتا ہے۔ اس سفر کی تمام روداد ملک ربنواز قادری جو اس سفر میں آپ کے ہم سفر رہے۔ ان کی تحریر ہے۔ اس اعتبار سے ملک ربنواز کو سلسلہ قطبیہ کا پہلا سفر نامہ نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۹۹۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

بعد ازاں سفر نامہ نگاری کی روایت کو پیر محمد طاہر حسین قادری نے جدید خطوط پر استوار کیا۔ ان کا پہلا سفر نامہ "متاع دید" جو کہ سفر حجاز کی روداد پر مبنی ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۰۳ء میں ہوئی۔ بعد ازاں آپ نے مغربی ممالک کے سفر اختیار کئے۔ ان میں "اسپین کا مطالعاتی سفر" ایک یادگار سفر نامہ ہے۔ "آئر لینڈ میں چند روز" بھی ایک اہم سفر نامہ ہے۔ اسلامی ممالک کے سفر ناموں میں ترکی میں ایک ہفتہ اور سفر حجاز کا پنجابی میں سفر نامہ "ان ملے بہتر گھنٹے" اپنے اسلوب کے لحاظ سے الگ حیثیت کے حامل ہیں۔

آپ کے بعد پیر جاوید اقبال کا سفر نامہ "سفر حجاز کے نام سے رسالہ "آئینہ کرم" ہیں۔ اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ دور حاضر میں سلسلہ کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے لالہ محمد رفیق، مشتاق احمد، ملک ربنواز، اور ساجد امتیاز نے دیار حبیب کے سفر کی روداد سفر ناموں کی صورت میں قلم بند کی ہیں تاہم یہ تمام سفر نامے ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ سلسلہ قطبیہ میں سفر نامہ کی روایت میں زیادہ احوال و معمولات اور سفری حالات کا تذکرہ ان کے شیخ کی ذات کے حوالے سے ملتا ہے۔ اگرچہ ان کی تحریر میں ادبی چاشنی نہیں مگر ان کی سادہ بیانی اور حقیقت نگاری اس کی لذت کو کم نہیں ہونے دیتی۔

iii. سلسلہ قطبیہ کے سفر نامہ نگار (تعارف) :

ا. ملک ربنواز قادری:

سلسلہ قطبیہ کے باقاعدہ سفر نامہ نگار کی حیثیت سے اولیت ملک ربنواز کو حاصل ہے۔ ملک ربنواز ۵ جنوری ۱۹۵۵ء کو گاوں کھودے ضلع چکوال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مڈل تک تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا کے گاوں ۱۴ چک لوکڑی میں حاصل کی۔ بعد ازاں آبائی شہر چکوال سے میٹرک، ایف اے اور گریجویشن کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد PIA میں ملازمت اختیار کی۔ دوران ملازمت ہی انہیں اپنے مرشد کریم حضرت سائیں محمد کرم حسین قاری کی رفاقت

میں سفر حجاز کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور اپنا پہلا سفر نامہ "سفر حجاز" کے نام سے لکھا۔ اس سفر نامے کا مرکزی کردار ان کے شیخ مکرم ہی ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک ضخیم کتاب "تجلیات کرم" کے نام سے چھپ کر پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔

۲. پیر محمد طاہر حسین قادری:

پیر محمد طاہر حسین قادری جو کہ شاعر سوانح نگار، سفر نامہ حجاز، مکتوب نگاری اور مرتب و محقق کے نام سے ادبی حلقوں میں ایک خاص پہچان بنا چکے ہیں۔ وہ سلسلہ قطبیہ کے عہد ساز سفر نامہ نگار ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں اسلامی اور مغربی ممالک کے سفر نامے شامل ہیں۔ آپ کی ولادت اپنے وقت کی نابغۂ روزگار ہستی حضرت سائیں پیر محمد کرم حسین قادریؒ کے ہاں ہوئی۔ آپ کی تاریخ ولادت ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۹۷۶ء ہے۔[۱۶] آپ نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ سکول دربار منگانی شریف سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول چک نمبر ۱۷۰ سے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ آپ کی روحانی، مذہبی تعلیم و تربیت آپ کے پدر و مرشد نے فرمائی۔ آپ علم و عرفان، صداق، عبادت و ریاضت، تقویٰ، تفویض اور تصرف و طریقت میں راسخ القدم ہیں۔ پنجابی، اردو، فارسی اور عربی شعر و ادب سے خاص لگاؤ ہے۔ مطالعہ کے رسیا ہیں۔ کتابخانہ ابنِ کرم، جس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جو کم و بیش ۲۰ ہزار کتب پر مشتمل ہے۔

آپ نہایت سادہ، نفیس، جاذب اور مقناطیسی شخصیت کے حامل ہیں۔ آپ اوصافِ حمیدہ اور اخلاق کریمانہ میں یکتۂ روزگار ہیں۔ آپ کی شخصیت ہمہ جہات اور متحرک ہے۔ از حد مصروفیت کے باوجود علمی و ادبی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ آپ ایک محقق، مؤرخ، سوانح نگار، مکتوب نگار، تذکرہ نگار، سفر نامہ نگار اور عمدہ شاعر بھی ہیں۔ محمد یوسف طاہر صفوری لکھتے ہیں۔

> " پیر طاہر حسین کے ہاں ایک ذہنی تحریک موجود ہے جو انہیں زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہے جو ہر لحظہ کسی نہ کسی علمی منصوبہ کی تجویز یا تکمیل میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کی دل آویز شخصیت کی جملہ خصوصیات ان کی تحریروں میں بھی منعکس ہوتی ہیں۔ میری دانست میں ان کے انداز بیاں اور سلوب تحریر میں جامعیت، جدت، ندرت، سادگی اور پرکاری کے عناصر بہ

نمایاں ہیں جس سے ان کی نثر اور نظم دونوں میں دلکشی اور شگفتگی محسوس ہوتی ہے۔ قاری ان کے سحر میں کھو جاتا ہے اور جب تک پوری کتاب نہ پڑھ لے اس کو چین نہیں آتا۔"[۱۷]

پیر محمد طاہر حسین قادری کا نام پاکستان میں سلسلہ قادریہ کی علمی خدمات کے حوالے سے ایک سند کا درجہ رکھتا ہے۔ حال ہی میں ان کی کتاب "تاریخ ابنِ کرم" چھپ کر تحقیق و تاریخ میں اپنا مقام متعین کر چکی ہے ۔ آپ کی نثری خدمات کثیر الجہات ہیں مگر سوانحی ادب پر آپ کی خدمات کی فہرست کافی طویل ہے۔ سوانح نگاری کی حیثیت سے آپ کی مطبوعہ کتب ہیں۔ لمعاتِ قطب، لمحاتِ کرم، حافظ الکرم، غوث الاعظمؒ، تذکرہ شاہ سردار اور غیر مطبوعہ کتب میں تذکار شیر یزدانی، مآثر سلطانی شامل ہیں۔ سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگاری کو جس شخصیت نے اپنی خدمات سے مالامال کیا وہ پیر محمد طاہر حسین قادری ہیں۔ ان کی خدمات لازوال ہیں۔ وہ اپنے عہد کی ایک رجحان ساز ہستی ہیں۔

پیر محمد طاہر حسین قادری نہ صرف سلسلہ قادریہ بلکہ دورِ حاضر کے خانقاہی نظام میں ایک توانا آواز بن کر ابھرے ہیں۔ ان کی تصانیف تخلیقی و تحقیقی اسلوب کی بدولت، انفرادیت کی حامل ہیں۔ آپ کا قلم تحقیق کے راستوں پر رواں دواں ہے۔ مستقبل قریب میں امید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ نسلوں کے لیے تحقیق کے مزید نئے سانچے سامنے آئیں گے۔

ب۔ فکری جائزہ

i. سلسلہ قطبیہ کی سفر نامہ نگاری میں مذہبی پہلو:

ا۔ متاع دید:

"متاع دید" کا تعلق مذہبی سفر ناموں سے ہے۔ یہ اس مقدس سرزمین کے سفر کی روداد ہے۔ کہ جس کی خاک پر سربسجود ہونے کے لیئے ہر مسلمان کی جبیں تمام عمر طالب و مشتاق رہتی ہے۔ ہر کسی کے دل میں یہ تمنا محو سفر رہتی ہے کہ کب اس مقدس سفر کی سعادت نصیب ہونی ہے۔ عمرہ و حج کے سفر نامے اپنے سفر کی نوعیت اور غایت کے اعتبار سے تمام سفر ناموں سے الگ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ یہ سفر اس بارگاہ کی طرح ہوتا جن کی خدمت اقدس میں جبرائیل بھی ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔

نفس گم کردہ جنید و بایزید

کیونکہ یہ سفر سعادتیں سمیٹنے کا سفر ہے۔ اس ضمن میں محمد مقصود ایوب تحریر کرتے ہیں:

> "آپ کو یہ سفر مبارک ہو۔ یہ سفر ایک عبادت ہے۔ سیر و تفریح نہیں لہٰذا یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ کہ اس مبارک سفر کے دوران ہر کام انتہائی نظم وضبط کے ساتھ انجام دینا ہے۔ یہ سفر بذات خود ایک امتحان ہے۔ جس میں پورا اتر کر خداوند بزرگ و برتر کی خوشنودی حاصل کرنی ہے"۔[۱۸]

پیر محمد طاہر حسین نے جس صنف ادب میں بھی لکھا اس میں آپ کے اسلوب کی نمایاں خوبی سادہ بیانی اور لفظی چاشنی ہے۔ آپ کی تحریر کا یہ خاصا ہے کہ ایک بار پڑھنا شروع کیا تو پھر کتاب رکھنے کو دل نہ مانے۔ آپ کا سفر نامہ "متاع دید" اہل محبت کے لیئے دلچسپی کا صرف ایک پہلو نہیں رکھتا۔ یہ ایک مذہبی گوشہ بھی ہے اور تاریخی روایت بھی۔ یہ سفر حجاز کی معلومات کا اگر وسیع ذخیرہ ہے تو حاضری کے آداب کا مکمل سلیقہ بھی ہے۔ محمد طاہر حسین لکھتے ہیں۔

"جب خانہ کعبہ پر نظر پڑے تو جو بھی دعا مانگی جائے شرف قبولیت سے فیض یاب ہوتی ہے۔ لہٰذا زائرین کو چاہئیے جب حرم میں داخل ہوں تو سر جھکائے آنکھیں شرم گناہ سے نیچی کیے بڑی عجز و انکسار کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں۔"(۱۹)

پیر محمد طاہر حسین کے سفر نامے کی خوبی جو اسے دوسرے سفر ناموں سے الگ شناخت عطا کرتی ہے۔ کہ عام آدمی اس سفر نامہ کے مطالعہ سے نہ صرف عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ جان لیتا ہے۔ بلکہ اس کے تمام آداب کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی سیکھ جاتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے ساتھ ساتھ قاری کو بھی زیارت مقدسہ سے فیض یاب فرما رہا ہے۔ عمرہ کی ادائیگی کے وقت احرام کی چادر کیسے لی جاتی ہے۔ یہ سطور ملاحظہ کیجیے۔

"احرام کی جسم سے لپٹی ہوئی چادر کا ایک سرا دائیں کندھے سے اتار کر بغل کے نیچے سے بائیں کندھے پر اس طرح ڈالیں کہ شانہ کھلا رہے اسے اضطباع کہتے ہیں۔"(۲۰)

متاع دید کے مطالعہ سے آپ خود کو ساتھ ساتھ عازم سفر محسوس کرتے ہیں۔ زیارت کی تمنا دل میں ابھرتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اضطباع کے بعد نیت طواف کی جاتی ہے۔ اور آغاز طواف حجر اسود کے مقابل دونوں ہتھیلیاں اٹھا کر سلام کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ جسے اسلام کہتے ہیں۔ اگر حجر اسود کا بوسہ نہ لیا جا سکے تو اپنی ہتھیلیوں کو بوسہ دے کر طواف شروع کر دیں۔ طواف کے سات چکر لگائے جاتے ہیں۔ پہلے تین چکروں میں "رمل" کیا جاتا ہے۔ محبت کا بھی ایک اپنا الگ فلسفہ ہے۔ پوری روئے زمین پر اکڑ کا چلنا گناہ ہے مگر خدا کی بارگاہ میں کعبتہ القدس دوران حج و عمرہ اکڑ کر چلیں تو ثواب کی سنت نبوی ہے۔ یہ کرامات عشق ہیں۔ اس ضمن میں پیر محمد طاہر حسین لکھتے ہیں۔

"پہلے تین چکر جنہیں عربی زبان میں "رمل" کہا جاتا ہے۔ کہ چلنے میں جھپٹ کر اور قوت سے قدم اٹھائیں لیکن دوڑ کر مت چلیں بلکہ قدم نزدیک نزدیک رکھیں اور کندھوں کو اس طرح ہلاتا ہوا چلیں جیسے بہادر آدمی میدان جنگ میں جاتا ہے یہ سنت صرف مرد حضرات کیلئے ہے رمل اس وقت لازم ہوا جب صحابہ کرام کے بارے میں کفار مکہ نے کہا کہ وہ ہجرت کے بعد دبلے، پتلے اور

لاغر ہو گئے ہیں اور یہ سب گھر بار اور وطن چھوڑنے کا اثر ہے تاجدار دو عالم ﷺ نے فرمایا میرے اصحاب اکڑ کر اور سینہ چوڑا کر کے طواف کریں اسی کو رمل کہتے ہیں۔"(۲۱)

سفر نامہ متاع دید کا پہلا حصہ اس انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ کہ آپ اگر عمرہ ادائیگی کے طریقہ سے نابلد ہیں تو آپ کو نہ اس کے مکمل ارکان سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ بلکہ آپ ہر اک مقام پر دعا اور رکن کی ادائیگی کی مکمل رہنمائی بھی مل جاتی ہے۔ وہ مقام ابراہیم ہو یا ملتزم، آپ کو کیا کرنا ہے اور کیا دعا مانگنی چاہئیے۔ کیسے دعا مانگنی چاہئیے۔ نہایت ادب و احترام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مقام ملتزم جو حجر اسود اور خانہ کعبہ کی چوکھٹ کی درمیان والی جگہ ہے۔ یہاں پہنچتے ہی قلب و نظر پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے روح پر ایک بیقراں سکینت اپنا تسلط جما لیتی ہے۔ انسان کے اندر چھپی عبدیت ایک انگڑائی لیتی ہے اور بیدار ہو جاتی ہے، دل کی اتھاگھرائیوں سے ایک صدا بلند ہوتی ہے جو جسم کے رویں رویں میں سرائیت کر جاتی ہے۔ اس پر حاضری کا علم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہاں بڑی عاجزی وانکساری سے اپنی مناجات عرض کریں۔ اور دونوں ہاتھ سر سے اونچے کر کے بیت اللہ کی چوکھٹ پر پھیلائیں یا دائیاں ہاتھ دروازے کی طرف اور بائیاں حجر اسود کی طرف ہو اور یہ دعا مانگیں یاواجد یاماجد لاتزل عنی نعمہ انعمتھا علیٰ۔ یعنی اے قدرت والے، اے عزت والے مجھ سے زائل نہ کر جو نعمت تو نے مجھے بخشی ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا" میں جب چاہتا ہوں جبریل کو دیکھتا ہوں کہ ملتزم سے لپٹے ہوئے یہ دعا کر رہے ہیں"(۲۲)

اللہ تعالیٰ کے ارشاد " فبای الاء ربکما تکذبن " کی شان کے مظہر آب زم زم جس میں شفاء رکھی گئی ہے۔ جو ریگستان میں ایسا چشمہ جاری ہوا جس کی مقدار اور خواص میں صدیاں بیت گئیں کوئی کمی نہ دیکھی گئی۔ پوری دنیا سے آنے والے زائرین روزانہ کی بنیاد پر لاکھوں گیلن پانی لے جاتے ہیں مگر یہ اسی آب و تاب سے جاری و ساری ہے۔ صفا مروہ کے چکر جو سعی کہلاتے ہیں۔ وہ پہاڑیاں جو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ تقلید و سنت سے اعتراض کرتے ہیں۔ ان کے لیے اس میں راہ ہدایت موجود ہے۔ کہ دنیا کے تمام مردوں اور عورتوں کو اللہ کی ایک مقرب و برگزیدہ بندی کے نقش قدم کی پیروی میں دوڑنا ہے اور یہ ہر شخص کے لیے بخشش کا ذریعہ اور عبادت کا حصہ ہے۔ جہاں وہ پاکباز ہستی آہستہ آہستہ چلی وہاں

آہستہ چلنا ہے اور جہاں وہ دوڑتی رہی وہاں اسے دوڑاتے ہوئے گزرنا ہے۔ پیر محمد طاہر حسین کا ذکر کرتے ہوئے ان الفاظ میں گویا ہیں۔

"جب آپ صفا سے مروہ کی طرف جارہے ہوں گے تو تھوڑے ہی فاصلے پر آپ کی نظر دو جگہ سبز ٹیوبوں پر پڑے گی اسے میلین اخضرین کہتے ہیں ان سبز ٹیوبوں کے درمیان کی جگہ وہ تاریخی مقام ہے جہاں نشیب ہے اور سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ سے اوجھل ہونے کی وجہ سے حضرت مائی حاجرہ دوڑ کر گزرتیں تھیں۔"(۲۳)

سعی کے اختتام پر عمرہ کا آخری رکن جسے حلق کہتے ہیں ادا کیا جاتا ہے۔ اور عمرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب تک بندہ سر نہ منڈوائے وہ احرام کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ خواتین کے لیے ایک پور برابر بال کٹوانے کا حکم ہے۔ جبکہ مرد نشانی کے طور پر بال کٹوا سکتے ہیں۔ جس کو تقصیر کہا جاتا ہے مگر سر منڈوانا سنت ہے اور فضیلت کا حامل ہے۔ عام طور پر اس طرح سر منڈھوانا ہمارے ہاں مذاق کا سبب بنتا ہے مگر یہاں پہنچ کر ایک بندۂ مومن پر نبی مہربانؐ کی محبت کا رنگ چھا جاتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے انسان اپنی پسندیدہ زلفیں جنہیں وہ سنوار سنوار کر رکھتا ہے سرے ہی سے منڈھوا کے رکھ دیتا ہے اور اپنے اس عمل سے اعلان کرتا ہے کہ نبی مہربانؐ کے کسی بھی عمل کے آگے ہم سرِ تسلیم خم ہیں اور اپنی محبتیں اور پسندیدگی آپؐ پر وار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں مصنف تحریر کرتے ہیں۔

"واضح ہو آدمی عمرہ میں ایک پور برابر بھی بال کٹوا سکتا ہے لیکن افضل سر منڈوانا ہے جسے عربی زبان میں حلق کہتے ہیں جونہی آدمی سر منڈوائے احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے پھر جو چاہے معمول کے مطابق کرے"(۲۴)

مذہب اسی کا نام ہے کہ آپ کے لیے ہر معاملے میں ایک حد بندی مقرر کی گئی ہے۔ جو قرآن و سنت نے کسی بھی عبادت کے لیے نظم و طریقہ مقرر کیا ہے۔ اگر آپ اس کی پابندی کرتے ہیں۔ تو آپ کا شمار عبادت گزاروں اور متقین میں ہوتا ہے۔ بصورت دیگر آپ گناہ گار شمار ہوں گے کیوں کہ آپ حدود اللہ کو توڑنے والے ہیں۔ حضرت پیر محمد طاہر حسین کے سفر نامہ کی یہ مذہبی خوبی ہے کہ آپ نے موقع محل کی مناسبت سے تمام مقامات پر جو عبادات ہیں ان کے مکمل طریقہ کار

کو واضح طور پر اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب اس کے لیے اس راہ پر چلنا دشوار نہ رہا۔ احرام کی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

"جسم کو کھجانا منع ہے، بند جوتا نہیں پہن سکتے صرف ہوائی چپل زیر استعمال ہو، کوئی بال و ناخن کاٹ نہیں سکتے، تیل اور خوشبو نہیں لگا سکتے، کسی بھی جاندار چیز کا مارنا منع ہے وغیرہا پھر سب نے بلند آواز سے تین مرتبہ تلبیہ پڑھی دیگر تلبیہ مخفی یعنی آہستہ آواز سے بھی پڑھی جا سکتی ہے تلبیہ میں چار جگہ پر ذرا سا ٹھہرنا چاہیے۔"(۲۵)

سفر مدینہ کی گھڑی آئے تو محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کے مناظر آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں۔ یہ وہی راستے ہیں جو کسی زمانے میں کس قدر دشوار اور سنگلاخ ہوا کرتے تھے آج جن راستوں پر ہماری گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی ہے کبھی یہاں حضور نبی کریمؐ بے سر و سامانی کے عالم میں گزرے تھے اس خیال کے آتے ہی انسان کے جسم میں ایک خنک لہر دوڑ جاتی ہے اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں جی چاہتا ہے گاڑی کے اُتر کر ننگے پاؤں ایڑیوں کے بل روضہ رسولؐ پر حاضر ہوا جائے۔ مکہ سے مدینہ ۴۵۰ کلو میٹر کا طویل سفر سنگلاخ چٹانوں اور تپتے صحراوں کا اور عازم سفر قدمین محبوب خدا کے ہیں۔ اب جدید سڑکیں تعمیر ہو چکی ہیں سفر میں آسانیاں پیدا ہو گئیں ہیں۔ اس ضمن میں محمد تقی لکھتے ہیں۔

"اب مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ جانے کے لیے جو جدید سڑک تعمیر ہوئی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کے راستوں سے گزرتی ہے۔ اور قباء کی طرف سے مدینہ میں داخل ہوتی ہے اس لیے اس کا نام "الطریق البحرہ" ہے"۔(۲۶)

مذہب اور ایمان کی پختگی کو جانچنا ہو تو پیمانہ محبت رسول ہے۔ جس کے سینہ میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ اس کے سامنے ذکر مدینہ چھڑ جائے۔ تو اس کی قلبی کیفیت میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا اور آنکھیں پلکوں پر موتی سجا لیتی ہیں۔ ان دلوں اور آنکھوں کی بے قراری کا تصور کیجیے۔ جن آنکھیں وہ راستے دیکھ رہی ہیں۔ جن سے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم گزرے اور ان پتھروں اور فضاوں کو تک رہے ہیں جن پر کبھی محبوب کریم کی نگاہیں بڑی تھیں۔ جوں جوں شہر مدینہ

عازمین سفر کے لیے قریب آتا جاتا ہے ان کے دل کی حالت لحہ بہ لحہ مضطر ہوتی جاتی ہے۔ پیر محمد طاہر حسین رقم کرتے ہیں۔

"دور سے کھجوروں کے جھرمٹ میں مسجد قباء کی زیارت نصیب ہوئی۔ایک لحہ کیلئے گزرتے ہوئے جب نگاہ گنبد خضری پر پڑی تو جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور آنسو پلکوں پر جھلملانے لگے۔ جوں جوں مواجہہ شریف کے نزدیک ہو رہے تھے۔ بارگاہ محبوب خدا کی حرمت و عظمت سے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ دل دھڑکنے لگے اور ذہن مضمحل ہو گئے۔ کچھ پڑھنے پڑھانے کو یاد نہ رہا۔ جذبات پہ سکوت طاری ہو گیا۔ یہ وہ مبارک خطہ زمین ہے جو مقام و مرتبہ میں عرش علیٰ سے بھی برتر و محترم ہے"۔(۲۷)

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جسے محبت اور اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہو گی۔ وہ ہی محبت الٰہی کی لذت کو پاسکے گا۔ اور جنہیں یہ دولت نصیب ہو جاتی ہے۔ ان کے لئیے یہ متاع ہفت اقلیم سے بڑھ کر ہے۔ ان کے جذبہ محبت کی ترجمانی امام احمد رضا بریلوی یوں بیان کرتے ہیں۔

حاجیوں آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو

کعبہ تو دیکھ چکے ہو اب کعبے کا کعبہ دیکھو

(حدائق بخشش)

اس بارگاہ محبوب خدا میں حاضری کے لئیے عشاق کس قدر مشتاق و مضطرب رہتے ہیں۔ اپنے دل لاکھوں تمنائیں اور امنگیں سجائے بارگاہ نبوی میں حاضری کے طلبگار ہوتے ہیں۔ وقار مسعود اس قلبی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"کتنے ہی شگفتہ خیالات تازہ کھلے غنچوں کی طرح دل میں اتر رہے تھے۔ آنے والے وقت کے بارے میں سوچ سوچ کر دل چنچل پن پر اترا ہوا تھا۔ جیسے کوئی عاشق برسوں اپنے محبوب سے

غائبانہ طور پر ہم کلام رہا فضاوں میں خوابوں خیالوں میں اپنے محبوب کا عکس دیکھتا رہا اور اب اچانک اسے اپنے محبوب کی زیارت اور درشن کی اجازت مل گئی ہو اور بے قابو دل کو تھامے ہوئے لرزتے کپکپاتے قدموں کے ساتھ وہ اپنے محبوب کے گھر کی طرف چل رہا ہو "(۲۸)

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہ انقلابی جذبہ ہے جس کی بدولت صحابہ کرام نے پوری دنیا کو فتح کیا۔ جنہیں کوئی جانتا نہ تھا وہ زمانے بھر ہادی وہائم بن گئے یہ وہ قوت ہے جس سے آپ دنیا کے ہر دکھ اور ظلم کا ہنستے ہوئے سامنا کر سکتے ہیں۔ مذہب اسلام کی روح اور جان حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جب تک انسان کے سینہ میں عشق مصطفی زندہ ہے۔ اسے کوئی سفر تکلیف نہیں دے سکتا۔ یہ کسی میدان میں ہار نہیں سکتا۔ انسان کے ایمان کی زندگی اور موت کا انحصار اسی پر ہے اقبال فرماتے ہیں۔

وہ فاقہ کش کے موت سے ڈرتا نہیں کبھی

اس کے بدن سے روح محمد نکال دو

دل میں جذبہ ایمانی کو زندہ و بیدار رکھنے کے لیے یا تو صحبت عشاقان مصطفی ضروری ہے یا پھر ایسے واقعات جو عشق رسول سے لبریز ہوں وہ ایمان کی تازگی کا سبب بنتے ہیں متاع دید میں مصنف اپنی ایک درویش غلام محمد سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی داستان عشق بیان کرتا ہے جس سے ایمان کو تراوت اور حلاوت نصیب ہوتی ہے

تحریر کرتے ہیں۔

"بڑا عاشق رسول آدمی تھا۔ تقریبا پینتیس برس سے مدینہ منورہ میں مقیم ہے اس نے اپنی ایمان افروز روداد سنائی کہ بچپن میں میں نے ایک سرائیکی شعر سنا جس کا مفہوم اس طرح تھا کہ ایک کے ساتھ دل لگاؤ اور اسی کے ہو جاؤ یہ سنتے ہی میری طبیعت بدل گئی۔ اور حضور علیہ السلام سے اسقدر والہانہ عشق و محبت پیدا ہوئی کہ ہر وقت بیقرار رہنے لگا۔ حتیٰ کہ ایک رات حضور ﷺ کی زیارت سے فیضیاب ہوا۔ سرکار ﷺ نے فرمایا غلام محمد ﷺ !ہمارے پاس مدینہ کیوں نہیں چلے آتے۔ پھر کیا تھا نہ دن دیکھا نہ رات اور پیدل چل پڑا۔ کراچی پہنچا تو حاجیوں کے جہاز تیار ہو

رہے تھے میں حجاج کی خدمت میں مشغول ہو گیا انہیں جو مشکلات پیش آتیں جہاز رانوں کے سامنے پیش کرتا۔ حتیٰ کہ سبھی حجاج نے مجھے اپنا ایلچی بنالیا اور میں انکی خدمات بجالاتا رہا۔ روانگی کا دن آیا تو جہاز رانوں نے مجھے بھی ساتھ بٹھالیا اور اس طرح دیار حبیب ﷺ میں آ پہنچا۔ کافی عرصہ یہاں رہا اور حجاج کو مدینہ منورہ کی زیارت کرواتا پھر جو دوبارہ وطن لوٹا تو اپنی بیوی کو بھی یہاں لے آیا۔ اب بمعہ اہل وعیال سرکار مدینہ کے قدموں میں اپنا بسیرا ہے"۔[۲۹]

پیر محمد طاہر حسین قادری کا نہ صرف مذہبی حیثیت سے بلکہ علمی و ادبی حیثیت سے بھی اہم ہے یہ سفر نامہ سفری آداب و مقاصد کے تمام مراحل، تفصیلات، عشق و محبت کے جذبات، راہ شوق کے تاریخی حالات و واقعات اور مناسک عمرہ کی بیش قیمت اور اہم معلومات کا حامل ہے۔ واقعات اور مضامین کی ترتیب ایک خاص نظم رکھتی ہے۔

۲۔ سفر حجاز:

اس کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"میرے لیے انتہائی خوشی کا مقام اس لیے بھی تھا کہ حضور کی خدمت کا موقع تنہا مجھ حقیر کو مل رہا تحا اور پھر وہ بھی سفر حرمین شریفین کے دوران۔ میری زندگی میں یہ موقع میرے لیے ساری زندگی کا سرمایہ ہے"۔[۳۰]

"سفر حجاز" سلسلہ قطبیہ کا اولین سفر نامہ ہے۔ جو ملک ربنواز قادری کے رنجتہ و قلم سے منصۂ شہود پر آیا۔ یہ سفر نامہ دوہری محبتوں کا حامل ہے۔ مصنف نے یہ سفر اپنے مرشد حضرت سائیں پیر محمد کرم حسین قادری معیت میں اختیار کیا۔ جو ان کے لیے دوگنا سعادت کا باعث تھا۔ حج و عمرہ کا سفر طہارت اور پاکیزگی کا سفر ہوتا ہے۔ انسان اس سفر کا سوچ کر ہی اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ معصیت کے راستے کو تبرک کر کے پاکیزگی کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ سرزمین حجاز مسلمان کے ایمان کا مرکز ہے۔ اور شمع رسالت کے پروانوں کے لیے قرار و راحت جاں ہے۔ وہاں کی حاضری بڑے نصیب اور مقدر سے حاصل ہوتی ہے۔ جس بارگاہ کا ادب فرشتوں کو سکھایا گیا بھلا اس بارگاہ میں حاضری

رہے نصیب جو نصیب ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بلاشبہ ہر مسلمان کے لیے مرکز ایمان اور منبع ء رشد وہدایت ہے۔ وقار مسعود لکھتے ہیں۔

"زیارت حرم اور دیدار روضہ اقدس خدا کی سب سے بڑی نعمتیں ہیں۔ جنہیں اللہ نے نہ صرف تسکین روح کا ذریعہ بنادیا بلکہ اس کی صورت میں مسلمانوں کے ایمان وعقیدے کی پختگی کا ایک اور راستہ متعین کر دیا"۔[۳۱]

حرمین شریفین کا سفر محبتوں اور عقیدتوں کا سفر ہے۔ مصنف سفر حجاز اپنے رفیق سفر اور مرشد کے واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جو ائیر پورٹ پر پیش آیا۔ جس سے محبت کو آتش اور ایمان کو تازگی نصیب ہوتی ہے۔ پیر کرم حسین قادری جو اس سفر میں نمایاں کردار ہیں۔ان کی صحت کا یہ عالم تھا۔ کہ تمام زندگی آپ کا وزن ۳۱کلو سے زیادہ نہ ہو سکا۔ تمام عمر مجاہدو ریاضت میں بسر کی۔ طویل عرصہ بیمار رہنے سے بدن پر نقاہت کا یہ عالم تھا۔ کہ اٹھ کر تھوڑا سا چلنا بھی دوبھر تھا۔ لیکن عشق رسول جن کی راہنمائی کر رہا ہوں۔ جو محبت کی سواری پر محو سفر ہوں۔ ان کی ہمت قوت ایمانی اور شوق دیدار کی طلب کا منظر ملاحظہ ہو۔ ملک ربنواز رقم طراز ہیں۔

"حضور کی جسمانی نقاہت اور کمزوری کا یہ عالم تھا کہ حضور اس وقت عشق چند گز یا چند قدم پیدل چل پاتے تھے اور اتنے بڑے جہاز کی سیڑھیاں چڑھنا تو حضور کے لیے اور بھی مشکل تھا۔ حضور کو اندر ڈیپارچر لاؤنج میں بھیجنے کے بعد میں ایمیگریشن کارڈ بھرنے اور اپنا بورڈنگ کارڈ لینے لگا تا کہ جلد سے جلد حضور کے پاس پہنچ جاؤں۔ اسی اثناء میں جہاز پر جانے کا اعلان بھی ہو رہا تھا۔ میں جلد سے جلد کاروائی مکمل کرانے کے بعد لاؤنج میں داخل ہوا اتنے میں حضور سائیں ہمت کر کے پہلی ہی بس پر جہاز کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ حضور سائیں کو اندر نہ پا کر مجھے تشویش ہوئی جونہی دوسری بس مسافروں کو لینے کے لیے گیٹ کے سامنے آئی میں دوڑ کر اس پر سوار ہو گیا۔ دوسری بس جب جہاز کی سیڑھیوں پر رکی تو میں نے دیکھا کہ حضور سائیں جہاز کی آدھی سے زیادہ سیڑھیاں اکیلے ہی چڑھ چکے تھے۔ غالباً تین سیڑھیاں باقی تھیں کہ حضور تھک کر وہاں سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئے تھے۔"[۳۲]

کعبتہ اللہ کی عظمت و جلالت کا عالم وہ ہی بتا سکتا ہے۔ جس کی نگاہوں نے وہ جلوہ دیکھا ہو انسان خدا کے گھر کی طرف دیکھتا جائے تو اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسے لگتا ہے۔ اس کے سامنے وجود عدم میں چلا گیا ہو۔ کوئی انسان جس بھی مقام و مرتبہ کا ہو۔ اس کی بارگاہ میں پہنچتے ہی سراپا عجز و نیاز بن جاتا ہے۔ عجز و انکسار مذہب اسلام کا وہ پہلو ہے۔ جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے پسند فرمایا۔ جو انسان جس قدر عجز کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اسی قدر مختار و قوت بنا دیتا ہے۔ سفر حجاز میں ہمیں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن میں عجز و انکسار کی تربیت کے عناصر نمایاں ہیں۔ ملک ربنواز حضرت سائیں محکرم حسین قادری کے بیت اللہ کو دیکھنے کا منظر بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

> "بڑے دروازے سے داخل ہو کر اندر حرم شریف کی طرف چل پڑے۔ حضور اس وقت سر مبارک کو قدرے جھکائے بڑی عاجزی و متانت کے ساتھ خانہ خدا پر پہلی نظر پڑی آپ رک گئے اس وقت عظمت و جلال کا عالم تھا۔ ہاتھ باندھے چند گھڑیاں کھڑے رہے پھر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے "(۳۳)

مذہب میں داخل ہونے کے بعد جب ایمان اور محبت رسول حاصل ہو جائے تو حق تعالیٰ کا فرمان کہ اب تقوی اختیار کرو۔ جس کا ذریعہ اعمال صالح اور عبادات و ریاضت ہیں۔ قرب خدا کے لیے انسان کو فرائض کے علاوہ نوافل کا پابند ہونا ضروری ہے۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے۔ کہ بندہ نوافل کے ذریعے میرا مقرب بنتا جاتا ہے۔ اولیاء اللہ کے حیات طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تہجد کے ساتھ، اشراق، چاشت اور اوابین کی بھی پابندی کرتے ہیں۔ حضرت پیر محمد کرم حسین فرماتے ہیں عام آدمی کے لیے پانچ لیکن درویش پر کچھ نمازیں فرض ہیں۔ حضرت قبلہ علام منگانوی گو بیمار تھے۔ مسافر تھے لیکن ان کی عبادت و ریاضت کا عالم دیکھ کر انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی اطاعت گزاری کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔ مصنف سفر حجاز اور ان کی عبادت و ریاضت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قیام مدینہ کے ان ۱۹ دنوں میں حضور تہجد کے وقت اکثر مسجد نبوی میں تشریف لے جاتے پھر سارا سارا دن ریاض الجنہ میں ، کبھی اصحاب صفہ کے چبوترے پر بیٹھ کر درود سلام ،نوافل اور تلاوت قرآن مجید میں گزار دیتے ۔دن کے کسی ایک حصہ میں بھی اپنے ڈیرہ پر تشریف نہ لاتے"۔[۳۴]

سفر حجاز کے مطالعہ سے قاری کو نہ صرف سفری معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ اسے عشق رسول، اطاعت نبوی اورذوق عبادت بھی نصیب ہوتا ہے۔ قاری کی مذہب سے محبت اجاگر ہوتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی وعبادت کا درس پاتا ہے عبادات کی عملی صورت دیکھ کر اس کے کردار میں مذہب اور عبادات پر عمل کرنے کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اس داستان سفر سے انسان سیکھتا ہے۔ کہ مکہ مدینہ کے قیام میں انسان اپناوقت دنیاوی کاموں میں صرف نہ کرے بلکہ زیادہ سے زیادہ وقت یاد الٰہی، ذکر اور عبادت میں بسر کرے۔ جس قدر ہو سکے درود سلام پڑھتا رہے اور تلاوت قرآن مجید کرتا رہے۔ یہ سفر نامہ راہ حجاز میں سفر کرنے والوں کے دلوں میں تحریک پیدا کرتا ہے۔ سائیں کرم حسین کی عبادت کے معمول کا ذکر کرتے ہوئے۔ مصنف رقم طراز ہے۔

"عبادت کا یہ عالم تھا کہ تسبیح پڑھتے پڑھتے حضور کے پیوٹے گھس گئے تھے۔ حضور نے تین لاکھ کی تسبیحات کا ورد فرمایا۔ ایک لاکھ کی تسبیح ختم کرنے پر حضور فرماتے یہ تسبیح کچھ کھردری ہو گئی ہے اور میرے پپوٹے درد کرنے لگ گئے ہیں بازار سے کوئی اور تسبیح لے کر آؤ۔ حکم ملنے پر میں شہر مدینہ کے بازاروں سے گھوم گھوم کر نرم سے نرم تسبیح خرید کر لاتا۔ جب دوسرا لاکھ ختم ہوا تو حضور نے پھر تسبیح بدلنے کا حکم فرمایا حتیٰ کہ میں تیسرے لاکھ پر میں تیسری تسبیح خرید کر لایا"۔[۳۵]

تلاوت کلام مجید کر ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تین ختم قرآن مجید فرقان حمید کے فرمائے اور یہ تینوں ختم روزۂ اطہر کے سامنے اصحابِ صفہ کے چبوترے پر بیٹھ کر فرمائے جو کہ بابِ جبرائیل کے بھی قریب ہے۔ پنجگانہ نماز ، تہجد ، چاشت، اشراق اور دیگر اس کے علاوہ ہوتے تھے"۔[۳۶]

ii. سلسلہ قطبیہ کے سفر نامہ نگاروں کے تاریخی و جغرافیائی پہلو:

اسپین کا مطالعاتی سفر:

سرزمین اندلس جسے آج کل اسپین کہا جاتا ہے۔ جہاں عہد وسطیٰ میں آٹھ صدیاں مسلمانوں کا دور حکومت رہا اگرچہ مَورخین نے اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے میں کسر نہیں چھوڑی لیکن مسلمانوں کے دور حکومت میں ہونے والی سائنسی، علمی، تہذیبی و ثقافتی اور فنی ترقی کی ناچاہتے ہوئے بھی تعریف کرنے پر مجبور ہیں۔ مسلم دور حکومت کے زوال کے بعد بھی مسلمانوں کے علوم، وفنون کے نقوش و آثار تاریخی عمارات پر واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہی وہ کشش ہے جس نے سفر نامہ نگار پیر محمد طاہر حسین کو اس خطہ کا سفر کرنے پر مجبور گیا۔ ان کا یہ سفر نامہ حال و ماضی کی داستان کا حسین امتزاج ہے۔ محمد حسین لکھتے ہیں۔

> "اکثر لوگ سمجھتے ہیں مسلمانوں نے پورے ملک اسپیب پر حکومت کی مگر یہ بات صحیح نہیں البتہ اسپین کے بڑے حصے پر مسلمان غالب آگئے تھے۔ ۹۱۰ء میں مسلمان اپنی آخری حد پر پہنچ گئے تھے۔ مگر پھر بھی مغربی حصہ میں مسیح ریاستیں قائم تھیں۔ گویا چوتھائی حصہ پر مسیح ہمیشہ قابض رہے مسلمانوں کے زیر قبضہ علاقہ کو "اندلس" کہا جاتا ہے"۔[۳۷]

سفر نامہ کے مطالعہ سے سفر نامہ نگار کے فنی اور تاریخی شعور کا پتا چلتا ہے۔ اقتباس تو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے وہ مسلم تاریخ کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے شاندار ماضی اور حال سے بخوبی واقف ہیں۔ اس سفر کے لیے جب وہ رخت سفر باندھتے ہیں تو ان کی آنکھوں کے سامنے مسلم تاریخ عہد بہ عہد گزرنے لگتی ہے۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "قرطبہ و غرناطہ کو خیالوں میں دیکھنے لگا مسلم فاتحیں کے بعض واقعات ایمان کی تقویت کا باعث بنتے اور اپنا سر فخر سے بلند ہوتا نظر آتا۔ جبکہ سلاطین کی بزدلی اور عاقبت اندیشی کے حالات ندامت کا باعث بنتے۔ گویا میرے اندر ہی اندر ایک فلم چل رہی تھی"۔[۳۸]

"اسپین کے مطالعاتی سفر" میں جیسے جیسے سفر کرتے جائیں تو سفر نامہ نگار کا شعور واضح ہوتا جاتا ہے۔ یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ آپ محض سفر واقعات اور حالات کو قلم بند نہیں کرتے بلکہ قاری کو اپنے علمی جغرافیائی معلومات سے بھی مالامال کرتے ہیں۔ اندلس کا محل و قوع اور رقبہ کا ذکر کرتے ہوئے پیر صاحب تحریر کرتے ہیں۔

"اندلس کو انگریزی زبان میں "اندلوسیا" کہلاتا ہے اور اب اصلاح موجودہ میں اسپین کے صرف جنوبی خطے کیلئے استعمال کی جاتی ہے بحیرہ روم اور بحیرہ اوقیانوس کے سنگم پر واقع۔ اس خطے کا رقبہ ۸۷۰۰۰ مربع کلو میٹر ہے۔ یہاں آج کے جدید یورپ اور پسماندہ افریقہ کے درمیان محض چودہ کلو میٹر آبنائے جبل الطارق جدائی ڈالتی ہے۔"(۳۹)

تاریخ اندلس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ سیاسی لحاظ سے مسلم دور حکومت کو تین بڑے ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اسپین میں مسلم حکومت کا دور اول ۷۱۱ء تا ۷۵۶ء کے عرصے پر محیط ہے۔ جسے عہد عرب امراء بھی کہا جاتا ہے۔ عباسیوں کی داروگیر سے فرار اموی شہزادہ عبدالرحمٰن جب اندلس پہنچا تو مسلمانوں کے دوسرے دور کا آغاز ہوا جسے قومی خلافت کہتے ہیں۔ اس بارے پیر محمد طاہر حسین لکھتے ہیں۔

"اس نے یہاں اپنی ایک فوج بنائی اور عباسیوں کے ماتحت امراء کو شکست دے کر اپنی حکومت کا اعلان کیا۔ اس کا دارالخلافہ بھی قرطبہ ٹھہرا اور اسی نے مسجد قرطبہ کو تعمیر کروایا۔ اسپین میں یہ خلافت ۷۵۶ء سے لے کر ۱۰۳۱ء تک باقی رہی"۔(۴۰)

ہسپانیہ کے مسلم دور میں مسلمانوں نے وسطی یورپ میں علم و دانش کے کئی درخشاں ابواب رقم کئے اس بات کا اعتراف مغربی اور یورپی مؤرخین نے بھی اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے۔ پیر صاحب مشہور برطانوی مؤرخ پٹی کی کتاب "عربوں کی تاریخ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں۔

"قرطبہ کتب خانوں، مساجد اور محلات کا شہر تھا۔ اس کی تہذیبی ترقی بین الاقوامی شہرت اختیار کر چکی تھی اس کی میلوں لمبی پختہ اور شفاف گلیاں رات کی تاریکی میں بھی روشن رہتی تھیں۔ اس ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے سات سو سال بعد لندن کی گلیوں کو روشن

کرنے کیلئے ایک بھی عوامی لیمپ موجود نہیں تھا۔ بلکہ صدیوں بعد کے پیرس کا یہ حال تھا کہ بارش میں اگر کوئی گھر سے باہر قدم رکھتا تو گھٹنوں تک کیچڑ سے لت پت ہو جاتا۔ اسی طرح جب اس دور میں برطانیہ کی شہرہ آفاق، آکسفورڈ یونیورسٹی انسانی غسل کے عمل کو ایک کراہت انگیز فعل سمجھتی تھی۔ قرطبہ کے سائنسدان پر تعیش، حماموں میں نہانے کے مزے لوٹتے تھے۔"[۴۱]

iii. سلسلہ قطبیہ کے سفر نامہ نگاروں کے اصلاحی پہلو:

ترکی میں ایک ہفتہ:

اس سفر نامے کا تعلق بلاد اسلامیہ کے سفر ناموں سے ہے۔ بلاد اسلامیہ کے سفر ناموں کے ذریعے مقدس مقامات، شعائر اسلام اور مذہبی تاریخ کئی گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ قاری جب مسلمانوں کے شاندار ماضی کا مطالعہ کرتا ہے۔ تو اس کے سینہ میں اپنی ملت سے محبت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ وہ اپنی روح میں تازگی محسوس کرتا ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں نے پوری دنیا کو تہذیب و تمدن، ثقافت، فنون لطیفہ، فن تعمیر، سائنس اور فلسفہ و تاریخ میں ان گنت خدمات انجام دی ہیں۔ تاریخ انسانی پر مسلمانوں اور اسلام عظیم احسان ہیں جنہیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

یہ سفر نامہ ترکی کا ہے جو عالم اسلام کا ایک مدت تک مرکز رہا۔ دنیا پر ایک طویل عرصہ حکومت کرنے والے خاندان عثمانیہ نے ایک مدت تک زمانہ عروج دیکھا۔ سلجوق ریاست کے زوال کے بعد خلافت عثمانیہ قائم ہوئی تھی اس سلطنت کا بانی سلطان غازی عثمان تھا۔ اس ضمن میں انشاء تحریر کرتے ہیں۔

"سلجوقی سلطان علاؤالدین اپنے کسی مد مقابل سے برسر پیکار تھا۔ ارطغرل نے بہادری سے سلجوقی سلطان کا ساتھ دیا۔ وہ غالب آگیا۔ صلہ میں سلجوقی سلطان نے اس کو ایک خطہ زمین بطور جاگیر عطا کر دیا، غازی عثمان خان اس کا وارث ہوا۔ اسے روم کے عیسائیوں سے جہاد کا شوق تھا اور اسی شوق نے اسے سلجوقی سلطنت کے خاتمے پر خلافت عثمانیہ کی بنیاد رکھوائی"۔[۴۲]

اسلام کے شاندار ماضی میں آنے والی نسلوں کے لیے کئی اصلاحی پہلو نکلتے ہیں۔ جذبہ جہاد جو آج ناپید ہوتا جارہا ہے۔ معاشرہ سیکولرزم اور لبرلزم کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ استنبول ایسا شہر ہے جس پر جہاد کرنے والے لشکر کو اللہ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں بخشش کی خوش خبری سنادی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اوّلَ جَیْشٍ مّن یَغْزُونَ مَدِیْنَۃَ قَیصر مَغْفُوْرٌ لَھُمْ۔

میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر "قسطنطینیہ" پر حملہ کرے گی اسے بخش دیا جائے گا۔"(۴۳)

اس بڑی بشارت پر مختلف ادوار میں کئی اسلامی لشکروں نے قسطنطینیہ پر چڑھائی کی مگر ہر بار ناکامی دیکھنا پڑی۔ کبھی موسم کی شدت تو کبھی شہر کا محل وقوع مشکلات پیدا کرتا رہا۔ پیر محمد طاہر حسین رقم طراز ہیں۔

"ہجری ۶۶۸ء عیسوی کو مجاہدین اسلام ایک لشکر جرار حضرت فضالہ بن عبید کی قیادت میں روانہ ہوا۔ جس میں کئی مقتدر صحابہ کرام بھی شامل تھے یہ عظیم لشکر ملاطیہ، قیصریہ اور عمودیہ کے راستے قسطنطنیہ پہنچا، میزانِ رسول حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس قدر طویل سفر اختیار فرمایا۔ اس دوران آپ بیمار ہوگئے جب زندگی کے آثار ختم ہوتے دکھائی دیئے تو وصیت فرمائی دشمن سے جہاد کے وقت میرا جسد بھی اٹھا کر ساتھ لے جانا اور فصیلِ شہر کے باہر جتنا قریب ممکن ہو دفن کر دینا، مجاہدینِ اسلام نے آپؓ کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے دشمن اس قدر شدید حملہ کیا کہ اسے شہر تک دھکیل دیا اور حسبِ وصیت فصیلِ شہر کے باہر آپؓ کی تدفین کر دی۔"(۴۴)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سلطنت عثمانیہ کے ساتویں خلیفہ سلطان محمد کے ہاتھوں پوری ہو جو بعد میں فاتحین کے نام سے مشہور ہوئے سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں قیصر کی ہلاکت ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پورا ہوا۔ جب قیصر ہلاک ہو گا تو پھر کوئی قیصر پیدا نہ ہو گا۔ اس ضمن میں تقی عثمان لکھتے ہیں۔

"اس کی موت پر گیارہ سو سال کی بازنطینی سلطنت روما کا خاتمہ ہو گیا جس کی ابتدا بھی قسطنطین سے ہوتی تھی۔ اور انتہا بھی قسطنطین پر ہوئی اس کے بعد قیصر کا لقب ہی ایک تاریخی داستان بن گیا"۔[۴۵]

سلطان محمد فاتح نے اس شاندار فتح کے ساتھ دلوں کی فتح کا ارادہ کیا اور امت مسلمہ کا جو خاصا تھا اسی کے مطابق اذان دلوا کر نماز کا اہتمام کیا اور لوگوں سے حسن سلوک اختیار کیا۔ دوسرے بادشاہوں کی طرح لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم کرنے کی بجائے سلطان نے رومیوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جس سے انہوں نے اپنے دل کے قلعوں کے دروازے بھی اسلام کے لیے کھول دیئے۔ ہماری اور آنے والی نسلوں کے لیے اصلاح کے راستے روشن ہو جاتے ہیں کہ مسلمان کے لیے اسلامی طرز حیات کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم فاتح بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اخلاق و کردار کو اسلام کے مطابق بنانا ہو گا۔ پیر محمد طاہر حسین قادری رقم طراز ہیں۔

"سلطان محمد فاتح اپنے سواروں کے ساتھ آیا صوفیا کے دروازے پر اترا اور اپنے قول ک مطابق وہاں اذان دلوا کر نماز ظہر ادا کی۔ سلطان نے رومیوں کے ساتھ نہایت نرم برتاؤ کیا"۔[۴۶]

اس سفر نامہ کے مطالعہ سے ایک اہم پہلو کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ کہ ہمارے معاشرے آج کل ایک دوش مزارات اور مقبروں کے خلاف باقاعدہ مہم چلائے ہوئے اور اسے بدعت کا نام دے کر سادہ لوح لوگوں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ ایک ایسے سلطان جن کے بارے بخشش اور اس کی عظمت وشوکت کی گواہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم دیں اس کے احسن عمل کو بدعت یا گمراہی کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے۔ ان کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ دور حاضر کے تقوی دان علماء سے ہزار گنا بہتر مسلمان، سچے عاشق رسول، مجاہد اور دین اسلام کو زیادہ جاننے اور عمل کرنے والے تھے۔ وہ بزرگان کے مزارات کی تلاش کروا کر ان کی خوبصورت تعمیر کرواتے ہیں جن کی آج بھی زیارت کی جاتی ہے۔ اور ہمہ وقت وہاں قرآن خوانی، درود سلام اور ذکر وفکر کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

پیر محمد طاہر حسین اس بارے تحریر کرتے ہیں۔

"سلطان محمد فاتح نے پندرھویں صدی عیسویں میں جب قسطنطنیہ فتح کیا تو آپ کے مزار کی لاش شروع کی۔ عمر رسیدہ بزرگوں کی سینہ بہ سینہ روایات کو سنا۔ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد حضرت آق شمس الدین نے سلطان کو اس مقدس مقام کی نشاندہی کی، حضرت ابو ایوبؓ کے روضہ اور مسجد کے درمیان چنار کے دو قدیم درخت ہیں۔ جن کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ دورِ صحابہ کرام کے ہیں ۔سلطان محمد فاتح کو آپ کے مزارِ انوار کے بارے انہی کی نشاندہی کی گئی تھی۔ یہ درخت تادمِ تحریر موجود ہیں اور دیکھنے میں بھی قدیم لگتے ہیں۔ آخر بزرگوں کی تائید کے بعد سلطان نے اس مقام پر آپ کا عظیم الشان روضہ مبارک تعمیر کروایا۔" (۴۷)

ج۔ فنی واسلوبی جائزہ

i. فنی پہلو:

مشاہدات:

پیر محمد طاہر حسین کی شخصیت میں جو بنیادی اور نمایاں وصف ہیں۔ ان میں سے ایک عمیق نظری ہے۔ ان کی شخصیت اور تحریروں میں آپ کو بلا کا مشاہدہ ملے گا۔ جب بھی وہ کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو اسے اس کی جزئیات سمیت قلم بند کر لیتے ہیں۔ پڑھتے ہوئے قاری خود اس منظر نامے کا حصہ بن جاتا ہے اس کے نہ صرف قلبی جذبات بلکہ بصری احساسات کو بھی تسکین ملتی ہے۔ جبل ثور کے پاس سے گزرتے ہوئے پیر صاحب نے جو نقشہ کھینچا ہے ملاحظہ ہو۔

"جبل ثور اپنی بلندی کی وجہ سے نزدیکی پہاڑوں پر نمایاں حیثیت رکھتا ہے واپسی پر ڈرائیور نے راستہ تبدیل کر لیا اور شعاعی سرنگوں کی طرف رواں دواں ہوا یہ سرنگیں کئی کئی ایکڑ پر مشتمل تھیں جب گاڑی سرنگوں میں داخل ہوتی تو ایک عجیب قسم کی گونج برپا ہو جاتی آدمی حیرت میں گم ہو جاتا ہے اوپر فلک بوس پہاڑ اور نیچے انکا سینہ چاک کر کے بڑی بڑی سرنگیں بنائی گئی ہیں"۔ (۴۸)

اقتباس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار نہ صرف اپنے گرد و پیش سے مکمل طور پر باخبر ہے بلکہ چیزوں کو بہ نظر غائر دیکھ کر اپنی تخلیقی احساسات کا حصہ بنانا جانتا ہے اور پھر وہ اپنے تخلیقی احساس کو قرطاس پر اس خوبصورتی سے منتقل کرتا ہے۔ کہ وہ لفظ محض لفظ نہیں رہتے تصویریں بن جاتے ہیں۔ حضرت سیدنا امیر حمزہ کی فرار کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے قاری کو بھی ساتھ ہی زیارت کروا رہے ہوں۔ آیئے ذرا ہم بھی دیدہ و دل کو ان کی محبت سے معمور کر لیں اور نگاہ شوق سے زیارت کی لذت کو محسوس کریں۔

"جبل عینین کے ساتھ ہی ایک بڑی وسیع و عریض سفید چار دیواری ہے جس کے درمیان میں سید الشھداء، سیدنا امیر حمزہ محو استراحت ہیں آپ کا مزار پر انوار پتھر کے چھوٹے چھوٹے بلاک جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ آپ کے مبارک قدموں میں بھی ایک مزار ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ حضرت مصعب بن عمیر کی مرقد منورہ ہے۔ دونوں مزارات ایک جیسے ہیں فقط چار دیواری میں نصب لوہے کے جنگلہ سے زیارت کر سکتے ہیں"۔[۴۹]

پیر صاحب اخلاقی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی عناصر کا بھی بغور مشاہدہ کرتے ہیں۔ انہوں نے استنبول کے ہوٹل میں ناشتا کیا۔ انتظامیہ کے طور طریقہ کو سراہا۔ وہ سفر نامے میں بتاتے ہیں کہ وہاں ناشتہ کسی نوعیت اور کس اہتمام پر مشتمل ہوتا اور وہ صفائی ستھرائی کا کیسے خیال رکھتے ہیں۔ سفر نامے سے ایک اقتباس دیکھیے۔

"صبح ناشتہ کے لیے سب لوگ ہوٹل کے صدر دروازے کے قریب لاؤنج میں آ بیٹھتے ہیں۔ وہیں ناشتا کا سامان رکھا جاتا ہے۔ عام طور پر سات بجے سے نو بجے تک ٹائم ہوتا ہے۔ ایک چیز جو ہم نے انوکھی دیکھی کہ یہاں ناشتا میں بھی سلاد شامل ہوتا ہے۔ کھیرے، ٹماٹر، زیتون اس کے علاوہ ابلے ہوئے انڈے، مکھن، چیز، جیلی، کیک، بریڈ کی جگہ وہاں بڑے بڑے بند ہوتے ہیں۔ چائے اور وہاں کا مخصوص قہوہ بھی ٹیبل پر موجود ہوتا ہے"۔[۵۰]

دلچسپ بات تو باقی دنیا سے الگ بھی ہے وہ پیر صاحب کے مطابق کچھ یوں ہے۔ کہ

"ناشتے کا سامان ٹیبل پر وافر پڑا ہوتا ہے ہر کسی کو جو کچھ اور جتنا چاہیے پابندی نہیں ہے البتہ پانی مفت نہیں ملتا۔ ہم جتنے دن بھی ترکی میں رہے پانی خرید کر ہی پیا"۔[۵۱]

تاریخ:

کسی ریاست کی تاریخ وہاں کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ تاریخ اجتماعی زندگی کی مظہر ہوتی ہے۔ عام طور پر تاریخی معلومات سفر نامے کا حصہ نہیں بنتیں لیکن اندلس کی تاریخ کے ساتھ بہت سے واقعات جڑے ہوئے ہیں مسلمانوں نے اس سرزمین پر تقریباً آٹھ سو سال حکومت کی اور ایک شاندار اسلامی تہذیب کی آبیاری کی۔ اندلس میں موجود مسجد قرطبہ، بائنا، وادی الکبیر، القصر، الحمرا، ایوان السقر، مجسمہ چوک، گولڈن ٹاور، فوجی عجائب گھر اور البائرن وغیرہ کے ساتھ تاریخی واقعات اور داستانیں وابستہ ہیں۔ جو مسلم عہد کی آج بھی یاد دلاتی ہیں۔

ترکی میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ہر جگہ اور شہر کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ منسوب ہے۔ پیر صاحب کے سفر نامے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ جیسے تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ جس جگہ کو بھی دیکھتے ہیں اس کے ماضی بعید کے واقعات تک جھانکتے ہیں۔ استنبول کو دیکھا تو اس شہر کی تاریخ کا آئینہ یوں پیش کرتے ہیں۔

"اس شہر کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس کی بنیاد ۴۵۸ء قبل مسیح میں رکھی گئی مختلف ادوار میں اس شہر کے نام بدلتے رہے۔ ایک وقت تھا جب "زار غرار" اس شہر کا نام تھا پھر "میکلا غارد" رکھا گیا، رومی، یونانی اور بازنطینی ادوار میں اس کا نام "بیزنطہ تھا۔ جب رومی بادشاہ قسطنطین نے ۳۳۰ عیسوی میں عیسائی مذہب اختیار کر کے اس شہر کو پایہ تخت بنایا تو بادشاہ کے نام سے یہ شہر "قسطنطنیہ" معروف ہوا۔"[۵۲]

پیر محمد طاہر حسین جن جن مقامات کی زیارت کرتے ہیں۔ اس عمارت کی تاریخ کھولتے چلے جاتے ہیں۔ پیر صاحب جب نیلی مسجد کو دیکھتے ہیں تو اسلامی فن تعمیر کے اس عظیم شاہکار کے وجود میں آنے کی تاریخ کے متعلق اپنے سفر نامے میں پیر صاحب جو معلومات فراہم کرتے ہیں قابل تحسین ہیں۔ سفر نامے میں تحریر کرتے ہیں۔

"ایک نہایت خوبصورت مسجد بنوائی جو ترکی فنِ تعمیر کا عظیم شاہکار ہے پھر اس کی مزید توسیع سلطان احمد اول کے زمانہ میں ہوئی۔ سلاطینِ عثمانیہ کے عہد میں اس مسجد کو خاص اعزاز حاصل تھا ۔ہر نئے سلطان کی رسمِ تاج پوشی اسی مسجد میں کی جاتی تھی اور سلطان عثمان خان کی تلوار اس کی کمر میں لٹکانا گویا اختیاراتِ سلطنت کی منتقلی تھی۔ ۱۸۰۰ عیسویں ایک شدید زلزلے کی وجہ سے قدیم مسجد شہید ہو گئی تو موجودہ مسجد اُسی نقشہ اور بنیادوں پر تعمیر کی گئی جو حسن وخوبی کا نادر مرقع ہے۔"(۵۳)

پیر محمد طاہر حسین اپنے سفر ناموں میں جس جگہ بھی جاتے ہیں وہاں کے تمام جغرافیائی خدوخال بھی پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے سفر نامے ان کے بالغ شعور سے مکمل آگاہی دے رہے ہیں۔ "اسپین کے مطالعاتی سفر" میں جب وہ مختلف شہروں اور مقامات کا تذکرہ کرتے ہیں تو نہ صرف اس کی تاریخ بلکہ حدود اربعہ اور اس کے گردونواح کا بھی نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ پیر صاحب اپنے سفر سپین کے حالات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"یہ مسجد ایک وسیع رقبہ پر مشتمل ہے جو ۳۳۱۵۰ مربع ہاتھ شمار کیا گیا ہے۔اس مسجد کے ٹوٹل ستون ۱۴۱۷ ہیں جو زیادہ تر اندلس کی کانوں سے سنگِ مرمر کے نکالے گئے ہیں۔اُن کے رنگ سفید ،نیلگوں سبز، سرخ ،سیاہ ،غرض ہر رنگ جو سنگِ مرمر میں ملا اُس سے ستون تعمیر ہوئے۔ستونوں کی کثرت کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا قطاروں میں بے شمار کھجوروں کے درختوں کے اوپر ایک وسیع اور منقش چھت کھڑی ہوئی ہو۔یہی وجہ ہے مسجدِ قرطبہ کو دیکھ کر علامہ اقبال نے یہ نظم قلم بند کی اس کے ایک شعر میں لکھتے ہیں۔

ہے تیری بناپائیدار، تیرے ستون بے شمار شام کو صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل قسطنطنیہ کے بادشاہ نے کئی ہزار من بلور، نگینے اور رنگین پتھر اس مسجد کے لیے بھجوائے۔ مسجد کا تمام فرش سنگِ سفید کا تھا۔ستونوں اور محرابوں پر سونے کی میناکاری اور جواہرات کی پچی کاری دیکھنے کے قابل تھی"۔(۵۴)

منظر نگاری:

منظر نگاری سفر نامہ نگاری کا اہم جزو ہے۔ ایک اچھا سفر نامہ نگار جو منظر بھی دیکھتا ہے۔ اس کی تصویر ہو بہو لفظی سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ جس کو پڑھ کر سارا منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ سفر نامہ ترکی میں ایک ہفتہ کار گر جائزہ لیا جائے تو سفر نامے کے مصنف پیر محمد حسین اس خوبی پر پورا اترتے دکھائی دیتے ہیں ہمیں ان کے سفر ناموں میں منظر نگاری کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جو عمدہ منظر نگاری کی ترجمان ہیں۔

پیر محمد حسین دوران سفر میں پیش آنے والے مناظر کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اس کو اپنی تحریر میں یوں اجاگر کرتے ہیں کہ منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ دیکھئیے اقتباس

> "صدر دروازے کے اوپر بڑی خوبصورت خطاطی میں کلمہ طیبہ تحریر ہے۔ جس کی زمین سبز ہے جبکہ حروف کا رنگ سنہری ہے دروازے کے دائیں بائیں کو نیلی گل کاری سے مزین ٹائلوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جو پہلی نظر دیکھنے سے ہی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ یہ نہایت اہم مقام ہے دروازے کے ساتھ دو سیکورٹی نوجوان بھی اپنی ڈیوٹی پر چاک وچوبند کھڑے رہتے ہیں"۔[۵۵]

پیر صاحب کا مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ دوران سفر آپ اپنے ارد گرد کا مشاہدہ بڑی عمیق نظری سے کرتے ہیں چاہے وہ کوئی فطرتی منظر ہو یا کسی عمارت کا منظر، پیدل ہوں یا گاڑی میں بیٹھے ہوں وہ اپنے مشاہدے میں آنے والی ہر چیز کو خیال میں قید کر لیتے ہیں۔ آپ کسی بھی منظر کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ ہر چیز کو اپنے سفر نامہ کا حصہ بنایا ہے۔ ان کا سفر نامہ پڑھنے سے بہت سی معلومات وہاں کی طرز تعمیر اور طرز معاشرت سے متعلق قاری کو میسر آتی ہیں۔ جو دیگر ترکی سفر ناموں میں موجود ہیں۔ پیر صاحب کا یہ کمال ہے کہ وہ ہر چھوٹی بڑی چیز کو سفر نامے کا موضوع بنا لیتے ہیں جس سفر نامے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ دیکھیے:

> "ایک چیز جو ہم نے انوکھی دیکھی کہ یہاں ناشتے میں بھی سلاد شامل ہوتا ہے۔ کھیرے، ٹماٹر، زیتون اس کے علاوہ ابلے ہوئے انڈے، مکھن، پنیر، جیلی، کیک اور بریڈ کی جگہ وہاں بڑے بڑے بند ہوتے ہیں"۔[۵۶]

پیر محمد طاہر حسین مسلمانوں کی یادگار عمارات کی زیارت کرتے ہیں ہر در و دیوار کے نقش و نگار اور وہاں موجود اشیاء کو اپنے مشاہدے میں شامل کر لیتے ہیں ۔ منظر کو بیان کرتے ہوئے ایسی ایسی جزئیات بیان کرتے ہیں جو آپ کے گہرے مشاہدے کی عکاس ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ قاری ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ توپ کاپی پیلس میں موجود ترکات مقدسہ کی زیارت کا بیان کرتے ہوئے یوں منظر پیش کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔

"سب سے پہلے جس کمرے میں داخل ہوئے، وہاں خانہ کعبہ سے منسوب اشیاء نہایت سلیقے سے سجا کر رکھی گئی تھیں مثلا بیت اللہ شریف کے دروازے باب توبہ کا ایک قدیم تختہ، تالے اور چابیاں، مختلف ادوار کے میزاب رحمت یعنی پرنالے، حجر اسود کے گرد نصب کیا گیا چاندی کا حلقہ، غلاف کعبہ کے متعدد قطعات وغیرہ اس کمرے سے ملحق بائیں طرف دوسرے کمرے میں داخل ہوئے وہاں دیوار میں ہی دو طاقچے بنائے گئے تھے جن کے آگے شیشہ نصب تھا، پہلے طاقچے میں حضرت داؤد علیہ السلام کی تلوار لٹک رہی تھی، اس کے پاس ایک لوح پڑی تھی جس پر عبرانی زبان میں عبارت تحریر تھی"۔(۵۷)

سفر نامہ "متاع دید" سفر حجاز کی روداد ہے۔ اس سفر نامہ میں بھی پیر محمد طاہر حسین قادری ایک اچھے سفر نامہ نگار کی طرح حسن منظر کو بھی دیکھتے ہیں۔ اپنے وسیع مشاہدہ کو بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جہاں عام آدمی روضہ اطہر کی جالیوں کی زیارت کر کے سبحان اللہ کہتا ہوا گزر جاتا ہے۔ آپ جالیوں کے اندر موجود غلاف اور اندرونی منظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا قاری کے سامنے ایک واضح تصویر آجاتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"جالی مبارک سے صرف غلاف ہی نظر آتا ہے جس کا رنگ گوڑھا سبز ہے۔ اس پر تقریبا دو فٹ چوڑا اور تین چار فٹ لمبا سنہری رنگ کا ایک جیسا ٹھیہ لگا ہوا ہے۔ ہم جالی مبارک کے اندر والی اشیاء کو بغور دیکھتے رہے۔ اندر سفید سنگ مرمر کا فرش لگا ہوا ہے۔ شمال مشرقی کونے میں ایک گیہوں والی ٹوکری پڑی تھی جو اوپر سے بکس کی طرح بند تھی۔ ساتھ ہی لمبی لمبی چھڑیاں کھڑی تھیں۔ جن سفید بال لگے ہوئے تھے"۔(۵۸)

ایک مقام پر اغواط ذکر کرتے ہوئے اس اک حلیہ ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے مکمل تصویر ابھر آتی ہے۔ اغواط ان لوگوں کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار پر انوار کی صفائی و خدمت کرتے ہیں روضہ مبارک کی جالیوں کے امین ہیں اور سیدنا بلال حبشی کے نسل پاک سے چلے آرہے ہیں یہ حضرات دنیاوی معاملات سے لاتعلق ہوتے ہیں رات دن حرم پاک کے اندر ہی رہتے ہیں پیر صاحب ایک اغواط سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

"اپنی فطری حبشی شکل ومشابہت، سانولی رنگت، موٹے موٹے ہونٹ، ظاہری علامت یہ ہے کہ ان کی کمر میں ایک چادر بندھی ہوئی ہے۔ جس کا کچھ حصہ نیچے لٹکتا رہتا ہے اور سر پر ذرا بلند تلے دار ٹوپی کے اوپر پگڑی کا سفید رومال لپٹا ہوتا ہے واہ رے نصیب کہ دو عالم کے سلطان کے دربان ہیں"۔[۵۹]

ii. اسلوبی پہلو:

اسلوب وہ قرینہ ہے کہ اگر اس میں دلکش الفاظ، تشبیہات، ضرب الامثال کی دھنک بھر دی جائے اور واقعات و جذبات کو حسن و جمال کا آئینہ دکھا دیا جائے اور اس میں کچھ دلچسپی کا عنصر شامل کر دیا جائے تو اس کی دل کشی بڑھ جاتی ہے ۔اور قاری کا دل موہ لیتی ہے۔ کسی بھی تصنیف کے اسلوب کو بھاری بھر کم الفاظ سے اتنا بوجھل نہ بنا دیا جائے کہ جس کو پڑھ کر دل اچاٹ ہو جائے اور نہ ہی اتنے تخیل الفاظ استعمال کئے جائیں کہ بات ہی سمجھ نہ آسکے۔ بلکہ اسلوب کو سادہ اور دلکش ہونا چاہیے. ڈاکٹر سید عبد اللہ اشارات تنقید میں لکھتے ہیں۔

"اسلوب مصنف کی شخصیت کا عکس ہے جو الفاظ کی صور میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسلوب مصنف کے ذہنی اور جذباتی تجربے کا خارجی روپ ہے جس میں مصنف کے باطن اور نفس کی دنیا کی پوری تصویر نمودار ہو جاتی ہے مصنف کے تجربات الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں یہ الفاظ ان تجربات میں یوں جذب ہو کر ظاہر ہوتے ہیں جس طرح شراب میں مستی، پھول میں رنگ اور خوشبو۔ ان کا باہمی دہی تعلق ہے جو روپوست کو شخص انسانی سے ہوت ہے"۔[۶۰]

پیر محمد طاہر حسین قادری کی دیگر خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے سفر نامے کا اسلوب سلیس، سادہ اور رواں ہے۔ جس کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری بھی ان کا ہم سفر ہے۔ اسپین کے مطالعاتی سفر سے ان سطور کو دیکھیے۔

"ہم سوا دگھنٹے میں لوٹن سے میڈرڈ پہنچے۔ ائیر پورٹ کی عمارت کوئی خاص نہ تھی درمیانے درجے کی تھی، میں نے جتنے بھی ائیر پورٹ دیکھے ہیں دبئی کا جواب نہیں"۔[۶۱]

ایک اچھا سفر نامہ نگار سفر کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھتا ہے اور اپنی تحریر کو پر اثر بنانے کے لیے موقع محل کی مناسبت سے محاورات، تلمیحات اور استعارہ کا استعمال بھی کرتا ہے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری نے بھی اپنے سفر ناموں میں موقع محل کی مناسبت سے ان کی سادگی اور روانی کو بڑھانے کے لیے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ یہ اشعار عربی، فارسی اور اردو میں ہیں۔ جن سے دلچسپی کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ قاری کا ذوق بھڑک اٹھتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت اور ادب واحترام کا ذکر کرتے ہوئے عزت بخاری کا ایک شعر تحریر کرتے ہیں۔

ادب گاہ ہیت زیر آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں"[۶۲]

اسی طرح غار حرا کی زیارت کے بعد طبیعت میں سوز گداز کا غالب ہو جاتا ہے اور یہ اشعار یاد آجاتے ہیں جو اس جوش طبیعت کو سہارا دیتے ہیں۔

اے غار تیرے نقش ابھی اتنے نئے ہیں

لگتا ہے کہ سرکار ابھی اٹھ کے گئے ہیں [۶۳]

دوران سیاحت آپ کو بار بار مسلمانوں کی یاد رفتہ ستانے لگتی ہے۔ اس طرح تمام سفر مسلمانوں اور عربوں کی یادوں کا امین معلوم ہوتا ہے۔ ہر موقع پر تاریخ اسلام ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری کی تحریر کے اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اندلس کی عمارات، جغرافیائی حالات اور ماحول کو دیکھتے ہوئے ان کا موازنہ پاکستان اور سعودی عرب

سے کرتے ہیں۔ مثلا ایک جگہ نہایت سادہ اور سلیس انداز میں میڈرڈ کے علاقوں کا موازنہ چکوال اور راولپنڈی سے کرتے ہیں۔

"ہم شہر میں داخل ہوئے تو مکانات اور پلازوں کا طرز تعمیر یورپ سے مختلف جو مشرقی اور عرب ماحول سے زیادہ قریب تھا ہیں ایسا لگا یہاں کی سرزمین چکوال اور روالپنڈی جیسی اور عمارتیں سعودیہ کے شہروں کا نمونہ تھیں۔ راستے میں گزرتے لوگوں کی شکل وصورت میں عربوں کے نقش ونگار کی جھلک پڑی تھی"۔[۶۴]

ربط وترتیب:

پیر محمد طاہر حسین قادری کے اسلوب کے دیگر اوصاف میں سے ایک واقعات کی ربط وترتیب ہے۔ واقعہ نگاری سفر نامہ کا ایک اہم جزوی ہے اگر واقعات کی ترتیب میں تعطل ہو گا تو فکری الجھن اور تذبذب کا شکار ہو جائے گا۔ جس سے دلچسپی کا عنصر زائل ہو جاتا ہے۔ جب کہ اگر واقعات ایک ترتیب میں اپنے ربط کو قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو قاری کا تجسس بڑھتا جاتا ہے۔ دلچسپی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

پیر صاحب اپنے سفر نامے کو اس ترتیب سے آگے بڑھاتے ہیں کہ قاری ایک ہی نشت میں سفر نامہ کو ختم کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ آپ کے اسلوب میں واقعات کی ربط وترتیب تمام سفر ناموں میں دیکھی جاسکتی ہے مگر بطور مثال یہاں "ترکی میں ایک ہفتہ" سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں

قسطنطنیہ کی فتح کی کہانی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عثمانی دور حکومت میں سلطان مراد ثانی (م:۸۵۵ء) نے قسطنطنیہ کی فتح کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا تحا۔ وہ ہر وقت اسی جستجو میں لگا رہتا، اکثر بزرگان دین سے بھی رجوع کرتا، ایک مرتبہ اس نے معروف ولی اللہ حضرت حاجی بہرامؒ سے اپنی خواہش کے متعلق عرض کیا تو انہوں نے فرمایا "اللہ

تعالیٰ کی طرف سے فتح قسطنطیہ کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن یہ تیرے ہاتھ سے نہ ہو گی اور نہ تو اس وقت زندہ ہو گا، یہ بچہ جو جھولے میں لیٹا ہے قسطنطنیہ کی فتح اس کے ہاتھ سے ہو گی۔"(۶۵)

سلطان محمد فاتح جب قسطنطنیہ کا محاصر کرتا ہے تو آپ واقعات کو ایک لڑی میں کس طرح پروتے ہیں۔ کہ اگر ایک موتی بھی ٹوٹے تو ہار خراب ہو جائے۔ آپ اس واقعہ کی تفصیل اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

"قلعہ کی مضبوط فصیلوں کو توڑنے کے لیے ایسی توپیں درکار تھیں جو زیادہ سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوں، عام توپوں سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ پیتل کی ایسی توپیں ہنگری کے ایک صناع سے بنوائیں جن کو کھینچنے کیلئے ساٹھ، ساٹھ بیلوں کے جوڑ لگتے تھے ان جیسی توپیں اس وقت اور کہیں نہ تھی یہ ایک میل دور تک آٹھ من وزنی گولے پھینک سکتی تھیں اہلیان شہر کو لڑائی کے دوران جو امداد یورپی ممالک سے ملتی تھی وہ بحیرہ اسود سے آبنائے باسفورس میں داخل ہو کر قسطنطنیہ پہنچتی تھی۔ اہلیان شہر کو اپنے حلیفوں سے کاٹنے کیلئے باسفورس پر مکمل کنٹرول چاہیے تھا"۔(۶۶)

اس سے اگلے واقعہ کا اب قاری فوری مطالعہ چاہتا ہے کہ آگے کیا ہو گا یہ ایک ڈرامائی سسپنس ہے۔ آگے پڑھتے ہیں۔

"سلطان بایزید ایلدرم نے اگرچہ ایشائی کنارے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا لیکن سلطان محمد فاتح نے اس کے مقابل یورپی کنارے پر بھی ایک قلعہ تعمیر کروایا، تاکہ باسفورس سے گزرنے والا جہاز عثمانیوں کی دو طرفہ توپوں کے نشانے سے بچ کر نہ جائے سلطان محمد فاتح کے ہمرکاب نوے ہزار فوج تھی، سمندر کی طرف سے محاصرہ کیلئے ایک سو چالیس کشتیاں الگ روانہ کیں، مگر وہاں اہل قسطنطنیہ کی امداد کیلئے جنیوا کے جہاز حائل ہو گئے"۔(۶۷)

اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو مشکل صورت حال تھی وہ گولڈن ہارن میں پہنچنے اور محاصرہ کرنے کی تھی۔ جس کے لیے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار دنیا کی تاریخ ایک منفرد فیصلہ سلطان محمد فاتح نے لیا جو اس سے قبل کبھی کسی کے تصور میں بھی نہ آیا۔ جو اس کی تاریخی فتح کی یادگار ٹھہرا۔ پیر صاحب اس واقعہ کو یوں رقم کرتے ہیں۔

"اس نے ایک ہی وقت میں دس میل لکڑی کے تختے ڈال کر روغن اور چربی سے ان کو چکنا کیا اور ایسی جہاز نما کشتیاں باسفورس سے ان تختوں پر چڑھا کر گولڈن ہارن تک لے آیا، حالانکہ یہ دس میل سخت ناہموار اور اور پہاڑی اتار چڑھاؤ تھے یہ کارنامہ پہلے کسی کے تصور میں بھی نہ آیا ہو گا، یہاں زیادہ گہرائی نہ ہونے کی وجہ سے بازنطینیوں کے بڑے جہاز آسانی سے نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ جبکہ عثمانی کشتیوں کیلئے کوئی رکاوٹ نہ تھی سلطان محمد فاتح نے گولڈن ہارن پر ایک پل بنوا کر اپنا توپ خانہ یہاں منتقل کر دیا اور قلعہ کے مشرق اور جنوب کی طرف سے محاصرہ مصبوط کر کے دونوں اطراف سے گولہ باری شروع کر دی، حتی کے سات ہفتوں کی گولہ باری نے نا قابل تسخیر فصیلوں کا حلیہ بگاڑ دیا اور ان میں تین بڑے شگاف پڑ گئے"۔ (۶۸)

جزئیات نگاری:

مشاہدہ اور جزئیات نگاری اگرچہ باہم ایک ہی نظر آتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ مشاہدے میں بے پناہ تخلیقیت چھپی ہوئی ہے۔ مگر بغیر مشاہدہ جزئیات نگاری کی جائے تو یہ تخلیقیت ادبیت سے محروم ہو رہے گی۔ اور صرف ایک میکانکی عمل بن کے رہ جائے گی۔ پیر محمد طاہر حسین کے شخصی اوصاف میں مشاہدہ جزئیات بیتی دونوں موجود ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بڑا کر کے دیکھنے کے عادی ہیں۔ تقوی ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے۔ اسی وصف کے زیر اثر ان کی تحریر میں مشاہدہ اور جزئیات نگاری جابجا دیکھی جاسکتی ہے۔

سلسلہ قطبیہ کے سفر نامہ نگاروں کی تحریروں میں جزئیات نگاری کے عمدہ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں سے چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

زیارت کی حاضری کو بیان کرتے ہوئے پیر محمد طاہر حسین قادری جزئیات سے کام لیتے ہیں ایک ایک چیز کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں کہ منظر آنکھوں میں ایسے گھومنے لگتا ہے سفر نامہ "ترکی میں ایک ہفتہ" سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اب ہم تیسرے کمرے میں داخل ہوئے دروازے کے ساتھ اندرونی جانب مسجد نبوی (عہد سلاطین عثمانیہ) کا ایک ماڈل رکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر ترک سلاطین کی حضور علیہ السلام سے والہانہ عشق و محبت کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ اسی کمرہ میں دائیں طرف دیوار کے ساتھ شیشے کے تین شوکیس رکھے گئے تھے درمیان والے بڑا تھا جبکہ ارد گرد والے اس سے چھوٹے تھے، درمیان والے شوکیس میں اوپر حضور علیہ السلام کی کمان رکھی اس کے نیچے کمان کا خول تھا اور اسکے نیچے حضور علیہ السلام کی دو تلواریں رکھی گئی تھیں۔"(۶۹)

پیر محمد طاہر حسین مسلمانوں کی تعمیرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو ہر در و دیوار اور کونہ مینار کو اپنے مشاہدے میں شامل کر لیتے ہیں۔ جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے منظر یوں واضح کر دیتے ہیں کہ جیسے ہر چیز قاری اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ مسجد قرطبہ کی زیارت کرتے ہیں۔ تو ہر ایک پہلو جائزہ لیتے ہیں۔ مسجد میں داخل ہونے کا احوال یوں لکھتے ہیں۔

"ہم صحن کا جائزہ لینے کے لیے ادھر ادھر چل پڑے۔ امیر عبدالرحمٰن داخل نے مسجد کے سامنے باقاعدہ باغ لگوایا تھا جس میں کھجور اور زیتون کے درخت تھے مگر آج کل زیتون کی جگہ نارنگی س (نگترے) ہیں اور کھجور کے چند ہی درخت رہ گئے ہیں جو اپنی قدامت اور طویل عمری کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ اسپین میں سنگترے کا باقائدہ درخت ہوتا ہے جسکا پھل ترشی مائل ہوتا ہے حالانکہ ہمارے ملک میں مالٹے کا درخت چھوٹا اور پھل میٹھا ہوتا ہے۔ صحنِ مسجد میں اب صرف ایک ہی فوارہ موجود ہے جو اپنے ناتواں وجود کا احساس بیدار رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ٹپ! ٹپ قطرہ قطرہ پانی کارواں سے بچھڑنے کسی تھکے ماندہ مسافر کے آنسوں کی مانند ٹپک رہا تھا اس جگہ کبھی وسیع تالاب ہوتے تھے۔"۔(۷۰)

اندلس میں مسلمانوں کے فنون لطیفہ کی کئی مثالیں موجود ہیں جو ان کے شاندار ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ غرناطہ میں موجود مسلمانوں کا ایک قلعہ الحمرا فن تعمیر میں اپنی مثال آپ ہے۔ الحمرا کی عمارت پر مسلمانوں کی فن کاری کو دیکھ کر آنکھیں حیران رہ جاتی ہیں پیر محمد طاہر حسین قادری نے الحمرا کے ایوان دیکھے اور پوری تفصیل سے ان کو سفر نامے

میں بیان کیا۔ پیر صاحب الحمرا کے محراب اور در و دیوار پر (کوئی غالب نہیں مگر اللہ ہے) اس شاہکار کو ابدی معنویت سے روشناس کرتا ہے۔ آپ الحمرا میں موجود ہر چیز کو جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

> دارالشورای یا دارالعلوم جسے انصاف کا محل بھی کہتے ہیں اس کو دوبارہ بنایا گیا۔ ستون پرانے ہیں دیواروں پر نقش و نگار پرانے نمونوں سے ملا کر بنائے گئے۔ ایک جگہ حمام تھے رومن انداز میں بھاپ کے غسل کا بھی انتظام تھا دار نوزراء کا ہال بھی بڑا شاندار تھا۔ جہاں بادشاہ بیرونی سفارتی وفود سے ملتا تھا۔ اس ک تزئین و آرائش میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی تھی۔ اس کی گنبد نما چھت میں لکڑی کا کام اس مہارت سے کیا گیا تھا کہ شاید ہی اس طرح کا کہیں اور ہو۔ ہال کی دیواروں پر کئی عربی اشعار بھی کندہ کئے گئے تھے"۔[۷۱]

پیر محمد طاہر حسین قادری اپنے سفر ناموں میں چیزوں کے اور جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سفر حجاز کے دوران پیش آنے والے واقعات اور مشاہدات کے علاوہ وہاں پر موجود اشیاء کے متعلق تمام معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے سفر ناموں کی یہ خوبی ہے کہ اگر سفر نامہ ساتھ ہو تو نئے مسافر کو کسی گائیڈ کی ضرورت محسوس نہیں ہو گی۔ مکہ مکرمہ کے قبرستان جنت المعلی کا نقشہ کچھ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> "جنت المعلیٰ کا صدر دورازہ جس کے اوپر سے روڈ گزارا گیا ہے اس سے داخل ہوں اور سیدھا فٹ پاتھ پر چلتے جائیں سایہ کے لیے بنی ہوئی لوہے کی چھتریوں سے آگے گزر کر جب قبرستان کے دوسرے کنارے پر پہنچیں گے تو سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں ان سیڑھیوں پر چڑھ کر اگلے حصہ میں داخل ہوں تو وہاں ایک بلند و بالا دیوار ہے جس میں سامنے ایک لوہے کا گیٹ لگا ہوا ہے جو ہمیشہ قفل رہتا ہے گیٹ کے بائیں جانب لوہے کی چھ بڑی بڑی جالیاں لگی ہوئی ہیں ان جالیوں سے دیکھا جائے تو گیٹ کے اندر بھی سڑک جاتی ہے جس کے دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے پتھر کے احاطے بنے ہوئے ہیں جن میں خاندان بنی ہاشم کے افراد اور کئ جلیل القدر اصحاب محو استراحت ہیں"۔[۷۲]

ایک اچھا سفر نامہ نگار وہ ہوتا ہے جو منظر کو پوری جزئیات سے بیان کرے اور یہ خصوصیت ہمیں پیر صاحب کے سفر نامے میں کئی مقامات پر ملتی ہے آپ کا مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ دوران سیاحت وہ اپنے ارد گرد کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کرتے ہیں چاہے وہ گاؤں کا منظر ہو یا کسی عمارت کا، گاڑی میں ہو یا پیدل سفر کر رہے ہوں وہ ہر منظر کی جزئیات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی محو سفر ہے۔ بارسلونا کے شاہی محل کو دیکھ کر اس کی ایسی لفظی تصویر کشی کرتے ہیں کہ قاری بھی اس منظر سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً اقتباس ہے

"یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے محل کی طرف جہاں سڑک مڑتی ہے وہاں بطور علامت دائیں بائیں دو ٹاور تعمیر کیے گئے ہیں محل کے سامنے ایک بہت بڑا فوارہ ہے ہمیں بتایا گیا یہ فوارہ سال میں صرف تین روز چلایا جاتا ہے اسکی خصوصیت یہ ہے کہ بڑے دلنشں ساز کی آواز کے مطابق چلتا ہے جیسے ساز کی آواز بڑھتی ہے تو فوارے کا پانی بھی ساتھ بڑھتا ہے آواز کم ہوتی ہے تو پانی کم ہو جاتا ہے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساز پر چلتا ہے پانی کے نیچے مختلف رنگوں کی لائٹیں روشن کی جاتی ہیں جو ایک خوبصورت اور نہایت دلفریب منظر پیش کرتی ہیں۔ ان دنوں یہاں میلے کا سماں ہوتا ہے"۔[۷۳]

پیر صاحب دوران سفر پیش آنے والے حالات اور باتوں کا ذکر بھی سفر نامے میں کرتے ہیں۔ میڈرڈ کے قیام کے دوران وہاں موجود پاکستانیوں کی گفتگو سن کر اپنے سفر نامہ میں اسے بطور عبرت پیش کرے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مسلمان کس قدر کھوکھلا ہو چکا ہے۔ کہ اس نے اپنے لیے گناہوں کی بھی تفہیم اور تخصیص کر رکھی ہے۔

ان صاحبان کے نزدیک کچھ گناہ کرنے سے ہی مسلمان کو نقصان ہوتا ہے باقی سے مسلمانوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پیر صاحب اس واقعہ کی جزئیات سے دور حاضر کے مسلمان کی نہ صرف تصویر پیش کرتے ہیں بلکہ درست سمت کا تعین بھی کر دیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے۔

"ایک صاحب باتوں ہی باتوں میں کہنے لگے۔ میرا تجربہ ہے مسلمان اور سب گناہوں کا مرتکب ہو سکتا ہے لیکن خنزیر کا گوشت نہیں کھاتا۔ میں نے کئ شرابی کبابی لوگوں سے اس بارے میں

پوچھا لیکن سب نے یہی کہا "ہم شراب کے نشہ میں دھت بھی ہوں پھر بھی خنزیر کا گوشت منہ کو نہیں لگاتے "مجھے بڑا تعجب ہوا کہ افسوس ہمارے لوگوں نے اپنا دین صرف خنزیر نہ کھانا سمجھ لیا ہے۔ اور کوئی غلط کام گناہ میں توبہ استغفار پڑھتا رہا کہ ہماری سوچ کس قدر بدل گئی ہے۔ یعنی اندر کے اندر رہے ہاتھ سے ایمان نہ گیا"۔(۷۴)

ملک ربنواز اپنے سفر نامے میں جزئیات نگاری سے کام لیتے ہیں ان کا انداز بیان سادہ اور دلچسپ ہے ایسی خوبصورتی سے منظر بیان کرتے ہیں کہ منظر آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے دوران سیاحت وہ پیش آنے والے معمولی معمولی مشاہدات کا ذکر بھی بڑے عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں سفر حجاز میں جہاز کے روانہ ہونے کا منظر اور حال یوں تحریر کرتے ہیں۔

"جہاز کی روانگی میں ابھی چند گھڑیاں تاخیر تھی۔ ابھی دروازے بھی کھلے ہوئے تھے اور چاروں انجن بھی پوری رفتار سے نہیں چل رہے تھے۔ پھر مسافر حضرات بھی کافی تعداد میں آچکے تھے۔ اسی لیے جہاز کا ائیر کنڈیشنڈ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا اندر گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ والا دیسی پنکھا نکالا جو کہ ساتھ ہی لے گیا تھا۔"(۷۵)

ملک صاحب دوران سفر پیش آنے والے معمولی معمولی واقعات کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنالیتے ہیں اور ان کی جزئیات بیان کرتے ہیں خواہ وہ کوئی عام چیز ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ قاری بوریت یا بوجھل پن کا شکار ہو۔ دوران سفر اپنے پرس کا ذکر ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں۔

"اس تمام سفر وحضر میں ایک عدد پرس ہمہ وقت میرے پاس ہوتا تھا۔ جب بھی گھر سے باہر آتا تو اپنے ہاتھ میں لٹکا لیتا تھا جس کے اندر دو عدد پاسپورٹ، دو عدد ریٹرن ٹکٹ، شناختی کارڈ، انیس ہزار کی کرنسی اور دیگر ضروری کاغذات تھے۔"(۷۶)

حوالہ جات

۱. نورالحسن'مولوی'نورالغات، نیشنل کپ فاونڈیشن، اسلام آباد ۱۹۸۵، ص ۱۳۱

۲. احمد دہلوی'سید فرہنگ آصفیہ 'سنگ میل پبلی کیشنز لاہور'۲۰۰۲ء'ص ۱۵۹

۳. قدسیہ قریشی ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷، ص ۴۹

۴. انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب میں سفر نامہ "مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص: ۵۲

۵. حفیظ صدیقی، ابو الاعجاز، کشاف، اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۲

۶. محمد عمر رضا، ڈاکٹر، "اردو میں سوانحی ادب- فن اور روایت"، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص: ۹۹

۷. رابعہ سرفراز، ڈاکٹر اردو سفر نامہ میں ہندوستان کے تہذیبی اور ثقافتی عناصر ایک مطالعہ، مشمولہ: زبان و ادب ششماہی تحقیقی و تنقیدی مجلہ، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۵۹

۸. انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب میں سفر نامہ "ص: ۵۹

۹. محمد شہاب الدین، ڈاکٹر "اردو ادب میں حج کے سفر نامے "ص: ۲۷

۱۰. قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص: ۵۴

۱۱. انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب میں سفر نامہ "ص: ۸۰

۱۲. ایضاً، ص: ۸۲

۱۳. ایضاً، ص: ۸۷-۸۶

۱۴. یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، ص: ۱۰۳

۱۵. جیلانی کامران، حج کے سفر ناموں کی روایت، ماہ نو، نومبر ۱۹۷۸ء، ص: ۵۱

۱۶. محمد مقصود ایوب، عمرہ و زیارات عراق و شام، الوفاق ٹورز، لاہور، الوفاق ٹورز، س۔ل، ص: ۳

۱۷. محمد طاہر حسین قادری، متاعِ دید، قادریہ آرگنائزیشن، منگانی شریف جھنگ، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۶

۱۸. ایضاً، ص: ۱۴

۱۹. ایضاً، ص: ۱۵

۲۰. ایضاً، ص: ۱۷

۲۱. ایضاً، ص: ۱۹

۲۲. ایضاً، ص: ۲۰، ۲۱

۲۳. ایضاً، ص: ۱۱

۲۴. محمد تقی عثمانی، جہاں دیدہ، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص:۸،۹

۲۵. محمد طاہر حسین قادری، متاعِ دید، ص:۲۷

۲۶. ایضاً، ص:۲۸

۲۷. محمد رضا خاں بریلوی، حدائقِ بخشش، شبیر برادرز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۸۷

۲۸. وقار مسعود خان، ہوا کے دوش پر، پیپلز کالونی خانیوال، ۲۰۰۷ء، ص:۱۲

۲۹. محمد طاہر حسین قادری، متاعِ دید، ص:۳۸

۳۰. ملک ربنواز، سفر حجاز، محمد اشرف صابر پریس مارکیٹ، جھنگ، ۱۹۹۴ء، ص:۸۵

۳۱. وقار مسعود خان، ہوا کے دوش پر، ص:۲۴

۳۲. ملک ربنواز، سفر حجاز، ص:۹۴۔۹۳

۳۳. ایضاً، ص:۹۷

۳۴. ایضاً، ص:۱۰۷

۳۵. ایضاً، ص:۱۰۸

۳۶. ایضاً

۳۷. محمد طاہر حسین، پیر، اسپین کا مطالعاتی سفر، مشمولہ، آئینہ کرم، شمارہ ۳۳، قادریہ آرگنائزیشن، جھنگ، جون ۲۰۱۳ء، ص:۲۹

۳۸. ایضاً، ص:۳۴

۳۹. ایضاً، ص:۳۵

۴۰. ایضاً، ص:۳۰

۴۱. ایضاً، ص: ۳۲

فلپ ہٹی، عربوں کی تاریخ، بحوالہ: اسپین کا مطالعاتی سفر، پیر محمد طاہر حسین، مشمولہ: آئینہ کرم، شمارہ ۳۳، ص:۳۲

۴۲. انشاء اللہ خاں، تاریخ خاندان عثمانیہ، س،ن، ص:۳۳

۴۳. صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب ما قیل، فی قتال الروم، حدیث، رقم ۲۷۶۶

۴۴. محمد طاہر حسین قادری، ترکی میں ایک ہفتہ، مشمولہ آئینہ کرم، شمارہ ۳۳، ص:۲۳

۴۵. محمد تقی عثمانی، جہاں دیدہ، ص:۳۱۹

۴۶. اسپین کا مطالعاتی سفر، ص:۲۴

۴۷. محمد طاہر حسین قادری، ترکی میں ایک ہفتہ، مشمولہ آئینہ کرم، شمارہ۳۹، ص:۲۵

۴۸. متاعِ دید، ص:۸۴

۴۹. متاعِ دید، ص:۴۹

۵۰. ترکی میں ایک ہفتہ، ص:۳۳

۵۱. ایضاً، ص:۲۲،۲۳

۵۲. ایضاً، ص:

۵۳. اسپین کا مطالعاتی سفر، ص:۵۸

۵۴. ترکی میں ایک ہفتہ، ص:۳۳

۵۵. ایضاً، ص:۲۸

۵۶. ایضاً، ص:۳۴

۵۷. متاعِ دید، ص:۶۶،۶۷

۵۸. ایضاً، ص:۷۵

۵۹. سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص:۲۵۷

۶۰. اسپین کا مطالعاتی سفر، ص:۳۵

۶۱. متاعِ دید، ص:۶۵

۶۲. ایضاً، ص:۲۴

۶۳. ایضاً، ص:۲۳

۶۴. آئینہ کرم، ص:۴۰

۶۵. ترکی میں ایک ہفتہ، ص:۲۳

۶۶. ایضاً، ص:۲۴

۶۷. ترکی میں ایک ہفتہ، ص:۲۴

۶۸. ایضاً، ص:۲۴

۶۹. ایضاً، ص:۳۵

۷۰. اسپین کا مطالعاتی دورہ، شمارہ نمبر ۳۴، ص:۵۹

۷۱. اسپین کا مطالعاتی سفر، شمارہ نمبر ۳۵، ص:۵۲

۷۲. متاعِ دید، ص:۸۷-۸۶

۷۳. اسپین کا مطالعاتی سفر، شمارہ نمبر ۳۵، ص:۵۸

۷۴. اسپین کا مطالعاتی سفر، شمارہ ۳۳، ص:۴۰

۷۵. سفر حجاز

۷۶. سفر حجاز، ص:۱۱۱

باب پنجم

مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

انسانی زندگی مختلف مدارج اور مداروں پہ چلتی ہے۔ کہیں اتار، چڑھاؤ اور کہیں پہ نیکی بدی کے بڑے بڑے سمندر اس کی راہوں کو مسدود کر رہے ہوتے ہیں۔ انھیں راہوں میں کہیں رہبر اور کہیں رہزن ہماری تقدیروں کے فیصلے کرتے نظر آتے ہیں۔ جو کہیں ہمیں دنیا تو کہیں آخرت کی منازل کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ دنیاداروں میں کئی پیشے، شعبے اور معیارات کے لوگ شاملِ حال ہو جاتے ہیں اور اپنی اپنی ہمت اور مقدور کے مطابق دوسروں سے اچھا یا برا برتاؤ کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب ہم آخرت کے راہیوں سے ملتے ہیں تو ہماری مراد خود بخود نیکی، اجر اور ثواب سے جڑ جاتی ہے اور انھیں نیکی کی راستوں میں بہترین راستہ ایک تصوف کا راستہ بھی ہے۔ جس پہ چلنے والے راہِ سلوک کے مسافر اور سالک کہلاتے ہیں۔

یہ تصوف پر مبنی شخصیات اور خصوصیات کے حامل افراد جو خود کو صوفی اور درویش بھی کہلاتے ہیں، اپنی وضع اور طرز میں دوسری دنیا سے بالکل مختلف ہوتے ہیں ان کا معیارِ زندگی کم تر ہوتے ہوئے بھی سادی کا ایسا حسین مرقع ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی بادشاہت بھی ان کے سامنے ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ مزاج اس قدر نرم ہوتا ہے کہ سخت سے سخت رویے کو رام کرنے کے لیے کارگر ثابت ہوتا ہے۔ ایسی راہوں کے مسافر سادہ و رنگین داستان لے کر اپنی اپنی منزل اور مقام کی طرف رواں دواں رہتے ہیں۔ جن کے سارے سالک اور مسلوک، خادم اور مخدوم مل کر اپنے کی بڑے کی تعلیمات کی طرف مراجعت کرتے رہتے ہیں۔ جس کی تعلیمات نے ہی انہیں فنافی الشیخ کرنے کے ساتھ ساتھ فنافی الرسول اور پھر فنافی اللہ کا درسِ عظیم عطا کیا ہوتا ہے۔

ان عظیم طبع کے لوگوں کا رویہ، مزاج، سلوک اور تعلیمات بالکل دوسرے لوگوں سے مختلف اور نایاب ہوتے ہیں اس لیے ان کی زندگی کا اک ایک لمحہ ایک زندہ داستان کی طرح قائم ودائم رکھا جاتا ہے تاکہ آنے والی انسانیت ان کی تعلیمات سے نہ صرف روشناس ہو سکے بلکہ اپنی تربیت ورہنمائی کا سامان بھی کر سکے۔ لوگ ان سے ملتے ہیں تو انی ملاقاتوں کا احوال قلم بند کرتے ہیں۔ ان سے رابطہ کرتے ہیں تو اپنے خط کتابت محفوظ کر لیتے ہیں۔ ان کی محفل میں بیٹھتے ہیں تو ملفوظات کی شکل میں مجلسی روداد محفوظ کر لیتے ہیں۔ ان کی ہمراہی میں نکلتے ہیں تو اسفار کی اایک ایک بات لکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سارا علمی، متصوفانہ اور مذہبی سرمایہ پھر ادب کی دنیا میں بھی اپنا مقام بنالیتا ہے اور ادبی محققین اپنی کسوٹی پہ پرکھ کر ان تخلیقات کا ادبی مقام ومرتبہ متعین کرتے ہیں۔ اسی طرح اردو زبان وادب میں بھی اس تحقیقی و تنقیدی کام کی ایک مکمل، مضبوط اور صحیح روایت موجود ہے جو اپنی درایت میں نہ صرف مستند ہے بلکہ ہمیشہ سے لوگوں کی عملی زندگی کا حصہ بھی رہی ہے جس وجہ سے سینہ در سینہ چلنے واالی یہ تعلیم اا پنا مقصد ہمیشہ سے پورا کرتی آئی ہے اور یہ مقالہ بھی اسی سلسلے اور روایت کی ایک اہم کڑی ہے جس میں سلسلۂ قطبیہ کے بزرگ، صوفی، درویش، متوسلین اور علمائے کرام کی تصنیفات جائزہ لیتے ہوئے ایک مبسوط تحقیقی کام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن میں خصوصی طور پر سوانح، مکتوبات اور اسفار پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

حضرت سید قطب علی شاہؒ(۱۹۲۷ء/۱۸۴۹ء) جو اپنے سلسلۂ قطبیہ کے بانی وموجد بھی ہیں، ان کے اپنے عہد سے لے کر عہد حاضر تک سلسلہ قطبیہ کی اردو نثری خدمات کے جائزے سے پتا چلتا ہے کہ اردو ادب کی بیشتر اضاف میں سلسلۂ قطبیہ کے مصنفین کی تخلیقات موجود ہیں۔ تاہم سوانح نگاری میں ان کی خدمات سب سے نمایاں ہیں۔ ان میں ضخیم کتب بھی ہیں اور رسائل اور کتابچے بھی، یہ تصانیف اپنی اہمیت کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ البتہ ان میں سے بعض تصانیف کو مورخین وناقدین کی توجہ حاصل نہ ہوئی جس کی مستحقِ وہ تھیں اور بعض کے نام تو گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔ اس موضوع کی تحقیقی سطح پر اہمیت اس لیے بھی دوچند ہو جاتی ہے کہ گوشۂ گمنامی سے ایسے ادیبوں کو ڈھونڈ کر ان کے علمی سرمائے کو ادبی منظر نامے پہ لانا ہی تحقیق کے اصل مقصد کی تصدیق کرتا ہے۔

اردو سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز حالی اور شبلی سے ہوتا ہے۔ حالی نے سوانح نگاری کی عمارت کو نئی وسعت اور جدید اصولوں پر استوار کیا۔ شبلی نے سوانح کو جدید اسلوب اور فنکارانہ اپج سے سرفراز کیا۔۔ اسی دور میں سلسلہ قطبیہ کے سید اصغر علی شاہ نے 'گوہر قادری' لکھ کر اس سلسلہ میں سوانح نگاری کی روایت ڈالی۔ دور افتادہ گاؤں میں ہونے کی وجہ سے ان کا یہ سوانحی کام منظر عام پر نہ آسکا۔ حالاں کہ اردو کی سوانحی ادبی نشوونما میں ایسے ابتدائی کاموں کی اہمیت و وقعت مسلم ہے۔ ان کا طرز تحریر سادہ ہے مگر انھوں نے مرکزی کردار کے باطنی اور نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے جدید سوانح نگاری کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

سوانح نگاری کے پر خار راستے پر سفر کرتے ہوئے سلسلۂ قطبیہ کے سوانح نگاروں نے اردو سوانح ادب کو کئی سنگ میل عطا کیے ہیں۔ سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگار سید عبد القادر کا نام اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں پہلی جامع سوانح عمری تحریر کی ہے۔ انہوں نے باقاعدہ سوانح کے فنی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوانح عمری تحریر کی ہے۔ انھوں نے سادہ پیرائے میں صاحب سوانح کے باطنی اوصاف کو واضح کیا۔ انھوں نے ان کی زندگی کے حقیقی واقعات جس سے ہیرو کوئی خلائی مخلوق نہیں بلکہ جیتا جاگتا انسان معلوم ہوتا ہے جو کہ قابل تقلید اور قابل تردید ہو سکتا ہے۔ یہی بات ان کو ایک کامیاب سوانح نگار کے طور پر اجاگر کرتی ہے۔

سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگار ملک رب نواز قادری نے سوانح عمری ''تجلیات کرم'' اور ایک سفر نامہ ''سفر حجاز'' رقم کیا اور سوانح نگاری کے سرمایہ میں اضافہ کیا۔ ان کی سوانح نگاری زندگی کی حقیقی اور سچی تصویر پیش کرتی ہے۔ وہ صاحب سوانح کو ایک متحرک کردار نبھاتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ ان کی سادہ بیانی اور حقیقت پسندی کے عناصر کی بنا پر ان کی سوانح نگاری قطبی مصنفین میں الگ مقام رکھتی ہے۔ تجلیات کرم میں متصوفانہ نکات، اخلاقی تربیت اور تقلیدی پہلو موجود ہیں لیکن سماجی حوالے سے اس کا مطالعہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ صاحب سوانح حضرت پیر محمد کرم حسین قادری کے مذہبی و روحانی کردار سے زیادہ ان کے اخلاقی، معاشرتی تعلقات، حسن اخلاق اور انسان دوستی جیسے اوصاف کو زیادہ واضح کیا ہے۔ سوانح ادب اور اردو نثر میں اس کی حیثیت ایک قیمتی اثاثے کی ہے۔

ایک بہتر سماج اور معاشرے کے قیام، استحکام اور ارتقا کے لیے، انسان دوستی، احترام انسانیت، خدمت خلق، تواضع اور حسن اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی سماجی اور اخلاقی صفات سے مزین سوانح تحریر کر کے قطبی سوانح نگاروں نے نہ صرف اردو ادب کی خدمت کی ہے بلکہ ایک عمدہ معاشرے کے احیاء کے لیے راہیں روشن کی ہیں۔ اس اعتبار سے سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگاروں نے سر سید اور ان کے رفقاء کی روایت کو نبھاتے ہوئے معاشرتی فلاح کے لیے مقصدیت کو مقدم رکھا ہے۔ سوانح نگاری ایک قطبی ستارے کی مانند ہے۔ معاشروں اور تہذیبوں کو اوج، کمال اور نمایاں مقام پر متمکن کرنے والے جن اوصاف و کمالات کا ذکر ہمیں سیرت نبوی ﷺ اور دیگر مہذب معاشروں کی تاریخ میں ملتا ہے۔ ان صفات میں مساوات، رواداری، خدمت خلق، عجز و انکسار، عدل وانصاف، دیانت اور امانت، صداقت اور ملنساری وغیرہ شامل ہیں ایسے جملہ خصائص ہمیں قطبی سوانح نگاروں کی تصنیفات میں ملتے ہین۔ ان کی منتخب کردہ شخصیات معاشرے کے عمدہ کرداروں کی حقیقی تصاویر پیش کرتی ہیں۔ کتاب حافظ الکرم میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن میں انسانی مساوات اور معاشرتی ہم آہنگی کی مثالیں پیش کی گئی ہیں جو ایک مثبت اور جمہوری سماج کے قیام کے لیے ضروری ہیں۔ سوانح ''تجلیات کرم'' کے سوانح نگار نے معاشرے میں پائی جانے والی متنوع سماجی بیماریوں مثال کے طور پر نفاق، حسد، کینہ، بغض اور ان کا علاج صاحب سوانح کی حیات کے عملی واقعات سے کشید کیا ہے۔ انھوں نے محبت و یگانگت اور حسن سلوک کو ہیرو کے کردار سے نبھایا ہے جس سے ایک مستحکم اور انسان دوست سماج کی نمو کے لیے عملی راہ سجھائی دیتی ہے۔ امانت داری اور صداقت جو دعوت اسلام کی بنیاد ہیں۔ ایسے اوصاف جو سماجی اور معاشرتی ترقی اور رواداری کی اساس ہیں وہ صوفیا کی زندگیوں میں بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ قطبی سوانح نگاروں کی سوانح عمریوں میں جا بجا یہ خصائص کرداروں کی صورت میں جلوہ گر ہیں اور یہ کردار محض تخیلاتی اور داستانوی نہیں ہیں بلکہ ان کو اس دور کے عام انسانوں نے اپنے درمیان عملی طور پر ایک عام بشر کی طرح ان میں چلتے پھرتے بھی دیکھا ہے۔ سلسلہ قطبیہ کی سوانح عمریاں جہاں علمی و ادبی حوالے سے اردو زبان و ادب کے لیے ایک نمایاں اضافہ ہیں وہاں ان کے سماجی اور معاشرتی اثرات ایک صحت مند اور خوش حال معاشرے کے احیاء اور استحکام کے لیے بھی معاون و مددگار ہیں۔

سلسلہ قطبیہ کو علم و ادب کی دنیا میں جن محققین و مصنفین کی بدولت نمایاں مقام حاصل ہوا۔ ان میں ایک قابل فخر نام پیر محمد طاہر حسین قادری کا ہے۔ پیر صاحب بین الاقوامی سطح کے محقق، تاریخ دان، سفر نامہ نگار، مکتوب نگار،

شاعر اور تصوف شناس ہیں۔ سلسلہ قادریہ اور بالخصوص قطبیہ قادریہ کے علمی آثار کی بازیافت میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے۔ تاریخ، تذکرہ اور سوانح نگاری میں پیر صاحب کے تحقیقی و تنقیدی معرکوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

آپ کا متنوع، مفید اور اہم تحقیقی کام متعدد کتابوں کے پیش لفظ، مقدمات اور حواشی و تعلیقات کی صورت میں بھی سامنے آیا ہے۔ اگر ان کے مقدمات، تبصروں اور تاثرات کو کتابی صورت میں جمع کیا جائے تو اردو زبان کا ایک گراں قدر تحقیقی و تنقیدی سرمایہ یک جا صورت میں سامنے آسکتا ہے۔

سوانح نگاری میں ''لمحات کرم، غوث الثقلین، لمعات قطب، تذکرہ شاہ سردار، مآثر سلطانی اور تذکار شیریزدانی یادگار ہیں۔

سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگاروں میں پیر محمد طاہر حسین قادری کا نام معتبر حیثیت کا حامل ہے۔ انھوں نے بلاشبہ دور حاضر میں سوانح نگاری میں اہم اور نمایاں خدمات انجام دے کر حالی اور شبلی کے دور کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ان کا تاریخی اور مذہبی شعور ان کو ماضی میں جھانکنے اور وہاں سے درنایاب تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ آپ کے ہیروز کا تعلق اسلامی تصوف سے ہے اس طور وہ شبلی کے ہم رکاب نظر آتے ہیں لیکن زبان کے صحیح استعمال اور سیدھے سادھے اسلوب کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ حالی کی قبیل میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پیر صاحب کی سوانحی خدمات اس اخلاقی پستی کے دور میں ایک عملی نمونہ پیش کرتی ہیں جس سے ایک طرف تو اردو سوانح کا سرمایہ گراں مایہ ہوا اور دوسری طرف سماجی بہتری اور اخلاقی تربیت کے راستے متعین ہوئے ہیں۔ سلسلہ قطبیہ کی سوانحی نگاری میں آپ کو وہی مقام حاصل ہے اردو سوانح نگاری میں جس کے شبلی حامل ہیں۔

قطبی سوانح نگاروں میں خواجہ قمر الدین قادری مصنف سوانح حیات ''سراج منیر'' ایک اہم سوانح نگار ہیں۔ وہ خود بھی سادہ، مخلص اور صوفی صفت آدمی تھے۔ ان کی لکھی سوانح بھی سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ انہوں نے شریعت و طریقت کے مضامین کو بڑے سہیل اور ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی سوانح نگاری سلسلہ قطبیہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ میاں فیاض النصیر نے ''فیوض یار'' سوانح عمری تالیف کی ہے۔ یہ قطبی سوانح عمریوں میں ایسی سوانح حیات ہے جس

میں سوانح سے زیادہ مسائل تصوف اور ملفوظات و کرامات کا اظہار کیا گیا ہے۔ سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگاروں میں لالہ محمد رفیق طاہر کا نام اہم ہے انہوں نے ایک مختصر اور جامع سوانح "کمال کرم" تحریر کی جس میں مشاہد شاہداتی اور تجزیاتی اسلوب اپنایا گیا ہے۔ یہ اپنی وقعت اور اہمیت کے اعتبار سے سلسلہ قطبیہ کی سوانحی روایت میں گراں قدر اضافہ ہے۔

سلسلہ قطبیہ کی سوانح عمریوں میں تصوف کے بنیادی مباحث شریعت کے تابع ہیں۔ یہاں شریعت کو طریقت پر فوقیت حاصل ہے "لمعات قطب" کے مصنف نے صاحب سوانح کے کردار سے تصوف کے جن پہلوؤں کو پیش کیا ہے ان میں توکل یعنی خدا پر راضی ہو جانا یعنی اپنی مرضی چھوڑ کر خدا کی مرضی تسلیم کر لینا۔ قطبی سوانح عمریوں میں توکل کاہلی اور سستی کا نام نہیں بلکہ یہاں تحرک کے بعد توکل ہے۔ یعنی عمل مقدم ہے اور عمل تابع شریعت کے ہوں۔ فقرو غنا صوفیانہ صفات میں سے ایسی خوبی ہے جس پر سرور عالم ﷺ نے بھی فخر کیا۔ سلسلہ قطبیہ میں فقر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تمام سلسلوں میں یہ صوفیانہ روش موجود ہے۔ "لمحات کرم" کے صاحب سوانح سائیں پیر محمد کرم حسین قادری اکثر فرمایا کرتے "اتوں طبع غریب ہے عاشقاں دی وچوں ریس نہ کرن نواب بیلی" یعنی دل کا غنی ہونا۔ ان صاحب حال ہستیوں میں بدرجہ اتم موجود تھا۔

صوفیا کے صبر کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ سلسلہ قطبیہ کی سوانح نگاری میں نہ صرف فکری مباحث موجود ہیں بلکہ عملی نمونے کرداروں کی صورت میں متحرک نظر آتے ہیں۔ قطبی سوانح عمریوں میں صبر کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ تین درجات میں ہے۔

پہلے درجے کا صبر ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خواہشات نفسانی سے رکنا، صبر کا دوسرا درجہ ہے اس راہ میں پیش آنے والی بلا اور مصیبت سے دل تنگ نہ ہونا۔ تیسرے اور اعلیٰ درجے کا صبر یہ ہے کہ محبوب کے قرب کی راہ میں آنے والی مصیبت اور بلا سے لذت پانا۔ قطبی سوانح نگاروں کے ہاں پائے جانے والے دیگر صوفیانہ رموز مصرفت، ضبط نفس اور فنا ہیں۔ سلسلہ قطبیہ کے سوانح نگاروں کے ہاں تصوف کے وہی فکری سانچے ہیں جو سلسلہ قادریہ کی بنیاد ہیں۔

سلسلہ قطبیہ کی سوانح نگاری محض ہیرو کی فرضی داستان نہیں۔ یہ سوانح عمریاں معاشرے کے قابل تقلید افراد کی ہیں جو اسوہ رسولؐ کے پیرو ہیں۔ سوانح عمریاں فقط تصوف کی اصطلاحوں اور کرامات کا مجموعہ نہیں بلکہ بہتر زندگی

گزارنے کے زیادہ تر تربیتی پہلوؤں کا احاطہ بھی کرتی ہیں۔ کتاب ''لمحات کرم'' میں مصنف نے صاحب سوانح کے کئی ایسے واقعات پیش کیے ہیں جن کے مطالعہ سے قاری کے قلب میں راہ ہدایت کے پانے کی طلب پیدا ہو جاتی ہے۔ کئی جرائم پیشہ افراد کے تائب ہو کر مقرب خدا ہونے کے واقعات سے متاثر ہو کر بندہ راہ خدا میں قدم بڑھالیتا ہے۔ قطبی سوانح نگاروں نے سوانح نگاری کے ذریعے افراد اور معاشرے کی اخلاقی، روحانی اور سماجی تربیت کا بھرپور اہتمام کیا ہے۔ اس حوالے سے سلسلہ قطبیہ کی سوانح نگاری، مقصدیت، تربیت اور ادبیت کے اعتبار سے اہم سوانحی سرمایہ ہے جو دور حاضر میں سوانح نگاری کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

اسلوب نگارش کے لحاظ سے قطبی سوانح نگاروں کے ان نمایاں اوصاف میں سادگی، روانی، سلاست، اختصار، ٹھراو اور لطافت ہیں۔ کچھ سوانح نگاروں نے تلمیحات، تمثیل نگاری اور شعری تضمین سے اپنے اسلوب کو پرکشش بنایا ہے۔ جملوں اور واقعات میں طوالت سے گریز کیا گیا ہے، واقعہ نگاری اور حقیقت نگاری قطبی سوانح نگاروں میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ بعض مصنفین کے ہاں مرکبات اور ہم آواز الفاظ کے آہنگ سے عبارت اور اسلوب کی دلکشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

خط آدھی ملاقات اور نجی معاملہ ہے اور یہ سلسلہ قطبیہ میں قلمی سے زیادہ قلبی معاملہ ہے۔ یہاں خط خبر رسانی اور پیغام رسانی سے کہیں آگے جاکر فکر وسا پر اپنے اثرات مرتسم کرتا ہے۔ انسان فکر کے معاملے میں انتہائی حد تک آزاد ہے بلکہ بے مہار آزادی کی مثال ہے لیکن اس فکر کو خالق حقیقی کے تابع کرنے کی سعی نام تصوف ہے۔ تصوف ایک خفی وظیفہ ہے اس طرح خط بھی نجی اور دو افراد کے درمیان ذاتی ملاقات کی منظر کشی کرتا ہے۔ سلسلہ قطبیہ کے مکتوب نگاران نے اس خفی وظیفے کو خط کے امتزاج سے اثر آفرین بنانے میں کمال حاصل کیا ہے۔ مکتوب نگاری کے اس کمال کے ضمن میں اردو ادب نے بلاشبہ ایک قدم آگے کی مسافت طے کی ہے۔ ان کے مکتوبی ملفوظات مکتوب الیہ کی زندگی کی کامل تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سلسلہ قطبیہ کے خطوط کے موضوعات میں تصوف، عشق حقیقی، معرفت، سلوک، فرمانبرداری کی ملقین، سر تسلیم خم کرنے کی تعلیم، رضائے الہیٰ سے رضائے مصطفوی تک کا سفر، اپنے مرشد کامل سے والہانہ لگاو، سلسلے کے احباب سے

دلی وابستگی، طریقت اردو شریعت کی گتھیاں سلجھانے کی رمزیات، غیر اللہ کا ترک، اللہ والوں سے محبت کی استواری، قول و فعل میں مطابقت، اپنی ہستی کی پستی کو بلندی کی طرف گامزن کرنے کے رموز چامل ہیں۔ خطوط کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان میں حسن معاشرت اور تمدنی رکھ رکھاو بھی علامتی پیرائے میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ سلسلہ قطبیہ کے خطوط اگرچہ علم و آگہی اور بصیرت میں اضافہ کرتے ہیں لیکن ہمہ ایں یہ ہے کہ بعض اوقات طوالت اور ثقافت قاری کو گراں بھی گزرتی ہے۔ یہ اس دور کے اردو مکتوب نگاروں سے میل بھی کھاتی ہے۔ فی زمانہ طویل القابات کا رواج نہ ہے اس لیے قاری یہاں رکتا ضرور ہے لیکن اس زمانے سے مطابقت اسے آگے بڑھاتی ہے۔

سلسلہ قطبیہ کے پہلے مکتوب نگار اس سلسلہ کے بانی حضرت سید قطب علی شاہ بخاری قادری (۱۸۴۹۔۔۔۔۔۔ ۱۹۲۷) ہیں۔ ان سے لوگوں نے اپنے دینی مسائل کے ساتھ ساتھ ذاتی مسائل میں بھی رہنمائی کی استدعا کی ہے۔ ان کا اس نوعیت کا خط ان کی سوانح لمعات کرم (اشاعت ۲۰۱۶) معلفہ ،۔مصنفہ۔۔۔۔۔۔ پیر طاہر حسین طاہر میں بھی موجود ہے۔ یہ خط نواب آف بہاول پور سعادت علی خاں کے نام ہے جس میں وہ ان کے کئی مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ حضرت سید شیر محمد گیلانی (۱۸۶۲----- ۱۹۳۲) خلیفہ مجاز حضرت سید قطب علی شاہ، حضرت پیر فضل حسین شاہ بخآری، پیر سید غلام رسول شاہ (۱۸۸۷-------- ۱۹۶۶)، سید سردار علی شاہ قادری(۱۸۸۶--- ۱۹۶۷)، حضرت مولانا غلام محمد جلوآنوی (۱۸۹۳-------- ۱۹۵۶)، حضرت میاں اللہ یار کملانہ ۱۹۱۳ -------- ۱۹۴۱)، حضرت خواجہ حفظ گل محمد قادری(۱۹۱۴---- ۱۹۵۴)، حضرت خواجہ پیر کرم شاہ قبلہ عالم منگانوی(۱۹۴۰---- ۱۹۹۱)، حضرت پیر مظہر حسین منگانوی، حضرت پیر محمد اختر حسین منگانوی، حضرت پیر محمد طاہر حسین طاہر منگانوی نے مکتوب نگاری کی وساطت سے تصوف اور معاشرت کی گتھیاں سلجھانے میں متوسلین کی رہنمائی کی۔ حضرت مولانا پیر غلام محمد جلوآنوی (۱۸۹۳---- ۱۹۵۶)۔ پہلے مکتوب نگار ہیں جن کے خطوط زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ ”سیقون من رحیق المختوم“ اور ”پیام جلوی“ میں جہاں سلوک اور معرفت کے نکات ہیں وہ زندگی جینے کے گر ملتے ہیں۔ اسلوب کے بیان کے اعتبار سے ان خطوط کو کسی بھی معاصر مکتوب نگار کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ ان خطوط میں شیخ محی الدین عربی کی تاویلات کا رنگ جھلکتا ہے۔ مولانا پیر غلام محمد جلوآنوی کا فکری مرکز اگرچہ فلسفہ نہ تھا لیکن پھر بھی چیدہ چیدہ فلسفیانہ افکار آپ کے ہاں اپنی چھب دکھاتے ہیں۔

حضرت سید شیر محمد گیلانی (پ ۱۸۶۲) کے خطوط کا مجموعہ ''مآثر شیر یزدانی'' (مرتبہ پیر طاہر حسین طاہر) کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ ان کے خطوط میں مرشد سے عشق دیوانگی کی حد تک نظر آتا ہے۔ آپ پنجابی زبان کے صاحب کتاب شاعر تھے۔ خطوط میں بھی شعری شعور فکر کی گہرائیوں میں اترتا معلوم ہوتا ہے۔

حضرت میاں اللہ یار کملانہ (۱۸۹۴---- ۱۹۴۱) کے خطوط الہامات الہیہ کے نام سے شائع ہوئے۔ آپ نے ایک با اثر زمین دار گھرانے میں آنکھ کھولی اور پھر اللہ نے دل کی دنیا بدل دی اور سلوک کے راستے کے راہی بنے۔ آپ کے خطوط میں ایک واصل باللہ ولی کی زبان ملتی ہے۔ یہ خطوط تلقین سے زیادہ تیقن، خبر از تیشہ نظر اور حق الیقین کے مظہر ہیں۔ بلاشبہ ان خطوط میں بندے کا خدا سے محبت کا تعلق واضح دکھائی دیتا ہے۔

حضرت سائیں پیر کرم حسین حنفی القادری (پ ۱۹۴۰------ م ۱۹۹۱) کا نام کرم الہیٰ رکھا گیا جو مرشد حضرت سید سردار علی شاہ کے لطف و کرم سے تبدیل ہو کر ''کرم حسین'' ہوا۔ آپ عالم دین تھے۔ آپ کو زبان عربی، فارسی پر درک حاصل تھا اور بیک وقت اردو، فارسی اور پنجابی کے شاعر تھے۔ آپ کے خطوط کا مجموعہ ''ابر کرم'' کے نام سے ہے۔ زبان و بیان پر دسترس، بے ساختگی اور جزیات نگاری آپ کے خطوط بنیادی اوصاف ہیں۔ ''ابر کرم'' میں ۷۰ خطوط ہیں۔ آپ نے اپنے خطوط میں موضوعات شریعت اور طریقت کو متوازن اور موثر انداز میں پیش کیا اور سائلین کو توحید، رسالت، والایت، نبوت کے موضوع پر اطمینان بخش۔۔ مصروصنا تسے نوازا۔

سلسلہ قطبیہ کی شخصیات میں حضرت پیر محمد طاہر حسین قادری (پ ۱۹۷۶) شاعر، نثر نگار، سوانح نگار، محقق، تذکرہ نگار، تاریخ نویس اور مکتوب نگار ہیں۔ آپ کی مکتوب نگاری کی کاوش ''جواہر کرم'' کے نام سے منصہ شہود پر آئی۔ اس کی سات جلدیں ہیں۔ اس کتاب میں ۶۰۰ سے زائد خطوط ہیں۔ یہ کتاب کمپوزڈ ہے اور طباعت سے آراستہ ہونے والی ہے۔ یہ کتاب ''کتب خانہ ابنِ کرم'' میں موجود ہے۔

پیر طاہر حسین طاہر ان مکاتیب میں ایک ہمہ پہلو شخصیت نظر آتے ہیں۔ آپ نے مغرب اور مشرق کی تہذیبوں کو ایک ادیب کی نظر سے ملاحظہ کیا ہے۔ بلاشبہ آپ کے مشاہدے نے دقیق مجاہدے کی صورت میں جلوہ آرائی کی ہے۔ تہزیب حاضر تہذیب مغرب سے معکوس اثرات وصول کر رہی ہے۔ ان مکاتیب میں پیر طاہر حسین طاہر اکبر الہ آبادی

اور علامہ اقبال کے پیروکار بن کر ابھرتے ہیں۔ اور عہد حاضر کے نوجوانوں کی فکری رہنمائی کا بیڑہ اٹھاتے ہیں۔ آپ کے خطوط میں مشرق اور مغرب کا تقابلی احاطہ براہ راست مشاہدہ کا رہن منت ہے۔

مادیت پرستی مغرب میں جو گل کھلا چکی ہے اہل مشرق اندھا دھند تقلید میں مادیت پرستی کو اپناتے جاتے ہیں۔ اہل مشرق اور خاص طور پر پاکستانی جوان چکا چوند سے متاثر ہیں۔ حقیقی چہرہ دکھانے کا فریضہ مکتوبات میں پیر طاہر حسین ادا کرتے ہیں۔ پیر طاہر حسین طاہر کے مکتوبات کا اسلوب اصلاحی ہے۔ اخلاقیات اور سماجیات کے پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

فنی اور اسلوبیاتی اعتبار سے اس سلسلہ کے مکاتیب الگ طرز رکھتے ہیں۔ اولا خطوط میں القاب، آداب بلحاظ مرتب ہوتے ہیں۔ بڑوں کے لیے بڑے بھاری بھاری القابات ہین اور چھوٹوں کے لیے برخورداری سے لبریز القابات ہوتے سہیں۔ لیکن سلسلہ قطبیہ کے مرشد اپنے مریدوں کو نہایت ادب بھرے القابات سے مخاطب کرتے ہیں جن میں بے ساختگی کے ساتھ ساتھ مربیانہ انداذ کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔

ثانیاًان خطوط میں احساسات کی گہرائی پائی جاتی ہے۔ یہ احساس دراصل اصلاحی پہلو اور معاشرے سے برائیوں کے سدباب کی شعوری کاوش لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ثالثا شخصی خطوط باہمی محبت و الفت کو فروغ دینے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ سلسلہ قطبیہ کے لکھے گئے مکاتیب باہمی الفت اور محبت کو آگے ضرور بڑھاتے ہیں لیکن اس الفت کو الفت اللہ پر اور محبت کو محبت رسول کے مقام پر لے جاتے ہیں۔ اس الفت اور محبت کو معاشرے میں بانٹ کر اصلاح احوال کا کام لیتے ہیں۔ وہ صداقت، امانت، دیانت اور شرافت کے بیج بوتے ہیں اور اپنے مریدین اور متوسلین کو طمانیت قلب کی طرف راغب کرتے ہیں۔

رابعاًان خطوط میں سوانح نگاری کی صفات بھی پائی جاتی ہیں۔ مرزا غالب اردو ادب کے سب سے بڑے مکتوب نگار مانے جاتے ہیں۔ مرزا غالب کی سوانح مرتب کرنے کے لیے مکاتیب غالب ایک مستند حوالہ ہیں۔ اس طرح خاندان قطبیہ کے مشائخ کی سوانح مرتب کرنے کے لیے خطوط سے کافی مدد ملتی ہے۔

خامساً سلسلہ قطبیہ کے مکاتیب کا سلوب قدیم صوفی نثر اسلوب ہے، مولوی عبدالحق کی کتاب ''اردو کے ارتقا میں صوفیا کا کام'' میں جو اسلوب نگارش اپنایا گیا ہے وہ اپنی نوعیت کا خاص اسلوب ہے۔ سلسلہ قطبیہ کے مکاتیب اس اسلوب کے تابع ہیں اس کی وجہ کوئی شعوری کاوش نہیں ہے بلکہ نثر میں ارتقائی سفر کا قرب وجوار اور دور دراز کے مقامات تک پہنچ جانا ہے۔ یہ خطوط انیسویں، بیسویں اور اکیسویں صدی کے ربع اول میں لکھے گئے تو اس اعتبار سے ان خطوط کا اسلوب بابائے اردو کے اسلوب کے قریب ہونا زیادہ حیرانی کا باعث نہیں بلکہ ارتقا کی حقیقت کا مظہر ہے۔

سادساً ان خطوط میں عصری اور حسیاتی شعور کی جھلکیاں واضع نظر آتی ہیں۔

کچھ خطوط تو مصاصر مشائخ اور پیران عظام کے نام ہیں۔ اور کچھ خطوط میں مصاصر مسائل کے احوال ہیں۔ اور یہ گردوپیش کے واقعات کے اظہاریے ہیں یا مصاصر واقعات کے بلغ اشاروں کی مدد سے بات واضع کرنے کے انداز ہیں۔ ان سب شواہد کی روشنی میں ہم بلاخوف تردید کہ سکتے ہیں کہ یہ خطوط عصری شعور کا آئینہ ہیں۔

سابعاً ان خطوط میں رمز وایما کی کیفیات کا احوال بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

ثامناً سلسلہ قطبیہ کے خطوط میں جہاں القاب و آداب کا التزام موجود ہے وہاں قدیم طریق قافیہ نگاری بھی موجود ہے۔

تسعاً قدیم قافیہ نگاری کو جدید انداز میں ڈھالنے کی کاوش میں پیر غلام محمد جلو آنونی کے مکاتیب بطور سند پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ''پیام جلوی'' اس بات پر شاہد ہے ''جواہر کرم'' تو جدید اسلوبیات کو قدیم اسلوبیات کے رنگ میں رنگ کر پیش کرنے کا نمونہ گردانہ جاسکتا ہے۔

عاشراً سلسلہ قطبیہ کے مکاتیب سادگی مکالمانہ انداز اور پر اثر سنجیدگی لیے ہوئے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ نے شاعری کی تین آواز کا ذکر

سلسلہ قطبیہ کے مکاتیب نے اردو ادب کی مراسلہ نگاری کی جہت کو ثروت مند کرنے میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ ایک طرف یہ خطوط مراسلہ کو مکالمہ بنانے جیسے ہیں تو دوسری طرف ان خطوط میں اسلوبیاتی تنوع اپنے ہونے کا پتا دیتا ہے۔

خطوط میں مکتوب نگار کی شخصیت کے پہلو جھانکتے ہیں تو دوسری طرف عصری ماحول کی نشاندہی بھی ملتی ہے۔

مکتوبات علمی، ادبی اور تاریخی حیسیتوں کے حامل ہیں تو دوسری طرف متصوفانہ صفات سے متصف ہیں۔ سیاسی، اور سماجی زندگی ان خططوط میں در آئی ہے تو دوسری طرف تمثیل نگاری نے ان کے جمالیاتی پہلو کو مزید اجاگر کیا ہے۔

تلاش و جستجو کا پہیہ ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے۔ ان خطوط نے تلاش جستجو کی نئی راہوں کو روشن کرنے میں مدد دی ہے۔ خطوط نگاری فی زمانہ معدوم ہوئی جاتی ہے۔ اردو میں خطوط کے عصادر اور منافع جہاں جہاں موجود ہیں ان میں خاندان سلسلہ قطبیہ بھی ایک روشن قندیل کی مانند موجودگی کا اثبات کر رہا ہے۔

اردو ادب کی اہم صنف سفر نامہ میں بھی قطبیہ کے نثر نگاروں نے قلم اٹھایا ہے۔ قطبی سفر نامہ نگاروں میں اولیت کا شرف ملک رب نواز قادری کو حاصل ہے۔ ان کا سفر نامہ ''سفر حجاز'' مذہبی سفر نامہ ہے۔ پیر محمد طاہر حسین قادری نے سفر نامے کی اقسام مقامی سفر نامے، مذہبی سفر نامے اور غیر ملکی سفر نامے، تمام میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے سلسلہ قطبیہ کی سفر نامہ نگاری کو جدید خطوط پر پروان چڑھایا ہے۔ انھوں نے کئی سفر نامے لکھیں ہیں جن میں متاع دید، اسپین کا مطالعاتی سفر، ترکی میں ایک ہفتہ اور آئرلینڈ میں چند روز طبع ہو چکے ہیں۔ کاروان شوق، جادہ محبت، انٹر مولے، بہتر گھنٹے، راہ مولا، سرزمین علم و عرفان (سفر نامہ عراق)، سکاٹ لینڈ کے شب روز، اور متحدہ عرب امارات میں ایک ہفتہ غیر مطبوعہ سفر نامے ہیں۔ ان کی سفر نامہ نگاری کی فہرست واضح کرتی ہے کہ انھوں نے صرف سلسلہ قطبیہ کی سفر نامہ نگاری کو مستحکم نہیں کیا بلکہ اردو سفر نامہ نگاری میں بھی نمایاں اضافہ کیا ہے اور اردو سفر نامہ کی روایت کو مضبوط بنایا ہے۔ ان کی سفر نامہ نگاری کی بنیاد پر انہیں دور حاضر کا اہم سفر نامہ نگار قرار دیا جاسکتا ہے۔

سلسلہ قطبیہ کے سفر ناموں کا جائزہ لیتے ہوئے متاع دید اور سفر حجاز سے اگر مذہبی پہلو دیکھے جائیں تو ان میں عبادات کو خلوص اور ادب کے ساتھ مزین کیا گیا ہے۔ ان سفر ناموں میں نہ صرف عمرہ کی ادائیگی کا مکمل طریقہ کار موجود ہے اس کے ساتھ جس مقام پر جو عبادت و نوافل اور اذکار سرانجام دینے ہیں ان کی مکمل تفصیل پیش کر دی گئی ہے جس سے قاری اور نئے مسافر کے لیے مذہبی رسوم ادا کرنا سہل ہو جاتا ہے۔ ان سفر ناموں کے مطالعے سے خدا پر ایمان

اور عشق مصطفیٰ کی پہچان میسر آتی ہے علاوہ ان سفر ناموں میں عجز وانکسار، صبر و برداشت، دینی و ملی خدمت، محبت و ترحم اور خدمت خلق جیسے اوصاف نمایاں ہیں۔

سفر نامہ ''اسپین کا مطالعاتی سفر'' کا مطالعہ اگر تاریخی اور جغرافیائی حوالے سے کیا جائے تو سفر نامہ نگار نے سفر نامہ کو مکمل تاریخی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ جس جگہ اور مقام کا احوال بیان کرتے ہیں اس مکمل تاریخی اہمیت اور تفصیل بیان کرتے ہیں۔ اسپین میں مسلمانوں کی آمد اور مختلف ادوار میں مختلف حکمرانوں کے احوال اور جغرافیائی حدود کی وضاحت بتاتی ہے کہ مصنف وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ علم تاریخ اور جغرافیہ سے بھی مکمل واقفیت رکھتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے انھوں نے مسلم دور حکومت کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے اور اپنے سفری واقعات میں اندلس کا محل وقوع رقبہ اور اس کی جغرافیائی حدود بھی واضح کی ہیں۔ ایک اچھے سفر نامہ نگار کے لیے جس تاریخی اور جغرافیائی شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمیں پیر صاحب کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔

یہ سفر نامہ اندلس کے سیاحتی لطف کے ساتھ تاریخ کئی اہم گوشوں کو اشگاف کرتا ہے۔ عالم اسلام کے شاندار ماضی اور اندلس مسلمان کے فن تعمیر، علمی آثار اور بہترین سیاسی اور حکومتی اقدامات کا پتا دیتا ہے۔ اصلاحی حوالے سے مسلمانوں کی عظمت رفتہ اور اسلامی اقدار کی بازیافت سے نوجوان نسل کے لیے جذبہ ایمانی کے ساتھ ساتھ خود شناسی کا راستہ بھی روشن ہو جاتا ہے۔ قرطبہ کی لائبریری اور مسلمانوں کے علمی کارناموں کے مطالعہ سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ قطبی سفر نامے ہمیں اخلاقی، ثقافتی اور تہذیبی حوالے آگاہیاور اصلاح کے کئی پہلو مہیا کرتے ہیں۔ ترکی میں میں ایک ہفتہ سفر نامہ اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ پیر صاحب نے ترکی کے اہم تاریخی مقامات، مقابر و مزارات اور علمی مراکز کو کی گہرائی سے دیکھا اور وہاں کی تہذیب و معاشرت اعر عمومی رویوں کو اپنی نفساتی بصیرت اور علمی مراکز کو قلب و نظر اور عمومی رویوں کو اپنی نفسیاتی بصیرت اور ژرف بنی سے جو مشاہدہ کیا۔ اپنے محسوسات کو سادہ، دلکش اور رواں دواں انداز میں پیش کر دیا۔ صداقت، راست سلوب، سادہ بیانی، اور زبان و بیان کی لطافت جیسے اوصاف کے حامل ان سفر ناموں کی اہمیت کبھی کم نہ ہو گی۔

سلسلہ قطبیہ کے سفر نامہ نگاروں نے جہاں سفر ناموں کی روایتی دلچسپی اور تحریر کا خیال رکھا ہے۔ وہاں مشاہدے کو عمیق نظری، جزئیات نگاری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری اور دیگر اجزائے ترکیبی سے بھی سفر ناموں کو کہی دامن نہیں رہنے دیا۔

یہ سفر نامے تاریخ، جغرافیہ، تہذیب و ثقافت، عصری میلانات ورجحانات، طرز معاشرت، اخلاقی و سماجی عناصر اور روایات کو سادگی اور سچائی سے پیش کرتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں افسانہ اور مبالغہ آمیزی کہیں نظر نہیں آتی۔ روانی، ربط و ترتیب اور تاریخ کی حال کے آئینہ میں پیش کش ان سفر ناموں وقعت اور اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔

اردو ادب کی نثری روایت میں سلسلہ قطبیہ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ لگانے کے لیے چند اضاف سوانح، مکتوبات اور سفر ناموں کا ایک اجمالی جائزہ ہے۔ بہ نظر غائر دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ قطبی مصنفین کا حصہ تقریبا اردو کی زیادہ تر اضاف میں موجود ہے۔ قطبی قلم کاروں نے یہ علمی و ادبی خدمات صلے یا ستائش کی خواہش کے بغیر سر انجام دی ہیں۔ اس لیے ابھی بہت سے علمی کام اشاعت کے مراحل تک نہیں پہنچ پائے اور نہ ہی اہل نقد کی نظروں میں آسکے۔ بعض اضاف میں یہ کام کم ماہیت کا ہو سکتا ہے مگر معیار و افادیت میں اسے کم درجہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔

اس سے قبل بہت سے محققین، علاقوں اور دبستانوں کے زیر اثر لکھے جانے والے ادب کا جاہزہ پیش کر چکے ہٰں لیکن تصوف و طریقت کے سلاسل سے جڑے مصنفین خدمات طرف کم توجہ دی گئی ہے اور اردو زبان میں یہ رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاید اس کی وجہ طریقت سے وابستہ ادباء و شعراء کی خدمات کی خاطر خواہ نہ ہوں کہ انھیں الگ سے موضوع بنایا جا سکے۔

سلسلہ قطبیہ نے جہاں دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت، راشد و ہدایت اور تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کیا ہے وہاں اس سے وابستہ مصنفین نے دیگر زبانوں (فارسی، پنجابی) کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے نثری اور شعری میدان میں لازوال خدمات انجام دے کر اس کے ادبی سرامیاے کو وسعت دی ہے اردو نثر میں ان کی سوانحی ادب کے حوالے سے پیش کی گئی خدمات دائمئ ہیں۔ یہی وجہ کے اردو ادب میں سلسلہ قطبیہ ایک منفرد اور قابل قدر مقام کا حامل نظر آتا ہے۔

ب۔ نتائج:

موضوع " سلسلہ قطبیہ کے متوسلین کی نثری خدمات: تجزیاتی مطالعہ (سوانح، مکتوبات اور سفر نامے کے حوالے سے) " کے حوالے سے تحقیقی کام کے بعد درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

- سلسلۂ قطبیہ کے منتخب متوسلین کی سوانح نگاری میں متصوفانہ، اخلاقی، تربیتی اور سماج پہلوؤں کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ کسی بھی سالک کے ساتھ ساتھ عام بندے کے لیے بھی اس میں رشد و ہدایت کا سیر حاصل مواد موجود ہے۔ اسلوب، رواں دواں اور سادہ ہونے کی وجہ سے ادبی مقام و مرتبہ بھی اپنے معاصرین میں کہیں بڑھ کر ہے۔ ان کی نوعیت خاص علمی و تربیتی ہے جس سے اردو کے متصوفانہ اور تربیتی ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔
- خط اپنے آپ میں اپنے معاشرے، عصر اور تاریخ کا ایک مستند حوالہ ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ خطوط سلسلۂ قطبیہ کے متوسلین سے متعلق ہیں تو اس سلسلے کے متوسلین کی خط کتاب میں اخلاقی پہلو، تربیتی عناصر، تصوف کے مجاہدے، تذکیۂ نفس کے لیے مشقیں، ذکرِ جہری و سری کی وضاحتیں اور تلقین شامل ہیں۔
- خطوط میں اپنے عصر اور معاشرے کی مکمل عکاسی موجود ہے جس میں ہجرت کے واقعات اور مہاجرین کے مسائل و مصائب اور ان کی امداد کے ساتھ ساتھ آبادکاری پر بھی کئی باتیں ملتی ہیں۔
- اسی سلسلے کے بزرگوں اور متوسلین کے اسفار میں علاقوں، شہروں اور دیہاتوں کی مکمل عکاسی ملتی ہے جس میں سفر نامہ نگار کی مشاہداتی قوت بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔ جیسے پیر محمد طاہر حسین کے سفر نامے "سپین کا مطالعاتی سفر" میں اندلس کی تاریخ اور جغرافیے کو انتہائی باریکی سے بیان کیا گیا ہے اور اس کی تاریخ پر نقد بھی کیا گیا ہے۔
- ملک رب نواز کے سفر نامے "سفر حجاز" میں حجاز کی تاریخ، حرمین شریفین کا جغرافیہ اور لوگوں کے رہن سہن پر بات کرتے ہوئے اپنے مشاہدات اور خیالات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

ج۔ سفارشات:

۱. سلسلۂ قطبیہ کے متوسلین کی شعری خدمات (فارسی، اردو اور پنجابی) پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۲. ملفوظات کی فہرست اور ان پر تحقیقی کام ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔

۳. خط کتابت کو مرتب کی کرنے ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا توضیحی اشاریہ بھی ابھی باقی ہے۔ جس پر تحقیقی کام ہونا چاہیے۔

۴. سلسلۂ قطبیہ کے طبع شدہ خطبات پر بھی تحقیقی و تنقیدی کام ہونا چاہیے۔

۵. سلسلۂ قطبیہ کے قلمی نسخے اور مخطوطات کی فہرست مرتب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تدوین و تحقیق بھی ہونی چاہیے۔ مشاہیر اردو کے خطوط بنام متوسلین سلسلۂ قطبیہ کی فہرست مرتب ہونی چاہیے اور اس کا توضیحی اشاریہ بھی تیار ہونا ابھی باقی ہے۔ ان خطوط کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

ا۔ سوانحی کتب:

سید عبد القادر بخاری، سوانح حیات (سید محمد نواز شاہ)، حزب الرحمٰن اسلامی اکادمی، کمالیہ، ۱۹۹۸

فیاض النصیر، فیوض یار، چاولہ پریس، وہاڑی، ۲۰۰۶

محمد طاہر حسین قادری، لمحاتِ کرم، مکتبہ جمالِ کرم، لاہور، ۲۰۰۶

محمد طاہر حسین قادری، حافظ الکرم، بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۴

محمد طاہر حسین قادری، لمعاتِ قطب، طفیل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۶

محمد طاہر حسین قادری، تذکرہ شاہ سردار، المستر، لاہور، ۲۰۱۹

محمد قمر الدین قادری، سراج منیر، دار لشعور، لاہور ۲۰۰۷

ملک رب نواز، تجلیاتِ کرم، المسطر، لاہور، ۲۰۱۸

۲۔ مکتوبات:

سید شیر محمد جیلانی، مآثر شیر یزدانی، مرتبہ محمد طاہر حسین قادری، بی پی، ایچ پرنٹر، لاہور ۲۰۱۲

غلام محمد جلو آنوی، پیامِ جلوی، اشرف پریس، لاہو ر

غلام محمد جلو آنوی، یسقوق من رحیق مختوم، اشرف پریس لاہور

محمد طاہر حسین قادری، جواہرِ کرم، کتابخانہ ابنِ کرم جھنگ ۲۰۱۷

محمد کرم حسین قادری، ابرِ کرم، مکتبہ جمالِ کرم، لاہور، ۲۰۰۵

نور محمد قادری، انشائے نور، لائل پور

۳۔ سفر نامے:

جاوید اقبال، سفر حجاز، آئینہ کرم، جھنگ، ۲۰۱۷

محمد طاہر حسین قادری، متاعِ دید، سلطان باہو پریس، جھنگ، ۲۰۰۳

محمد طاہر حسین قادری، اسپین کا مطالعاتی سفر، آئینہ کرم، جھنگ، ۲۰۱۲
محمد طاہر حسین قادری، ترکی میں ایک ہفتہ، آئینہ کرم، جھنگ، ۲۰۱۵
ملک رب نواز قادری، سفر حجاز، اشرف صابر پریس، جھنگ، ۱۹۹۶

ثانوی کتب:

الف۔ دنسیم، ڈاکٹر، اردوئے قدیم اور چشتی صوفیا، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء
ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، تفہیم و تحسین شعر، سنگت پبلشرز لاہور، ۲۰۱۶ء
خلیق احمد نظامی، پروفیسر، تاریخ مشائخ چشت، مشتاق بک کارنر، لاہور، س۔ن
عبد الحق، مولوی، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاء کرام کا حصہ، احمد برادرز، کراچی، ۲۰۰۸ء
عمر بن محمد شہاب الدین، سہروردی، عوارف المعارف، انارکلی لاہور، ۱۹۹۴ء
غلام حسین ساجدؔ، قطب شاہلڑی دے شاعر، مقالہ برائے ایم۔اے پنجابی، یونیورسٹی آف پنجاب لاہور
محمد اصغر یزدانی، ڈاکٹر، سلسلہ نوشاہیہ کی ادبی تاریخ، اسلامیات، ادارہ معارف نوشاہیہ اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
ابو الحسن علی بن عثمان ہجویری "کشف المحجوب"، قادری رضوری کتب خانہ، لاہور، ۲۰۰۵
خلیق احمد نظامی، پروفیسر، تاریخ مشائخ چشت، مشتاق بک کارنر، اردو بازار، لاہور
دار شکوہ قادری، شہزادہ، سفینۃ اولیا، لاہور
ادریس بھوجیانی، اولیا اللہ، عالم فقری، لاہور

لغات:

اردو جامع انسائیکلوپیڈیا (جلد اول)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
عبد المجید، خواجہ، جامع اللغات (جلد اول)، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء
حفیظ صدیقی، ابو الاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ۲۰۱۵ء

رسائل و جرائد:

آئینہ کرم، محمد طاہر حسین قادری، منگانی شریف، جھنگ، جون ۲۰۱۴

آئینہ کرم، محمد طاہر حسین قادری، منگانی شریف، جھنگ، جنوری ۲۰۱۵

آئینہ کرم، محمد طاہر حسین قادری، منگانی شریف، جھنگ، نومبر ۲۰۱۵

عقیدت، عاشر وکیل راؤ، سرگودھا، مارچ ۲۰۰۷

عقیدت، عاشر وکیل راؤ، سرگودھا، ستمبر ۲۰۰۷